بہتے پانی
پہ مکان
مشہور ٹی وی ڈرامہ
آنچ
کی کہانی
WWW.PAKSOCIETY.COM

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ———— جنوری ۱۹۹۱ء
قیمت ———— ۱۰۰/- روپے
مطبوعہ ———— احمد پرنٹنگ کارپوریشن
ناظم آباد۔ کراچی

دوسری بار ——— 1993

سرورق
اقبال مہدی

ناشر

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس ۲۲ دستان چیمبرز یونیا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

انتساب

بہت محبت کے ساتھ
اپنے اہل خانہ کے نام

جو

مجھے یکسوئی سے لکھنے کے لیے ہر ممکن سہولت بہم پہنچاتے ہیں

سرزوریاں کبھی آگے پیچھے اور کبھی پہلو بہ پہلو بالکل ایسے ہی ملی جلی ہیں جیسے راہِ حیات پر بہت سی اُلفتیں کبھی ہمارے آگے پیچھے اور کبھی ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہیں۔

جلیس حسن جیسے شادی شدہ، عیال دار اور زخم خوردہ مرد کی زندگی میں قدم رکھنے والی دوسری عورت کو بلاشبہ بہتے پانی پر ہی تو مکان تعمیر کرنا پڑتا ہے۔ بہتے پانی پر مکان بنانا کیسا دقت طلب اور صبر آزما کام ہے یہ اُلفت جیسی عورتیں ہی سمجھ سکتی ہیں لیکن بہتے پانی پہ مکان انہیں جو سرخروئی عطا کرتا ہے وہ سبھی دیکھ سکتے ہیں۔

یہ ناول بطورِ خاص ان عورتوں کے لیے لکھا گیا ہے جو بہتے پانی پہ مکان تعمیر کرنے چلی ہیں۔ تعمیر کے اس عمل میں اُن فردوں کو علیحدہ رکھنا ناممکن ہے جن سے اُن کا مقسوم وابستہ ہوا ہے۔ اگر آپ بھی بہتے پانی پہ مکان تعمیر کرنے والیوں میں سے ہیں تو اپنے دل کو اس یقین پر ٹھہرا لیجیے کہ خوشی اُنھی کو ملتی ہے جو اپنی قسمت کے لکھے پر راضی اور شاکر رہتے ہوئے خود غرضی کو الگ رکھ کر اپنے آپ پر حکومت کرنا سیکھ لیتے ہیں اور ... اگر آپ جلیس حسن کے ہم جلیس ہیں تو آپ کو تعمیر نشین بھی اچھی اُلفت کو اپنی محبت اور چاہت کا سہارا یقیناً دینا ہوگا ورنہ اُلفت بہتے پانی پہ مکان کیوں کر بنا پائے گی!

میں اُن تمام کرم فرماؤں کی انتہائی شکر گزار ہوں جنہوں نے اُلفت کی تمام تر کمزوریوں سرزوریوں اور منزل سے دو گام پیچھے اُس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ کو نظر انداز کرکے اس کی سرفروشی پر بڑی فراخدلی سے اظہارِ مسرت کیا اور اس کی سرخروئی میں جلیس حسن اور ان کے بچوں ہی کو نہیں بلکہ عاصمہ کو بھی شریک قرار دے کر اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دیا۔

میں محترم معراج رسول صاحب کی ممنون ہوں کہ بہتے پانی پہ بنے اس مکان کو بہت بروقت نئی آب و تاب دینے کا سہرا کاملاً انہی کے سر جاتا ہے۔

کئی برس قبل اپنی چند منتخب کہانیوں پر مبنی مجموعہ "پھول کھلتے ہیں" کی اشاعت کے موقع پر میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ بشرطِ حیات زیادہ بہتر کہانیاں آپ کی خدمت میں پیش کروں گی۔ اس ناول کو اسی وعدے کی ایک کڑی سمجھیے اور ان الفاظ کو تجدیدِ عہد کہ آپ کی محبتیں اور عنایتیں یوں ہی میرے دل کو بڑھاتے رہیں تو انشاء اللہ العزیز مستقبل میں "بہتے پانی پہ مکان" سے زیادہ بہتر اور تازہ تر کہانیاں پیش کرنے کی کوشش کروں گی۔

آپ کی کرم نوازیوں پر ایک بار پھر انتہائی شکر گزار

ناہید سلطانہ اختر
۱۸ - دسمبر ۱۹۹۰ء
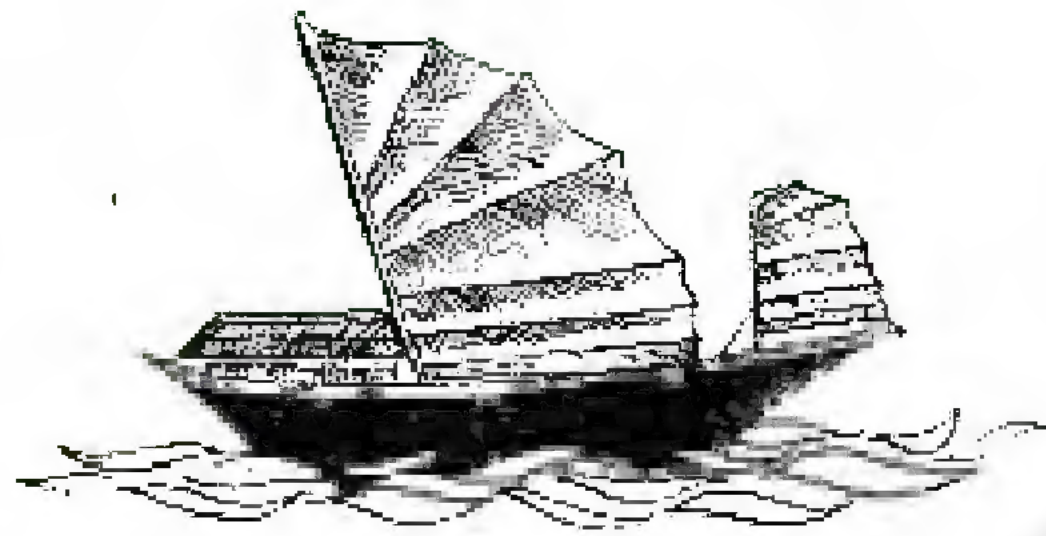
بالآخر اُس نے ہار مان لی
اور وہ سب جو اُس کے مقابل صف آرا تھے جیت گئے۔
کسی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی
کہ وہاں آبی لہریں تھیں۔
کسی نے اُس کے دل میں نہیں جھانکا
کہ وہاں درد ہلکورے لے رہا تھا۔
کسی نے اُس کے من کو ٹٹولنے کی زحمت نہیں کی
کہ وہاں اندیشوں اور وسوسوں کے مہیب سائے لرزاں تھے۔
شاید وہ سب کٹھور اور بے حس بن گئے تھے
مگر نہیں
ان سب میں امی اور بابا جان بھی تو شامل تھے وہ بے حس اور کٹھور کیونکر ہو سکتے تھے بلکہ اُن کے بارے میں تو ایسا سوچنا بھی گناہ تھا۔

اولاد کے معاملے میں تو وہ دونوں ہی موم کے بنے ہوئے تھے۔
شاید سارے ماں باپ اپنی اولاد کے معاملے میں ایسے ہی رقیق القلب ہوا کرتے ہیں۔
تو پھر ایسا کیوں ہوا تھا؟
امی اور بابا جان بھی اوروں کے ساتھی اور ہمنوا کیوں بن گئے تھے؟
شاید زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی شدت میں قدرے افاقہ پانے کی خاطر امی اور بابا ایک دوسری تلخ حقیقت کو آنکھیں بند کر کے ویسے ہی گھونٹ بھر لینے کے لیے تیار ہو گئے تھے جیسے ملیریا سے نجات پانے کے لیے کونین کی کڑوی گولی حلق سے اتار لی جاتی ہے۔
شاید اوروں کے ساتھ امی اور بابا جان بھی اُس کی آنکھوں میں مچلتی آبی لہروں، دل میں ہلکورے لیتے درد اور من میں لرزاں مہیب سایوں سے جانتے بوجھتے انجان بن گئے تھے۔
نجات دہندہ کو اپنی صلیب کا بوجھ شانوں پر اُٹھا کر سولی پر لٹکنا پڑتا ہے۔

کس بُری طرح سے سب لوگ اُس کا گھیراؤ کر رہے تھے۔
اُس کا قصور کیا تھا بھلا!
سارا قصور تو حالات کا تھا۔
عظمت آپا کے لیے مناسب بر کے انتظار میں اُس کے کئی سنہرے سال سنولا گئے تھے۔ جب اُن کے لیے امی اور بابا جان کے حسب منشا بر ملا تو وہ اپنی عمر کا تیسرا عشرہ مکمل کرنے کے قریب تھیں۔ اور فضیلت ان دنوں پورے جوبن پر تھی۔ آپا کی شادی کے بعد جب اُس کے لیے مناسب بر کی تلاش شروع ہوئی تو ابا کے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے میں چار پانچ سال باقی رہ گئے تھے۔ پیشتر آنا اُس کے نام سے تھا مگر آنے والے پسند فضیلت کو کر جاتے تھے۔ ناچار امی اور ابا کو اس سے پہلے ہی فضیلت کے ہاتھ پیلے کرنا پڑے تھے۔

فضیلت کے رخصت ہوتے ہی نجیبہ اپنے پورے جوبن پر آ چکی تھی۔ اور خالہ بی بی اُس کے حقوق اپنے صاحبزادے کے نام محفوظ کرا چکی تھیں۔ الفت کے لیے اپنے پرایوں کے توسط اور امی کے ہر ملنے جلنے والے سے کہنے سننے سے رشتے آتے تو رہتے تھے مگر آنے والے جتنے کے بعد پلٹ کر مڑ کر نہ آتے۔ چالیس سال کا مرد بھی اپنے سے اٹھارہ بیس سال چھوٹی حسین و جمیل لڑکی کا طلبگار تھا اور لڑکے کی اماں بہنیں تو گویا حور پری کی تلاش میں نکلی تھیں خواہ صاحبزادے بذات خود چار ای کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں۔ چالیس پچیس سال کے بیٹے اور بھائی کے لیے کمسن نوعمر خوبرو دلہن کی تلاش کی جاتی۔ جہیز اور تیرہ ہزار پانے والے صاحبزادے کی جیب بھاری کرنے کی خاطر کوئی نگوڑی آسامی ڈھونڈی جاتی۔ خیر جیب تو بھاری کی جا سکتی تھی کیونکہ ابا کے پاس امید جو بھی اثاثہ تھا اُس کے اور نجیبہ کے لیے ہی تو تھا۔ تیسرے سرکاری افسر تھے جنھیں ملازمت سے سبکدوشی کے وقت خطیر واجبات ملے تھے۔ اللہ رکھے بھائی جان بھی ہاتھ بٹانے کو موجود تھے۔ پھر الفت نے اپنی ملازمت سے خود بھی اچھی خاصی رقم جوڑ رکھی تھی۔ مگر اب اس کا کیا علاج کہ آنے والے اُس کی پکی عمر دیکھ کر واپس نہ پلٹتے تھے۔ ابا جان نے دو تین مرتبہ اخبار میں "ضرورت رشتہ" کا اشتہار بھی شائع کروا دیکھا۔ عمر صاف صاف لکھ دی کہ عمر کا چھپانا اُن کے خیال میں فضول تھا اور ناممکن بھی کہ بعض کائیاں قسم کے لوگ تو سن پیدائش دیکھنے کی خاطر میٹرک کی سند دیکھنے کی فرمائش کر بیٹھتے تھے یا دیکھتے نہ تھے تو باتوں ہی باتوں میں یہ ضرور پوچھ لیتے تھے کہ میٹرک کب کیا؟ انٹر کب کیا؟ بی اے کس سال کیا؟ بی ایڈ کیے کتنے برس ہو گئے؟ ملازمت کرتے کتنے برس گزر گئے؟ اور ان تمام سوالات کا مقصد عمر کا تخمینہ لگانا ہوتا تھا۔ ابا کی جانب سے اخبارات میں دیے گئے اشتہارات کے جواب میں رنڈوے، طلاق یافتہ یا مالی مدد کے خواہاں.... نامناسب قسم کے رشتے ہی آئے۔ بھولے بھٹکے ایک آدھ مناسب ہوا بھی تو معاملہ کہیں نہ کہیں اٹک کر رہ گیا اور بات آگے نہ بڑھنے پائی۔
خدا خدا کر کے بھابی جان کے بھائی کے دوستوں میں یہ رشتہ ملا تھا جس کے لیے پورا خاندان ہی گویا الفت کے مقابل صف آرا ہو گیا تھا۔
اپنے اپنے طور پر سب ہی اُسے لگا رہے تھے۔

جلیس الحسن بھابی جان کے بڑے بھائی کے ایک دوست کے شناسا تھے۔ پیشے کے لحاظ سے سول انجینئر تھے۔ کسی کے ملازم نہ تھے کیونکہ خود ٹھیکیدار کی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے رکھی تھی۔ چار بچوں کے باپ تھے۔ سب سے بڑی بیٹی پندرہ برس کی تھی اور دسویں جماعت کی طالبہ۔ دوسرے نمبر پر اُس سے ایک برس چھوٹا بیٹا تھا جو نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ تیسرے نمبر کا بیٹا تھا بڑے سے تقریباً دو سال چھوٹا اور ساتویں جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ چوتھے نمبر پر بیٹی تھی جو کوئی آٹھ نو برس کی چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ جلیس الحسن کی رہائش ایک پوش علاقے میں تھی۔ تین سو گز پر بنگلہ بنا رکھا تھا۔ زندگی کو پُرراحت بنانے والی ان نعمتوں سے ان کا گھر بھرا پڑا تھا۔ ایک نہیں دو دو گاڑیاں تھیں۔ نوکر چاکر تھے۔ بچے شہر کے معروف تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم تھے۔ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے۔

برس سوا برس پہلے تک جلیس الحسن کا گھرانا ایک خوش باش مثالی گھرانا ہوا کرتا تھا۔ جلیس الحسن اور ان کی اہلیہ عاصمہ کو اُن کے احباب رشک سے دیکھا کرتے تھے۔ اور چاند سورج کی جوڑی کہا کرتے تھے۔ وہ دونوں جس محفل میں جاتے مرکز نگاہ بن جایا کرتے تھے۔ جلیس الحسن کو عاصمہ بیگم سے انتہائی محبت تھی۔ اور سوائے اُن کی امریکا جا بسنے کی خواہش کے انھوں نے کبھی عاصمہ بیگم کی کوئی بات ٹالنے کی کوشش نہیں کی۔
لیکن پھر اس خوش حال اور خوش باش گھرانے کی خوشیوں میں یک بیک دراڑیں پڑ گئیں۔
عاصمہ بیگم کے ایک کزن اسد سلیم امریکا سے آئے اور اُن کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عاصمہ بیگم سے موصوف کے مراسم اتنے بڑھے کہ جلیس الحسن کو عاصمہ بیگم... اپنے سے دور کھڑی محسوس ہونے لگیں۔ اس خدشے کا اظہار جلیس الحسن نے عاصمہ

بیگم سے کیا تو انھوں نے اُن کے اس خدشے کو محض کرولے کے پر محمول کیا لیکن بہت جلد یہ حقیقت عریاں ہو کر جلیس الحسن کے سامنے آ گئی۔
عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔
بچوں کی خاطر جلیس الحسن نے عاصمہ بیگم کو اُن کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ انھیں بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ اپنے ارادے سے پیچھے نہ ہٹیں۔
ناچار جلیس الحسن کو انھیں طلاق دینا ہی پڑی۔
عاصمہ بیگم نے اسد سلیم سے شادی کر لی اور امریکا چلی گئیں۔
جلیس الحسن کے لیے عاصمہ بیگم کا اُن کی زندگی سے نکل جانا، نہ صرف اُن کے لیے بلکہ بچوں سے بھی قطع تعلق کر جانا بسا بسایا گھر اجڑ جانا۔ ایسا سانحہ تھا جس نے اُن کی دنیا الٹ پلٹ کر کے رکھ دی تھی۔
کیسا خوش باش گھرانا تھا اُن کا!
احباب و اقارب رشک سے دیکھا کرتے تھے۔
خدا جانے کس بدخواہ کی نظر لگ گئی!
جلیس الحسن نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اُن کی خوشیوں کو یوں کسی کی نظر کھا جائے گی۔
عاصمہ بیگم سے انھیں محبت نہیں بلکہ عشق تھا کہ انھیں وہ اپنی متاع حیات، اپنی کائنات سمجھا کرتے تھے۔ عاصمہ بیگم کے حوالے سے وہ عورت کو اس دنیا کی مقدس و محترم مخلوق سمجھا کرتے تھے اور اقبال کے اس خیال سے سو فی صد نہیں بلکہ ہزار فی صد متفق تھے کہ
ع وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
مگر عاصمہ کی بے وفائی نے اُن کے اس ایقان کی بنیادیں متزلزل کر کے رکھ دیں۔ عورت ذات پر سے اُن کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔
عاصمہ کے اپنی زندگی سے نکل جانے کے بعد وہ دنوں کھوئے کھوئے سے رہے۔ انھوں نے احباب و اقارب سے ملنا تقریباً موقوف ہی کر دیا۔ وہ لوگوں سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کر پاتے تھے۔ انھوں نے تقریبات میں جانا ترک کر دیا تھا کیونکہ انھیں لوگوں کی سوالیہ نگاہوں سے کوفت ہوتی تھی۔ لوگوں کی معنی خیز مسکراہٹیں انھیں اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہوتی تھیں۔ تکلیف دہ استفسارات اور سوالیہ نگاہوں سے بچنے کی خاطر انھوں نے نہ صرف احباب و اقارب بلکہ عزیز رشتے داروں سے بھی تقریباً قطع تعلق ہی کر لیا۔ کراچی میں عاصمہ بیگم کا کوئی عزیز رشتے دار نہ تھا۔ اُن کے والدین انتقال کر چکے تھے۔ بہن بھائی بیرون ملک مقیم تھے — جو عزیز رشتے دار پاکستان میں تھے بھی وہ لاہور اور پنجاب کے دیگر شہروں میں مقیم تھے۔
جلیس الحسن نے یہ تو سن اور پڑھ رکھا تھا کہ کسی عورت کے لیے طلاق ایک صدمۂ گراں ہوا کرتی ہے مگر اس ذاتی المیے سے گزرنے کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ کسی مرد کو اُس کی عورت کا چھوڑ جانا مرد کے لیے کچھ کم کٹھن، اذیت ناک اور کوئی کم صدمہ نہیں ہوا کرتی۔
اور عورت بھی کیسی جو مرد کو محبوب ہو!
اس تجربے سے گزرنے کے بعد انھیں پتا چلا کہ طلاق کے بعد عورت ہی نہیں بلکہ اکثر مرد بھی نفسیاتی مریض بن جایا کرتا ہے۔
جلیس الحسن کے چند ایک خیرخواہوں نے انھیں دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا مگر انھوں نے اس مشورے کو پوری شدت سے رد کر دیا۔
وہ ان دنوں دو طرح کی الجھنوں کا شکار تھے۔
عاصمہ بیگم کی بے وفائی کے پیش نظر عورت ذات پر سے اُن کا اعتبار جاتا رہا تھا اور اس الجھن سے زیادہ گمبھیر مسئلہ یہ تھا کہ وہ
عاصمہ بیگم کی بے وفائی کے باوجود اُن سے وابستہ یادوں کو فراموش نہ کر پا رہے تھے۔
زندگی کے اس روپ کا تو انھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔
عاصمہ بیگم کے بنا گھر انھیں گھر ہی نہ لگتا تھا۔
گھر کے چپے چپے پر عاصمہ بیگم کی یادیں ثبت تھیں۔
وہ عورت ذات سے بدگمان تو ہو چکے تھے مگر ستم یہ تھا کہ اس عورت کے خیال کو اپنے ذہن سے نہ جھٹک پا رہے تھے جس کے طرز عمل نے انھیں عورت ذات سے بدگمان ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔
انھیں عاصمہ بیگم سے اس درجہ عشق تھا کہ اب اُن کے لیے یہ تصور بھی محال تھا کہ کوئی دوسری عورت عاصمہ بیگم کی جگہ اُن کے دل پر حکمرانی کرے۔
اسی لیے انھوں نے خیرخواہوں کی جانب سے ملنے والے اس مشورے کو پوری شدت سے رد کر دیا تھا کہ انھیں اپنے بچوں ہی کی خاطر دوسری شادی کر لینا چاہیے۔

پھر ایک نہیں چار بچوں کی ذمے داری۔
جن کی ماں اُن کی زندگی سے نکل گئی تھی۔
کیا ضمانت تھی کہ وہ اُن کی ماں کا خلا پُر کرنے میں کامیاب ہو سکے گی؟
اور
سب سے بڑی بات یہ کہ وہ عورت جس کے چار بچوں کے جلیس الحسن باپ تھے اُن کی اور اُن کے بچوں کی زندگی سے نکل ضرور گئی تھی۔
مگر کیا جانے والے واپس نہیں لوٹ آیا کرتے؟
الفت نے بہت سوچ سمجھ کر انکار کیا تھا۔
اور چٹان کی طرح اپنے فیصلے پر اٹل رہنا چاہتی تھی۔
مگر
پھر بابا جان اُس کے روبرو آ بیٹھے۔
"بیٹا! میں یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ جو کچھ ہم تمہارے لیے سوچ رہے ہیں وہ حرف بحرف درست ہے لیکن یہ فیصلہ ہم حالات کی سنگینی اور نزاکت کے سبب کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تمہاری حق تلفی ہوئی ہے۔ عظمت کی شادی پہلے کرنے کے چکر میں ہم نے تمہارے کئی سال اپنی اس احمقانہ رٹ کی بھینٹ چڑھا دیے کہ پہلے بڑی کی شادی ہوگی۔ پھر حالات مزید الجھ گئے۔ بہرحال بیتا جو حماقت تھی اس پر ہم سوائے دل گرفتہ ہونے کے اور کیا کر سکتے ہیں........ اب وقت کم ہے کہ ہم تو اب چراغِ سحری ہو چکے۔ میں جلیس الحسن سے ملا ہوں، بہت سمجھ دار اور شریف النفس نظر آتے ہیں وہ مجھے اور دیگر اہل خانہ کی بھی یہی رائے ہے۔ تمہاری امی نے بھی بات کی ہے اُن سے وہ بھی مطمئن ہو چکی ہیں۔ جلیس الحسن کی حد تک تو یہ رشتہ انتہائی معقول نظر آتا ہے۔ اب رہی بات اُن کے حالات کی تو میں مانتا ہوں بیٹا کہ کسی اور کے بچے اپنانا آسان بات نہیں ہوتی۔ بڑی کٹھن منزل ہوتی ہے تمہارے لیے مگر بیٹے........ کبھی کبھی دوسروں کی خاطر انسان کو اپنی ذات کی نفی کرنا پڑتی ہے۔ اوروں کو کسی بڑی فکر، بڑی مشکل سے نجات دلانے کے لیے اپنی ذات سے ماورا ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔ ہماری نجات اسی میں ہے کہ تم اور تہنیت بھی اپنے اپنے گھر کی ہو جاؤ........ بیٹی! بوڑھا ہو چکا ہوں اور تھک بھی چکا ہوں اب زیادہ عرصہ تم دونوں بہنوں کا بوجھ اپنے نحیف اور نزار شانوں پر اٹھائے کھڑا نہیں رہ سکتا اور اس بوجھ کو اتارے بغیر مرنا بھی نہیں چاہتا کہ روح مضطرب رہے گی۔ تہنیت کے لیے گھر کا رشتہ موجود ہے اس کی طرف سے تو اطمینان ہے۔ میرا اور تمہاری امی کے لیے زیادہ اہم مسئلہ تمہارا ہے۔ تمہاری فکر ہم دونوں کے دل کو دن رات اپنی مٹھی میں جکڑے رکھتی ہے۔ تمہارے فرض سے سبکدوشی کا غالباً یہ بہترین موقع ہے۔ تم ہاں کر دو تو ہماری فکر دور ہو جائے۔" بابا نے توقف کیا پھر بولے "بیٹا، دوسروں کی نجات کے لیے کسی نہ کسی کو تو مصلوب ہونا ہی پڑتا ہے۔"
پھر بابا خاموش ہو گئے۔
اور وہ بھی سر جھکائے چپ بیٹھی رہی۔
"میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں بیٹے۔" کچھ دیر بعد بابا نے کہا۔
"بابا........" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مضطربانہ باہم مروڑنے لگی۔
"ہاں ہاں بولو میں سن رہا ہوں۔"
"ہر کوئی تو مسیحا نہیں ہو سکتا بابا!"
"بیٹے اور اپنی ماں کے روگ کی مسیحائی تمہارے لیے ممکن ہے!"
"آپ تہنیت کے بیاہ کا انتظام کر دیں۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔
"بیٹا، تہنیت کی تو ہو جائے گی پھر اس کے لیے تو کوئی دیر نہیں۔ اس وقت تمہارا مسئلہ ہمارے لیے زیادہ اہم ہے۔ ہم تمہیں جلد از جلد اپنے گھر کا آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔"
"آپ میری فکر چھوڑ دیں۔"
"الفت بیٹی، سارے والدین اولاد کے لیے متفکر ہی رہا کرتے ہیں۔"
"آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ہوں ہی نہیں۔"
بابا نے ایک گہری سانس لی پھر بولے "بعض باتیں کہہ دینا آسان ہوتی ہیں مگر عملاً وہ ناممکن ہوتی ہیں۔ تم بھی اس وقت ایسی ہی بات کر رہی ہو۔"

وہ خاموش رہی۔
"بیٹے! سقراط نے تو سچ کی خاطر زہر پی لیا تھا۔ کیا تم اپنے ماں باپ کی نجات کی خاطر ایک کڑوا گھونٹ نہیں پی سکتیں؟ ہماری خاطر یہ کڑوا گھونٹ پی لو بیٹا!"
اُس نے تڑپ کر بابا جان کی طرف دیکھا۔
"ہاں بیٹا ہماری خاطر........ اپنے بوڑھے باپ کی خاطر!"
بابا کے لہجے کی بے بسی نے اُسے بے بس کر کے رکھ دیا۔
اور
اُس نے سر جھکا دیا۔
بادلِ ناخواستہ ہاں کر دی۔
اور اُس کے اقرار نے گھر بھر میں یہاں سے وہاں تک خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔
اُس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسی بے وقعت گردانی جاتی تھی۔
چار بچوں کے طلاق یافتہ باپ کا رشتہ بھی اُس کے لیے اس قدر خوشی خوشی منظور کیا جائے گا!
کیا ہوا اگر اُس کی عمر پینتیس برس سے تجاوز کر چکی تھی؟
تھی تو آخر وہ ایک لڑکی ہی۔
ہر لڑکی کی طرح اُس نے بھی کچھ خواب دیکھے تھے۔
اُس کی بھی کچھ تمنائیں تھیں۔
اُن خوابوں اور تمناؤں کی یہ تعبیر کس درجہ وحشت خیز تھی!
پھر
جلیس الحسن نے دبی زبان سے ایک خواہش ظاہر کی۔
وہ الفت سے تخلیے میں فقط دو باتیں کرنا چاہتے تھے۔
امی تو اُن کی اس خواہش پر بھونچکا سی رہ گئیں۔
"اُن سے کہہ دیں کہ ہم لوگ اتنے آزاد اور بے باک نہیں ہیں۔" امی نے بابا سے کہا۔
مگر بابا جان نے کہا "کوئی حرج نہیں اُن کے الفت سے بات کر لینے میں۔"
امی، بابا کے جواب پر انگشت بدنداں رہ گئیں۔
بہنوں اور بھائی جان نے بابا کی تائید کی۔
بھابی جان "خاموشی نیم رضا مندی است" کی تصویر بنے چپ رہیں۔
الفت کو پہلے تردد ہوا
لیکن پھر اُس نے سوچا۔
"جب بابا کی خوشی کے لیے ہاں کر ہی دی تو اُن کی خاطر یہ مرحلہ بھی سہی!"
جلیس الحسن نے تخلیے میں اُس سے صرف چند باتیں کیں۔
"میرے حالات آپ کے علم میں تو ہوں گے؟ اور آپ جانتی ہیں کہ میرے چار بچے بھی ہیں؟"
"جی!"
"آپ نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے؟"
"جی!"
"کوئی جبر یا کوئی دباؤ تو نہیں آپ پر؟"
اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"ملازمت کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟"
"ابھی ملازمت پر ہی ہوں!"
"تو آپ سے میری یہ درخواست ہوگی کہ آپ ملازمت ترک کر دیں۔"
"اچھا تو ابھی سے ملازمت چھوڑنا ہوگی؟" الفت نے چپ چاپ سوچا۔

ساحل کی نم ریت پھران کے نقوش پا کو اپنی آغوش میں سمیٹ رہی تھی۔

"بابا جان! آپ مدینہ نہیں جانا چاہیے ہم اس کے بغیر بھی بہت اچھی طرح رہ سکتے ہیں بلکہ رہ رہے ہیں" اعجاز نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

جلیس الحسن کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ قدم یوں ساکن ہو گئے جیسے کہ وہ تھکے نہیں۔

"بیٹے کیا؟" انھوں نے انتہائی تحمل سے کہا "آپ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں یا نہیں؟"

اعجاز نے ذرا سی مذبذب نگاہوں سے باپ کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے ان کی بات کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا ہو۔

"میرا مطلب ہے آپ مجھے ٹرسٹ کرتے ہیں یا نہیں؟ ...... کرتے ہیں؟"

"کیا آپ کے خیال میں میں ایسا کوئی کام کر سکتا ہوں جس سے آپ کو سکھ کے بجائے دکھ یا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو؟"

اعجاز نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں تو آپ یقین رکھیے کہ میں جو کچھ بھی کروں گا آپ چاروں کی بہتری کے لیے ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ اسٹیپ مدر کے بغیر رہ سکتے ہیں مگر میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔ گھر میں کوئی خاتون ہونا چاہیے۔ آپ کی مناسب دیکھ بھال اور بہتر پرورش اور آپ کے تحفظ کے لیے۔"

"لیکن بابا......" نگین کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں بولو چپ کیوں ہو گئیں؟" جلیس الحسن نے رخ موڑ کر نگین کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

"بابا! اسٹیپ مدر اچھی تو نہیں ہوتیں" نگین نے منہ بنا کر کہا۔

"بیٹا جی سب بری بھی نہیں ہوتیں۔"

"مگر سب اچھی بھی تو نہیں ہوتیں" اعجاز جرح کرنے والے انداز میں بولا۔

"بابا جان! آپ فکر نہ کریں ہم لوگ اپنے آپ رہ سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے میں زری اور رزاز کی دیکھ بھال کر سکتی ہوں اور حاجی تو ہیں ہی نا ہمارے" نگین نے پورے اعتماد سے کہا اور اعجاز کی طرف تائید طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی "کیوں جا جی ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟"

"ہاں بالکل ٹھیک۔"

"میں مانتا ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں" جلیس الحسن نے رسانیت سے کہا "مگر بیٹے مجھے تو آپ لوگوں کی فکر رہتی ہے۔ اس وقت جبکہ میں گھر پر نہیں ہوتا میری عدم موجودگی میں گھر پر کوئی بڑا تو ہونا چاہیے جو آپ لوگوں کے ساتھ رہے۔"

"بابا کا بھروسا ہوتی ہے، خانساماں ہے، ہاں بابا ہیں، چوکیدار ہے، ڈرائیور ہے، اتنے بہت سے لوگ تو ہوتے ہیں گھر میں۔"

"میں لیکن میری بات کر رہا ہوں ملازموں کی نہیں" جلیس الحسن نے بڑے تحمل سے کہا۔

وہ دونوں چپ رہے۔

جلیس الحسن نے دزدیدہ نگاہوں سے باری باری دونوں کو دیکھا۔ ان کے چہروں سے ناگواری اور اچانک بات سے اختلاف کا تاثر صریح تھا۔

انھوں نے ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بوجھل آواز میں کہا "کیا آپ کے خیال میں، میں آپ لوگوں کے لیے کوئی غلط فیصلہ کر سکتا ہوں؟"

دونوں بدستور خاموش رہے۔

"بولیں بیٹا!"

ان دونوں نے دزدیدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر نگین نے دھیرے سے کہا "نہیں بابا!"

"دیکھیں گے اگر ... میرے بچے ... آپ لوگوں کی خوشی، آپ کا اطمینان اور آپ کی سہولت ہمیشہ میری پہلی ترجیح رہے گی" جلیس الحسن نے ... "آپ دونوں سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

"جی بابا!" نگین منمنائی۔

مگر اعجاز چپ رہا۔ اس کے چہرے سے ہویدا تھا کہ وہ اپنے ذہن کو باپ کی کسی دلیل، کسی منطق کی تائید کے لیے آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔

انھوں نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر بیٹے کے خفا خفا سے چہرے پر ڈالی اور جی ہی جی میں سوچا "انسان کی مجبوریاں بھی اور قناعت اسے اپنی عزیز از جان ہستیوں سے بھی کتنی دور لے جا کر کھڑا کر دیتی ہیں!"

ایک دبی دبی سی سرد آہ بے ساختہ ان کے لبوں سے نکل کر گرم فضاؤں میں تحلیل ہو گئی۔

"بیٹے آپ بھی تو کچھ بولیں" انھوں نے اعجاز سے کہا۔

اعجاز نے خاموشی سے بہن کی طرف دیکھا۔

"کوئی چارہ نہیں!" بہن نے نگاہوں ہی نگاہوں میں کہا۔

"ٹھیک ہے بابا!" اعجاز نے دھیمی آواز میں کہا۔

مگر اس کی آواز اور اس کا لہجہ گواہ تھا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا بادلِ ناخواستہ!

جبراً اور قہراً!

جلیس الحسن چلتے چلتے تھم گئے۔ گردن موڑ کر انھوں نے پہلے نگین کی پیشانی کو بوسہ دیا پھر اعجاز کا ماتھا چوما۔

وہ دونوں چپ اور ناخوش نظر آ رہے تھے۔

"بیٹے جی! زری اور رزاز کو یہ بات بتانا اور انھیں سمجھانا آپ دونوں کی ذمے داری ہے۔ میں کل ان سے بات کروں گا مگر پہلے آپ دونوں انھیں ذہنی طور پر تیار کر دیں۔ سمجھا دیں۔"

نگین اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں مضطربانہ دائیں ہاتھ سے مروڑنے لگی۔

"اوکے بابا!" نگین نے کہا۔

"حاجی بیٹے؟" جلیس الحسن نے گہری نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے بابا!" وہ ماندے دل سے بولا۔

ساربان ان سے اتنی دور نکل چکا تھا کہ اس کے پیچھے جانا عبث سمجھ کر جلیس الحسن اس کے پلٹنے کے انتظار میں دونوں بچوں سمیت وہیں تھم گئے۔

دونوں بچوں کے چہروں سے جلیس الحسن کے لیے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وہ دونوں اس خبر سے خاصے ناخوش ہوئے تھے اور ان کی بات سے انھوں نے خاصی بادلِ ناخواستگی کے ساتھ جبراً اور قہراً اتفاق کیا تھا۔

جلیس الحسن کو ان کے بجھے ہوئے چہرے دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔

زندگی کی بعض منزلیں کتنی کٹھن ہوا کرتی ہیں!

بچوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کے نتیجے میں ان کا دل اس خلش کا شکار ہو گیا تھا کہ وہ نئی ماں کے لیے دامنِ دل وا کر دینے کو تیار نہ تھے۔

بہرحال اب اس خلش کو مزید ذہن پر سوار رہنے کا موقع دینا فضول تھا۔

جلیس الحسن جس منزل پر کھڑے تھے وہاں سے پیچھے ہٹنے کی اب کوئی گنجائش نہ تھی۔ اب تو اگلی منزلوں پر نگاہ جمانا ضروری تھا۔

الفت سے ان کا رشتہ طے پا چکا تھا۔ الفت کے گھر والے زبان دے چکے تھے۔ سب خوب ہو گیا تھا اور دوڑ دھوپ اب شادی کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔

وہ اگر چاہتے بھی تو پیچھے نہ پلٹ سکتے تھے۔

اپنے حالات کے پیشِ نظر جلیس الحسن تو بالکل سادگی سے نکاح کرنا چاہتے تھے مگر الفت کے ہاں سب کی رائے یہ ٹھہری کہ گو جلیس الحسن کی یہ دوسری شادی سہی مگر لڑکی چونکہ کنواری تھی اس لیے ساری رسوم ادا کی جائیں خواہ جلیس الحسن کے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے سادگی سے اور محدود پیمانے پر ہی سہی۔

"کیسی آخر لڑکی کے کچھ تو ارمان ہوں گے" الفت نے خالہ بی بی کو کہتے سنا تو اس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ارمان!" اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔

ہاں ارمان تو بہت تھے اس کے بھی۔

ہر لڑکی کی طرح بھولے، رنگیلے سپنے اس نے بھی دیکھے تھے۔

ایک اجنبی کے ساتھ جیون بندھن میں بندھ کر جیون راہ پر اس کے سنگ سنگ چلنے کے خواب تو اس نے بھی دیکھے تھے۔

مقدر اسے جو کچھ دکھانے جا رہا تھا اس کا تو اس نے بھولے سے کبھی تصور نہ کیا تھا۔

بھابی جان تو یہ کہہ کر چلی گئیں اور ان کی بات نے الفت کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ بے شعور اور اپنی ساتھی رعنا کی بدخواہ تھی جو اس نے ملتانی دو چوٹیوں والے ٹنڈو سے مرد سے اُن کی شادی پر اسکول میں اپنی چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ مل کر خوب مذاق اُڑایا تھا اور جلیبیں الحسن سے بات چیت کا سلسلہ چلنے سے پہلے تک اکثر ہی دوسری ساتھیوں کے ساتھ مل کر بھی کہہ کر ان کا مضحکہ اُڑایا کرتی تھی۔

چار چوٹوں والے ایک ٹنڈو سے اُس کی اپنی شادی کے دعوت نامے جس کے سامنے پڑے تھے اور بھابی جان کے الفاظ بازگشت کی صورت ایوانِ سماعت میں گونج رہے تھے۔

"اسکول چھوڑ دو گی تو کیا ان سے کہیں اور بھی سامنا ہو سکتا ہے۔ آئندہ زندگی میں کبھی اُن سے نظریں ملانے اور سامنا کرنے کی گنجائش ضرور رکھو۔ ویسے بھی یہ کوئی چوری تو ہے نہیں جو چھپ کر کی جائے یا خدا نخواستہ کوئی بُرا فعل نہیں کہ لوگوں سے ڈرا جائے۔ اور......

کوئی کی بھی صورت ہے کہ اپنی مذکورہ ساتھی کو اپنی شادی میں بطور خاص مدعو کر دو۔"

ایک مشیخ سی دل میں گویا چلی جا رہی تھی۔

مسز رعنا جمیل جو شادی سے پہلے مس رعنا راشد ہوا کرتی تھیں، کا چہرہ اس کے تصور میں بار بار گویا تیرتا ڈوبتا ابھرتا۔ اپنی قریبی ساتھیوں کے ساتھ مل کر رعنا جمیل کی دو چوٹیوں والے ٹنڈو سے مرد سے شادی کے بعد اس نے کس کس طور ان کا مذاق نہ اُڑایا تھا۔

اسے رعنا کے ساتھ کی پہلی دل اپنی اور چند ساتھیوں کی ایک ایک ذراسی بات یاد آ رہی تھی۔ رعنا کا مذاق اُڑانے والوں میں وہی تو سب سے پیش پیش ہوا کرتی تھی۔

گزشتہ برس موسمِ گرما کی تعطیلات کے بعد اسکول کھلنے پر جب رعنا جیسے دلہن سہاگن کے روپ میں اسکول آئی تھیں تو ان کو دیکھ کر بیشتر چہروں پر دبی دبی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ بیسیوں سیکڑوں استفسارات کیے گئے تھے۔ الفت نے جو اپنے گروپ کی گویا لیڈر تھی رعنا کو ہی کا خطاب دے کر میدان مار لیا تھا۔ اُس کی ساتھیاں ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی تھیں۔

"خدا کی قسم الفت ایسا خطاب ڈھونڈ کر لائی ہو تم رعنا کے لیے کہ جواب نہیں!" اُس کی معتمد ترین دوست شائستہ نے اُس کی پیٹھ ٹھوکتے ہوئے کہا تھا۔

اور اگر رعنا جمیل کے پیے میں کی ایسی گروان ہوتی کہ اس بے چاری کا گویا ناطقہ بند کر دیا۔ کبھی کبھی تو وہ زچ ہو کر اسٹاف روم سے نکل کر برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

تب الفت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ خود بھی رعنا جمیل والے آئینے میں اپنا عکس دیکھنے پر مجبور ہو جائے گی۔

زندگی بھی عجب کھیل کھیلتی ہے!

کبھی کبھی آدمی کو ایسے مقام پر لاکھڑا کرتی ہے کہ وہ آپ اپنے لفظوں پر پشیمان ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے!

دوسروں کے ساتھ کی گئی زیادتیاں پیچھے بن کر اُس کے اپنے دل میں گڑی ہیں جو لی ہیں۔

اور... ان کے رو برو کیے جانے والے آئینے میں اُس کا اپنا عکس نظر آنے لگتا ہے۔

اور

آدمی دوسروں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کی تلافی اور ازالے کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔

زندگی اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کھیل کھیل گئی تھی!!

الفت نے ہمت کر ہی لی۔

اسکول میں ایک کارڈ تو اُس نے ہیڈ مسٹریس اور تمام اسٹاف ممبران کے نام دیا۔

دوسرا علیحدہ دعوت نامہ مسز رعنا جمیل کے نام مع اُن کے اہل خانہ!

چاشنی الفاظ اور تمہید کے بغیر یوں اچانک اس کی شادی کا دعوت نامہ دیکھتے ہی اس کی ساتھیاں اچھل پڑیں۔

قریبی دوستوں نے شکایتیں، شکوے شروع کر دیں۔

"کیسی ایسی بھی کیا رازداری کہ کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ آخر بات چیت تو پہلے سے چل رہی ہوگی!"

"الفت ڈئیر! تم تو بڑی چھپی رستم نکلیں۔" شکوہ کیا گیا۔

"یار ہم نے تو بڑے بڑوں کے کان کتر دیے۔ صبح اسکول لگنے سے چھٹی ہونے تک ہمیں مرتبہ سامنا ہوا تھا۔ فری پیریڈ میں گھنٹوں ساتھ بیٹھتے تھے۔ انٹرول میں ساتھ چائے پیتے تھے مگر یار تم نے بھنک نہ دی؟" اس کے گروپ کی ایک منہ پھٹ ساتھی نے کہا۔

"بس اچانک ہی سب کچھ طے ہوا!"

"کتنا بھی اچانک ہوا ہوگا چند دن تو لگے ہی ہوں گے۔ راتوں رات تو رشتہ طے نہ کیا گیا ہوگا اور نہ ہی یہ دعوت نامے راتوں رات چھپے ہوں گے۔" آڑے ہاتھوں لینے کی کوشش کی گئی۔

"کیسی گھری نکلیں ساتھی تم تو؟"

اب وہ کیا بتاتی انھیں!

ان شکایتوں اور شکوؤں پر اس نے خاموش رہنا ہی بہتر جانا۔

نہ دیے گئے جانے والے ان گلے شکووں سے قطع نظر پیٹھ پیچھے کتنی خوب باتیں بنائی گئیں،

ہوں، طنزیہ جملے تھے۔

آنکھوں میں حسد کے شرارے

چہروں پر معنی خیز مسکراہٹیں!

اس صورتِ احوال کے تصور سے تو وہ خائف تھی۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کھلے میدان میں وہ بے سائبان اور بے ردا کھڑی ہو اور چہار اطراف سے چھوٹی چھوٹی کنکریاں اس کی سمت اچھالی جا رہی ہوں جو گو کہ بظاہر بے ضرر دکھائی دیتے ہوئے بھی گہرے گھاؤ لگنے کا موجب بن رہی ہوں۔

پھر حسبِ توقع نوع بہ نوع استفسارات کا سلسلہ شروع ہوا۔

"شادی کہاں ہو رہی ہے؟"

"کس سے ہو رہی ہے؟"

"خاندان کے ہیں یا پرایوں میں سے؟"

"نام کیا ہے؟"

"عمر کتنی ہے؟"

"رہنے والے کہاں کے ہیں؟"

"پڑھے لکھے کتنے ہیں؟"

"کرتے کیا ہیں؟"

"رہتے کہاں ہیں؟"
"گھر اپنا ہے یا کرائے کا؟"
"گھر ہے کتنا بڑا؟"
"وہ دیکھنے میں کیسے ہیں؟"
"دُبلے ہیں یا موٹے؟"
"لمبے ہیں یا چھوٹے؟"
"گورے ہیں یا کالے؟"
"انھوں نے تمہیں دیکھا؟"
"تم نے انھیں دیکھا؟"
"ساس سسر ہیں؟"
"نندیں ہیں؟"
"دیور جیٹھ ہیں؟"
"جہیز میں کیا کیا ہوگا؟"
"بَری میں کیا چڑھایا جا رہا ہے؟"

اور

اس نوعیت کے ان گنت سوالات!
غرضیکہ سارا جغرافیہ پوچھ لیا گیا۔
اگر نہیں پوچھا گیا تو یہ کہ صاحب۔ کیا پہلی شادی تھی یا دوسری؟
بچے ہیں؟
اگر ہیں تو کتنے؟
شاید غیر ضروری سمجھ کر نہیں پوچھا گیا تھا۔
یا پھر یہ کسی کو گمان ہی نہ تھا کہ اس کی شادی کسی شادی شدہ مرد سے بھی ہو سکتی تھی۔
ایسا مرد جس کی بیوی اُسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔
اپنے چار بچے اس کے پاس چھوڑ کر!
اس کی ساتھیوں نے اپنی دانست میں سب کچھ پوچھ لیا۔
اگر نہیں پوچھا تو وہ سوال جو سانپ کے گلے میں چھچھوندر کے مصداق کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔
جہاں دیدہ اور زمانہ شناس دیرینہ ساتھی مسز رفیع نے البتہ یہ ضرور کہا "شادی ہونے پر تو لڑکیاں خوش ہو کرتی ہیں۔
تم نے منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟"
اس کا جی بھر آیا۔
دل چاہا سب کچھ بتا دے انھیں۔
مگر ہمت نہ ہوئی۔

وہ دو روز بعد جب اس نے طبیعات کی تجربہ گاہ کے ایک گوشے میں طالبات کے جرنلز کی پڑتال میں مصروف رعنا جمیل کو بطور خاص علیحدہ سے دعوت نامہ دیا تو وہ حیرانی سے بولیں "مس الفت! آپ نے مجھے اپنے دوستوں میں کب سے شامل کر لیا؟"
"میں...... مجھی نہیں آپ کا مطلب؟" الفت نے ان سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔
"میرا مطلب ہے علیحدہ سے دعوت نامے تو آپ نے اپنی قریبی دوستوں ہی کو دیے ہوں گے؟"
"جی نہیں سوائے آپ کے کسی کو بھی نہیں دیا ہے میں نے علیحدہ سے کارڈ۔" وہ دھیرے سے بولی۔
"کیا واقعی؟" رعنا جمیل نے قدرے بے یقینی اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت اپنی نگاہوں میں سموئے اس کی طرف دیکھا۔
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اچھا پھر تو آپ کا بے حد شکریہ" رعنا نے کہا "کیا فرض ہیر پڑ رہی ہے آپ کا؟"
"..."

"تو بیٹھیے" وہ اپنے قریب پڑی خالی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔
وہ بیٹھی تو رعنا نے قلم ایک طرف رکھتے ہوئے اپنا کام روک دیا۔
"آپ یہ بات پوچھ رہی ہیں الفت؟" وہ مخلصانہ لہجے میں بولیں۔
"جی؟" الفت نے چونک کر ذرا کی ذرا ان کی طرف دیکھا۔
"اگر یہ سچ ہے کہ آپ نے علیحدہ سے کسی کو دعوت نامہ نہیں دیا ہے سوائے مجھ ناچیز کے تو کیا میں اس خصوصی عنایت کا سبب پوچھ سکتی ہوں؟"
الفت پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔
"میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں مسز جمیل" وہ بوجھل آواز میں بولی۔
"معافی؟" رعنا نے حیرانی سے اُسے دیکھا، وہ بولیں "میں سمجھی نہیں"
ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے الفت نے تجربہ گاہ کی کھلی کھڑکی سے باہر سبزہ زار کی جانب دیکھا "میں شرمندگی اور ندامت کے خمار میں بھیگی ہوئی ہوں۔ میں نے آپ کو بہت تنگ کیا...... آئی ایم رئیلی سوری فار دیٹ"
"اوہ!" وہ معاملے کی نوعیت سمجھ کر ہنس دیں پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں "میں جانتی ہوں ماں باپ کا گھر چھوڑتے ہوئے لڑکیاں یقیناً اتنی جذباتی ہو جایا کرتی ہیں" انھوں نے پل بھر کو توقف کیا پھر اس کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے بولیں "کوئی بات نہیں جو حقیقت ہے سو ہے..... ہاں میں دو بچوں کی ماں ہوں تو یہی اگر دوسروں کے ساتھ تم نے ہنس ہنس کر مجھے بھی کہہ دیا تو کون سی بُری بات ہے"
الفت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"آئی ایم سوری" اُس نے بھیگی آنکھوں سے رعنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کوئی بات نہیں" رعنا مسکرا کر بولیں۔
"آپ نے مجھے معاف کر دیا؟"
"دیکھو...... تمہارے معافی چاہنے یا میرے معاف کر دینے کی کوئی بات ہی نہیں...... بہرحال چونکہ میں تمہاری جذباتی کیفیت کو محسوس کر سکتی ہوں اس لیے اگر میرے یہ کہنے سے کہ ہاں میں نے معاف کر دیا تمہارا اطمینان ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے میں نے تمہیں معاف کر دیا" رعنا جمیل جو الفت سے ہمیشہ آپ جناب سے مخاطب ہوتیں تھیں بے تکلفی اور اپنائیت سے بولیں۔
"تھینک یو ویری مچ" اس نے دھیرے سے کہا۔
"میری دعا ہے کہ تم اپنی آئندہ زندگی میں بہت خوش رہو"
"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" الفت دھیمے سروں میں گویا ہوئی۔
"ضرور پوچھو"
"آپ خوش ہیں؟"
"خوش؟" انھوں نے دھیرے سے الفت کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بولیں "خوشی بھی ناقابل بیان سا شے ہے الفت...... یہ انسان کے ساتھ پوری زندگی آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے"
رعنا کے چہرے پر دھندلاہٹ سی لرزاں دیکھ کر الفت کا دل مضطرب ہو گیا۔
"یعنی آپ خوش نہیں ہیں؟"
"یہ میں نے کب کہا؟"
الفت ہکا بکا ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگی۔
"تم نے مجھ سے یہ سوال کس حوالے سے کیا ہے؟"
"میرا مطلب ہے آپ اپنی شادی سے خوش ہیں؟"
"میں کچھ ناخوش بھی نہیں" وہ موہوم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔
"یعنی بہت خوش بھی نہیں؟"
"سمجھ لو"
"کیوں؟ بہت خوش نہ ہونے کی وجہ؟"

"کیا مطلب؟"
"ملازمت چھوڑ دینے کا حکم ملا ہے؟"
"تمہارا [illegible] کی طرف سے؟"
"جی نہیں۔"
"تو کیا اُن کی طرف سے؟" رعنا نے [illegible]
اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"[illegible] ابھی نازل بھی نہیں [illegible]" رعنا [illegible]
[illegible]

"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ [illegible] شوہر کی تنخواہ اور وسائل کا جائزہ لینا۔ ہوسکتا ہے اُن کے وسائل اتنے [illegible] ہوں کہ معاشی فراغت کے لیے تمہیں اس طرح ملازمت جاری رکھنا ضروری نہ ہو۔"
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں تب ہی تو مجھے ملازمت چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے!"
"میرا مخلصانہ مشورہ [illegible] ہے کہ ملازمت چھوڑنے کے بجائے فی الحال [illegible] سالانہ چھٹیاں کتنی جمع ہیں تمہاری؟"
"پتا نہیں [illegible] جب سے میں ملازمت پر آئی ہوں میں نے کبھی رخصت [illegible] اتفاقی چھٹیوں سے کام چلایا [illegible]"
"تب تو کافی چھٹیاں جمع ہوں گی تمہاری۔ پہلے [illegible] تمام چھٹیاں لو پھر بعد کو دیکھنا!"
"اچھی بات ہے۔" الفت [illegible]
[illegible]
"چھٹی کے لیے [illegible]
[illegible]
"آپ کا بہت شکریہ۔" الفت نے [illegible] کہا۔
"کس بات کا شکریہ؟" رعنا نے [illegible]
"میری الجھن [illegible]
رعنا مسکرا دیں۔
[illegible]
"میں بتاؤں کیوں؟"
"ہاں بتائیے!"
"کیونکہ [illegible]
[illegible]

اور کسی ورقِ آشنا سے محروم ہونے کا دکھ بھی اندر پڑ گیا تھا۔

"کیا واقعی؟"
"کیا یہ سچ ہے؟"
اگلے دو تین دن وہ اسی نوعیت کے استفسارات کی زد میں رہی۔
اور تب اُسے احساس ہوا کہ حقیقت سے نظریں چرانے کے بجائے اُس کا سامنا کرکے آدمی زیادہ طمانیت محسوس کرتا ہے۔
وہ رعنا جبیں کی مشکور تھی کہ اُن کی حفاظتی پیش بندیوں نے اُسے بے جا خفت اور انجانے خوف سے نجات دلا دی تھی۔
رعنا کے مشورے کے مطابق اُس نے کلرک سے آفس سپرنٹنڈنٹ کی زیرِ نگرانی اپنی تمام چھٹیوں کا حساب کتاب کروانے کے بعد محکمہ کو تین ماہ کی چھٹی کی درخواست بھجوا دی۔
اپنی ساڑھے تیرہ برس کی ملازمت کے دوران اُسے لمبی رخصت لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی۔ برس کے برس ڈیڑھ سوا دو ماہ کی موسمِ گرما کی تعطیلات مل جایا کرتی تھیں۔ جشنِ عشرہ و موسمِ سرما کی چھٹیاں، علاوہ ازیں مختلف مذہبی تہواروں پر دن کے دن چھٹیاں ملتی رہتی تھیں۔ اُن سے قطع نظر سالانہ اتفاقی چھٹیوں کا مقررہ کوٹہ علیحدہ تھا۔ محکمہ جاتی قواعد و ضوابط کے تحت ملنے والی اُس کی تمام سالانہ چھٹیاں جمع پڑی تھیں۔
رعنا جبیں کے مشورے کی روشنی میں اُس نے فی الحال محض تین ماہ کی رخصت کے لیے درخواست دینا مناسب سمجھا۔ طویل رخصت لینا فی الحال بلا جواز محسوس ہوا۔ کیا عجب کہ آئندہ حالات اُس تین ماہ کی رخصت کو غیر ضروری قرار دے دیتے ——!
رعنا کو احوالِ دل سنانا اور اُن کا مشورہ حاصل کر لینا مفید ہی رہا تھا ورنہ شاید وہ تو آنکھ بند کرکے استعفیٰ ہی دے ڈالتی۔
اس فائدے سے قطع نظر اُس کو جو تقویت ملی تھی اور حقیقت کا سامنا کرنے کا حوصلہ پایا تھا وہ جدا تھا۔
شادی کی تیاریاں دونوں طرف ہی شروع ہو چکی تھیں۔
اِدھر جوش و خروش کے ساتھ
اور علی الاعلان!
لیکن جلیس الحسن کی طرف بہت احتیاط کے ساتھ۔
بچوں کی جذباتی کیفیت کا انھیں بخوبی اندازہ تھا اور اُن کا خیال کرتے ہوئے انھوں نے برّی کی تیاری کے تمام معاملات اپنے قریب ترین دوست جنید ہمدانی کی بیگم کے سپرد کر دیے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ برّی کے ملبوسات اور زیورات وغیرہ بیگم ہمدانی نہ صرف تیار کروائیں بلکہ انھیں اپنے ہاں ہی رکھیں۔ ساری تیاری ہمدانی صاحب کے ہاں ہو اور نکاح والے دن، مختصر سی برات بھی ہمدانی صاحب کے ہی گھر سے جائے۔
بچوں کو اپنی دوسری شادی کے بارے میں اعتماد میں لے لینے کے باوجود وہ یہ ساری حکمتِ عملی بچوں کی جذباتی کیفیت کو مزید مجروح نہ ہونے دینے کی خاطر اختیار کر رہے تھے۔
ملبوسات اور زیورات کے انتخاب کے لیے بیگم ہمدانی نے جلیس الحسن کے ایما پر الفت کو بھی ایک دو بار ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی مگر امی نے اس کی اجازت نہ دی۔ گو کہ بیگم ہمدانی کا یہ کہنا بھی بجا تھا کہ زمانہ بہت بدل چکا ہے اور یہ بھی درست کہ الفت پختہ عمر کی سمجھدار لڑکی تھی لیکن امی کو مشرقی اقدار اور رواج کا بڑا پاس تھا۔ الفت سے جلیس الحسن کی تخلیے میں ملاقات کی بھی انھوں نے [illegible] جملہ اہلِ خانہ کے سمجھانے بجھانے پر بدقت تمام اجازت دی تھی۔ بالآخر عظمت آپا، بھائی جان اور تبسم کو بیگم ہمدانی کے اصرار پر برّی کی خریداری میں اُن کی معاونت اور مشاورت کے لیے اُن کے ہمراہ دو تین بار بازار جانا پڑا۔
ولیمے کی بابت امی کی یہ رائے ٹھہری تھی کہ جب جلیس الحسن نکاح میں گنتی کے چند اصحاب لا رہے تھے تو اُن کی طرف سے ولیمے میں بھی محدود تعداد میں لوگ جائیں۔ خاندان کے قریبی گھرانوں سے ایک ایک یا حسبِ ضرورت دو دو افراد کو مدعو کر لیا جائے۔ ابا بھی اُن کی اس رائے سے متفق تھے اور بقیہ اہلِ خانہ بھی کہ ان سب کے خیال میں امی کی یہ رائے انتہائی

"قبول ہے۔"

بہت احتیاط سے ولیمے کے مدعوئین کی فہرست تیار کرنے کے بعد جلیس الحسن کو اس تعداد سے آگاہ کیا گیا تو وہ دوڑے ہوئے بابا کے پاس آئے اور انھوں نے کہا "نکاح میں کم لوگوں کو مدعو کیا اب میری ذاتی مجبوری سمجھیے مگر ولیمے میں آپ کی جانب سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت کو آپ میری خواہش سمجھیں۔"

"میاں! اسراف سے فائدہ؟" بابا نے کہا۔

"اسراف نہیں بلکہ آپ اسے میری خوشی سمجھیے" جلیس الحسن نے لجاجت سے کہا۔

"اچھی بات ہے میاں جلیس آپ کی خوشی۔"

نئے سرے سے ولیمے کے مدعوئین کی فہرست ترتیب دی گئی اور جلیس الحسن کو اُن کی تعداد سے آگاہ کر دیا گیا۔

تقریب ولیمہ کے لیے جلیس الحسن نے شہر کے معروف ترین فائیو اسٹار ہوٹل کا انتخاب کیا تھا اور مینو بختیار بھائی اور اُن کی بیگم کی مشاورت سے ترتیب دیا تھا۔

رسم نکاح اور ولیمے کے علاوہ جلیس الحسن نے بقیہ تمام رسومات کی ادائیگی میں کسی قسم کی دلچسپی لینے یا شرکت کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔

مگر

اس طرف ساری رسومات پورے جوش و خروش سے ادا کی جا رہی تھیں۔

الفت کو مایوں بھی بٹھایا گیا۔

ڈھولک بھی بجائی جا رہی تھی۔

گیت بھی گائے جا رہے تھے۔

اور رت جگے بھی منائے جا رہے تھے۔

مہندی کی رسم بھی ہوئی۔

امی کی خواہش اور ہدایت کے مطابق سارے ارمان پورے کیے جا رہے تھے کہ جلیس الحسن کی اگر دوسری شادی تھی تو کیا الفت تو پہلی بار دلہن بننے جا رہی تھی۔

ویسے اندر سے امی بڑی متفکر تھیں۔ کنواری بیٹی کو چار بچوں کے مطلقہ یا بیوی مر جانے والے شوہر کے ساتھ رخصت کرنے کے خدشات اور وسوسے بار بار اُن کے دل کو ہولاتے لگتے تھے اور وہ ان خدشات اور وسوسوں کا بابا کے سامنے برملا اظہار کر کے بیٹھ جاتی تھیں۔

بابا اُن کو سمجھاتے بجھاتے مگر حقیقت یہ تھی کہ متفکر وہ خود بھی تھے۔ اضطراب یہ اور بات تھی کہ وہ کسی سے کچھ کہتے سنتے نہ تھے۔ متفکر تو اپنی اپنی جگہ الفت کے جملہ متعلقین تھے۔

اور خود الفت بھی!

جوں جوں شادی کا دن نزدیک آتا جا رہا تھا اُس کے قلب و روح پر چھائے اضطراب کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

اُس کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔

ایک شادی شدہ مرد کنوارے مرد کی طرح سادہ تختی تو نہیں ہوتی کہ اُس کی زندگی میں داخل ہونے والی عورت بڑے زعم سے اس پر جو چاہے سو لکھ دے۔ اس کے ذہن پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہوتا ہے۔ اُس کے دل کے نہاں خانوں میں پچھلی عورت کی پرچھائیاں بکھیرے لے رہی ہوتی ہیں۔

شادی شدہ مرد کی زندگی میں داخل ہونے والی نئی عورت کو جیت تبدیلی کی خواہاں ہو ہر قدم اتنی خوبصورتی اور احتیاط سے اٹھانا پڑتا ہے کہ اُس کے دل سے گزر جانے والی پچھلی عورت کے نقوشِ پا اُس کے قدموں تلے نہ صرف چھپ جائیں بلکہ نئے نقوشِ پا حنا کی خوشبو اور پازیبوں کی جھنکار کے ساتھ محسوس ہوں۔

الفت جانتی تھی کہ زندگی کے پیچ و خم اُسے ایک کٹھن راستے کے نقطۂ آغاز پر لے جا کر کھڑا کرنے جا رہے تھے۔

اُس راستے کی دقتوں کا اُسے ابھی سے اندازہ تھا۔

راہ کے نشیب و فراز اور پیچ و خم پہلے ہی سے نظر تھی۔

اگلی منزلیں اشتباہ کی دھند اور بے یقینی کے کہر میں ملفوف تھیں۔

خدشات کا گھنگھور اندھیرا اُس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑے لے رہا تھا۔

منزل سے دُور اسی پیچ راہ میں بھٹکتے رہ جانے کا خوف ہمہ وقت اُس کے دل کی حالت دگرگوں کیے دے رہا تھا۔

اشتباہ اور بے یقینی کی وحشت تو جلیس الحسن کے دل پر بھی طاری تھی۔

خدشات کا اندھیرا اُن کے من میں بھی اُترا ہوا تھا۔

ایک دو نہیں اَن گنت خدشات تھے!

ڈھیروں فکریں تھیں۔

اور سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جس نے اُن کی راتوں کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔

وہ سوچتے:

کیا اُن کی زندگی میں آنے والی نئی عورت اُن کی زندگی سے نکل جانے والی عورت کا نعم البدل ثابت ہو سکے گی؟

کیا وہ صحیح معنوں میں اُن کی شریکِ زندگی بن سکے گی؟

کیا وہ اُن کے بچوں کو کھلے دل سے قبول کر سکے گی؟

انھیں اپنے دامنِ محبت میں پناہ دے گی؟

انھیں ماں کا پیار دینے کی کوشش کرے گی؟

اس خلا کو پُر کر سکے گی جو اُن کی اپنی ماں کے چلے جانے سے پیدا ہو گیا تھا؟

کیا وہ سوتیلی ماں کے روایتی تصور سے مختلف ثابت ہو سکے گی؟

اس گھر کی گم گشتہ خوشیوں کی واپسی کا سامان ہو سکے گا؟

اور

ان تمام سوالوں اور سوچوں سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا گھر آنے والی اس نئی عورت کو بچے اپنی ماں کی جگہ دے سکیں گے؟

جلیس الحسن کے لیے یہ سوال اس لیے زیادہ اہم اور گمبھیر ہو گیا تھا کہ جب سے انھوں نے اپنے بڑے بیٹے اعجاز اور بیٹی نگین کو اس سلسلے میں اعتماد میں لینے کی خاطر اُن سے بات کی تھی اُن کے رویے میں ایک عجیب سی احتیاط اور کھنچاؤ سا آ گیا تھا۔

نہ صرف ان دونوں کے بلکہ اُن سے چھوٹے فراز اور زرین کے رویے میں بھی!

جلیس الحسن کے ایما پر ان دونوں کو اس معاملے سے پہلے اعجاز اور نگین نے آگاہ کیا تھا مگر بچوں اس طرح جیسے اُن کے لیے نئی ماں گھر لانے کا فیصلہ کر کے اُن کا باپ اُن کے ساتھ کوئی بہت بڑی زیادتی کرنے کا مرتکب ہونے جا رہا تھا۔

پھر جب جلیس الحسن نے ایک رات فراز اور زرین سے اس سلسلے میں بات کی تو زرین نے معصومانہ سنجیدگی سے بلا تردد کہہ دیا۔

"بابا! ہمیں ممی نہیں چاہیے۔"

"کیوں بیٹا؟"

"بس!" زرین نے بڑی قطعیت کے ساتھ اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

اور اُس کی اِس "بس" نے تو جلیس الحسن خود کو بے بس محسوس کرنے لگے تھے۔

مگر اب اُن کے بے بس ہونے سے کوئی فرق نہ پڑ سکتا تھا۔

بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔

اتنی آگے کہ واپسی کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

وہ ایک شریف اور معزز گھرانے کی لڑکی سے عقد ثانی کرنے جا رہے تھے اور اس سلسلے میں مکمل تیاری کی جا چکی تھی۔

بچوں کے اس رویے کے پیشِ نظر انھوں نے انھیں تقریب سے دُور رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

"بیٹا آپ لوگ اتنے تو تہیں کریں گے اگر آپ کی نئی ممی کو ہم خود ہی لے آئیں میرا مطلب ہے آپ لوگوں کو ساتھ لے جانے میں۔"

نکاح سے تین روز قبل انھوں نے کھانے کی میز پر بچوں سے پوچھا۔ اُن کے لہجے میں احتیاط اور خفت کی ملی جلی کیفیت تھی۔

اعجاز اور نگین نے یک بیک کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

"جی نہیں آپ لڑ رہے تھے۔" زرین جل کر بولی۔

"نہیں بھولی ہم واقعی مذاق کر رہے تھے۔" نگین نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"نہیں جھوٹی بھی باجی اور جاجی بھائی جھوٹ بولتے ہیں، یہ لڑ رہے تھے۔" فراز نے بھی جمو کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں آپ دونوں لڑ رہے تھے۔" زرین کے چہرے کے خطوط سنورتے سنورتے پھر بگڑنے لگے۔

"فراز جھوٹ بولتا ہے۔ ہم مذاق کر رہے تھے۔ دیکھو ہماری تو دوستی ہے۔" نگین نے اپنا ہاتھ اعجاز کی جانب بڑھایا۔

اور اعجاز نے نگین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"رئیلی!" زرین کے لبوں پر بھیگی بھیگی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں!"

زرین مسکرا دی۔

اور اس مسکراہٹ کا عکس نگین، اعجاز اور فراز کے چہروں پر بھی بکھرنے لگا۔

"اچھا تو پھر اسٹیریو لگاؤ۔" زرین نے اعجاز کی طرف دیکھا۔

اعجاز آگے بڑھا اور اسٹیریو آن کر دیا۔

پھر وہ زرین کو خوش کرنے کے لیے انگریزی دھن پر تھرکنے لگا۔

ذرا دیر بعد ہی

فکر فردا سے بے نیاز وہ چاروں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رقصاں تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔

کوٹھی کی زیریں منزل پر جلیس الحسن فکر فردا سے مدہوش بیٹھے تھے۔

بالائی منزل پر انگریزی موسیقی کا شور انھیں یہ سوچنے پر مجبور کیے دے رہا تھا کہ کیا کل کے بعد بھی اس گھر میں البیلا شور ایسے ہی قہقہے سنائی دے سکیں گے!

وہ اس امر سے بے نیاز تھے کہ یہ شور، یہ قہقہے تو اس سرد اور طوفانی لہر کی بازگشت تھے جو کچھ دیر پہلے ان کے بچوں کے قلب و روح کو لرزا کر گزر گئی تھی۔

اگلے روز برات تھی۔

شام ساڑھے سات بجے پانچ کاروں پر مشتمل مختصر سی برات بختیار ہمدانی کے گھر سے روانہ ہوئی

اور

رات کو ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ جب ان پانچ گاڑیوں میں سے دو "محسن لاج" کے صدر دروازے پر پہنچیں تو دربان ...... اپنے مالک اور نئی مالکن کے استقبال کو مستعد کھڑا تھا۔ ہارن سنتے ہی اس نے دروازہ وا کر دیا اور ہیڈ لائٹس سے نظریں چرانے لگا۔

ان میں سے ایک گاڑی جلیس الحسن کی تھی جسے وہ بختیار ہمدانی کے برادر خورد ڈرائیو کر رہے تھے۔ اگرچہ جلیس الحسن چاہتے تو اس روز ڈرائیور کو یہ خدمت سونپ سکتے تھے مگر انھوں نے تقریب نکاح سے نہ صرف اپنے بچوں بلکہ ملازمین کو بھی دور رکھا تھا تاکہ وہ بعد میں چٹخارے دار داستان طرازیاں کریں۔

ڈرائیونگ سیٹ کے برابر دوسری نشست پر گلاب کے پھولوں سے ڈھکی جلیس الحسن کی کلاہ دھری تھی۔ سسرال سے ان کے لیے گلاب کے دو ہاروں کا ساجوڑا بھجوایا گیا تھا جسے وہ بختیار ہمدانی کے ہاں سے زیب تن کر کے سسرال پہنچے تھے۔

گاڑی کی عقبی نشست پر الفت درمیان میں بیٹھی تھی اور اس کے دائیں جانب جلیس الحسن اور بائیں جانب پھوپی زاد بھاوج شاکرہ بیٹھی تھیں جو ساتھ والی بن کر دلہن کے ہمراہ آئی تھیں۔

دوسری گاڑی میں بختیار ہمدانی، ان کی بیگم اور دو بچے تھے۔

کوٹھی کی بالائی منزل پر خلاف معمول رات کے ساڑھے بارہ بجے بھی ٹی وی لاؤنج کی بتی جل رہی تھی۔

چاروں بچے جاگ رہے تھے۔

نیچے گاڑی کا ہارن بجتے اور آہنی صدر دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی وہ چاروں لاؤنج کے سلائیڈنگ ڈور میں جڑے شفاف شیشوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

کوٹھی کے احاطے میں گاڑی کے داخل ہوتے ہی جلیس الحسن کی نظر بے ساختہ بالائی منزل کی جانب اٹھی۔ اور وہ

خلاف معمول آدھی رات گئے ٹی وی لاؤنج کی بتی جلنے اور شیشوں کے پیچھے چار شناسا سایوں کو متحرک دیکھ کر ایک عجیب احساس جرم سے دوچار ہو گئے اور انھوں نے چپ چاپ ادھر سے نظریں چرا لیں۔

زیریں منزل تو جگمگا چوند ہو رہی تھی۔

ماما اور خانساماں نئی مالکن کے استقبال کو اندر سے باہر لپکے چلے آتے تھے۔

گاڑیوں کے رکتے ہی عقبی گاڑی سے بیگم ہمدانی اپنی بارہ سالہ بچی کا ہاتھ سنبھالتی اتریں اور جلیس الحسن کی گاڑی تک پہنچنے کے بعد الفت کو سہارا دے کر گاڑی سے اتارنے میں جلیس الحسن اور شاکرہ بھابی کی معاونت کرنے لگیں۔

جلیس الحسن اور شاکرہ بھابی الفت کو سہارا دیے برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچے۔ بیگم ہمدانی نے اس کے شرمائے سراپے کو جھک کر چھپکی سے پکڑتے ہوئے تدرے اوپر کر رکھا تھا۔

ہر قدم سنبھل سنبھل کر یوں اٹھایا جا رہا تھا جیسے پھولوں پر چل رہے ہوں!

برآمدے کی سیڑھیوں کے نزدیک پہنچ کر بیگم ہمدانی کے اشارے پر وہ سب تھم گئے۔

"جلیس بھائی ایک جگ ٹھنڈا پانی تو منگوا دیجئے گا۔" بیگم ہمدانی نے کہا۔

جلیس الحسن کے حکم پر ماما لپکی ہوئی اندر گئی اور ٹھنڈے پانی سے بھرا جگ لے آئی۔ بیگم ہمدانی نے دلہن کی راہ میں ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ اسے سدا سکھی اور شاد رہنے اور پھلنے پھولنے کی دعائیں دیں۔

سہارا دے کر الفت کو اس کے نئے گھر کی دہلیز پر چڑھا دیا گیا تھا۔

کوٹھی کی بالائی منزل پر چاروں بچے جو ٹی وی لاؤنج سے نکل کر ٹیرس پر آ کھڑے ہوئے تھے، ریلنگ کے سہارے جھکے انتہائی حیرانی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔

نگاہوں میں حیرانی تھی۔

اداسی تھی۔

اندیشے تھے!

الفت کو نفاست سے آراستہ جلیس الحسن کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا تھا۔ شاکرہ بھابی اس کے پاس ہی تھیں۔ بیگم ہمدانی اور جلیس الحسن باہر چلے گئے تھے۔

بختیار ہمدانی نے نرسری میں لے جایا جانے والا سوٹ کیس اور وینٹی بکس اپنی گاڑی کی ڈگی سے نکلوا کر برآمدے میں رکھوا دیا تھا۔

الفت کا تمام جہیز ماسوا ملبوسات کے جہازی سائز سوٹ کیس اور زیورات کے ابھی میکے ہی میں تھا۔ مذکورہ سوٹ کیس جو مقفل تھا اور جلیس الحسن کی گاڑی کی ڈگی میں رکھا تھا۔ جلیس الحسن نے الفت کو اس کے کمرے میں پہنچانے کے بعد دوبارہ اپنی نگرانی میں خانساماں اور چوکیدار سے ڈگی سے اتروایا اور دونوں سوٹ کیس الفت کے کمرے میں پہنچا دینے کی ہدایت کی۔

بیگم ہمدانی نے دونوں سوٹ کیسوں کی چابیاں جلیس الحسن کے حوالے کیں۔ الفت کے کمرے میں بیٹھیں۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھیں پھر اجازت چاہی۔

بختیار ہمدانی، ان کے برادر خورد اور دونوں بچے ان کے منتظر تھے۔

زرتار سرخ دوپٹے کی اوٹ سے الفت نے اس کمرے کا جائزہ لیا جس میں وہ اس وقت بیٹھی تھی۔ خواب گاہ کی آرائش صاحب خانہ کے صاحب حیثیت ہونے کی غماز تھی۔ وہ جہازی سائز کی شاندار مسہری پر بیٹھی تھی۔

مگر

زرتار لڑیوں سے آراستہ مجلۂ عروسی تھا نہ گلاب کی نرم و نازک کلیوں، پنکھڑیوں سے سجی سیج۔

زرتار گھونگھٹ کی اوٹ سے دکھائی دینے والا یہ منظر اس سے مادی طمانیت کا وعدہ کر رہا تھا۔

جس گھر سے وہ اس گھر میں آئی تھی وہاں کے مقابلے میں یہاں بہت کچھ تھا لیکن اگر نہیں تو اطمینان قلب اور خوشی کا احساس!

دفعتاً یہ خیال کوڑیالے سانپ کی طرح اس کے ذہن میں لہرایا۔

وہ اس گھر میں پہلی عورت نہ تھی۔
جس بستر پر بیٹھی تھی وہ کوارا نہ تھا!

شاکرہ بھابی جن سے اس کی گھنٹوں تو کیا چند منٹ ملاقات ہو سکی تھی اس وقت اُس کے نزدیک بیٹھی اُسے لب کشائی پر آمادہ کرنے کے لیے مختلف حربے آزما رہی تھیں اور وہ محض ہاں کے سوا کچھ نہ کہہ پا رہی تھی۔

مہمانوں کے رخصت ہو چکنے کے بعد جلیس الحسن کمرے میں آئے تو شاکرہ بھابی اُٹھنے کو پر تولنے لگیں۔

"آپ یقیناً تھک چکی ہیں۔" جلیس الحسن شاکرہ بھابی سے بولے۔

"ہاں بھیا مجھے تو آپ اب سے پڑھنے کی جگہ بیٹھا دیجیے۔"

"آیئے میں آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دوں۔"

شاکرہ بھابی نے الفت کے قریب جھک کر اس کا گھونگھٹ تھوڑا سرکاتے ہوئے معنی خیز نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں "اچھا کیتی الفت شب بخیر!"

الفت کے قلب و روح پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہونے لگی۔ اُس نے چپکے سے شاکرہ بھابی کا ہاتھ اپنے خنائی ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ شاکرہ بھابی نے بہت دھیرے سے اپنا ہاتھ اُس کی گرفت سے چھڑوایا اور اُس کے سر کو بوسہ دیتے اور اُس کا شانہ تھپتھپانے کے بعد جلیس الحسن کی معیت میں کمرے سے باہر چلی گئیں۔

الفت کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔
نئی منزلوں کی دہلیز پر وہ سراپا ہراساں کھڑی تھی۔

شاکرہ بھابی کو گیسٹ روم تک پہنچانے اور ماما کو اُن کے آرام و سہولت کا پورا خیال رکھنے کی ہدایت دینے کے بعد جلیس الحسن نے اپنے کمرے کا رُخ کرنے کے بجائے بالائی منزل کو جانے والے زینے کا رُخ کیا۔

ٹی وی لاؤنج کی بتی اب بجھ چکی تھی تاہم تمکین اور زرتبین کے مشترکہ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور دروازے پر پڑے پردے سرکے ہوئے تھے۔ چاروں بچے اسی کمرے میں تھے۔

خاموش
اُداس
اور دل گرفتہ!

جلیس الحسن کو ایک بے نام سے احساسِ خطا نے آلیا۔
جیسے اُن کی خاموشی اُداسی اور دل گرفتگی کے ذمے دار وہی ہوں۔
مگر نہیں
اُن کی خاموشی، اُداسی اور دل گرفتگی کی اصل ذمے دار تو اس وقت سات سمندر پار اُن سے ہزاروں میل دُور بیٹھی تھی۔

کاش! اُس نے جانے سے پہلے سوچا ہوتا کہ وہ ایک ایسی خطا کی مرتکب ہو رہی تھی جس کی سزا اس کے جگر گوشے بھگتتے جا رہے تھے۔

تمکین مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔
زرتبین بستر پر اس طرح اوندھی پڑی تھی کہ اُس کا سر تمکین کے زانو پر تھا اور تمکین کی انگلیاں اُس کے ریشمی بالوں میں دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں۔

اعجاز قالین پر ٹانگیں لمبی کیے مسہری کے کنارے سے سر ٹکائے خاموشی سے چھت کو تک رہا تھا۔ اُس کا چہرہ کسی گہری سوچ کا غماز نظر آ رہا تھا۔

فراز کرسی پر بیٹھا معصومانہ بے بسی سے کبھی تمکین کبھی اعجاز کو دیکھنے لگتا۔

اپنی اپنی دنیا میں وہ اس قدر گم تھے کہ انھیں کمرے کے دروازے پر باپ کے آ کھڑے ہونے کی خبر ہی نہ ہوئی۔

جلیس الحسن دروازے میں کچھ دیر کھڑے انھیں دیکھتے رہے پھر انھوں نے کھنکار کر اُن کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی، وہ اپنے دل پر طاری احساسِ خطا کو خوشگوار مسکراہٹ کی ردا اوڑھاتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔

تمکین، اعجاز اور فراز نے چونک کر اُن کی جانب توجہ کی اور زرتبین اُٹھ بیٹھی۔

"کیا بات ہے بچو آج ابھی تک جگائی ہو رہی ہے؟"

چاروں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔

جلیس الحسن زرتبین کے پاس جا بیٹھے اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "کیوں بیٹے آپ سوئیں نہیں ابھی تک؟"

زرتبین نے ذرا دیدہ نگاہوں سے پہلے بڑی بہن اور دونوں بھائیوں کو دیکھا پھر مدھم سُروں میں بولی "نیند نہیں آئی آپ نے سلایا جو نہیں"

جلیس الحسن نے تمکین، اعجاز اور فراز کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

خاموشی کی ایک سرد سی نقاب تو ان تینوں ہی کے چہروں پر پڑی تھی مگر اعجاز کا چہرہ سرد خاموشی کی آڑ میں عجیب سی کیفیت کا مظہر نظر آتا تھا۔

جلیس الحسن کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی اس وقت اُن سے بات کرنے یا اُن کی کسی بات کا جواب دینے کے موڈ میں نہ تھا۔

انھوں نے ہلکی سی کھنکار کے بعد کہا "بچو! وہ...... آپ کی نئی ماما آگئی ہیں۔ کیا آپ لوگ اُن سے ملنا پسند کریں گے؟"

اعجاز نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور دھیرے سے رُخ بدل دیا۔

تمکین انگلیاں چٹخانے لگی۔

فراز اور زرتبین بھی مضطرب سے نظر آنے لگے۔

جلیس الحسن نے اعجاز کی جانب پیش قدمی کی، اور اُس کے سر پر بصد شفقت ہاتھ دھرتے ہوئے بولے "جب آپ لوگ جاگ رہے ہیں تو مل ہی لیں اپنی نئی ماما سے۔"

"صبح ...... مل ...... لیں گے پاپا۔" تمکین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے جب آپ جاگ رہے ہیں تو ابھی کیوں نہیں؟"

"آں ..... ہاں ..... اچھا ..... ٹھیک ہے۔" تمکین اٹکتے ہوئے بولی۔

"گڈ!" جلیس الحسن بیٹی کی سعادت مندی پر خوش ہو گئے۔

فراز اور زرتبین بھی کچھ زیادہ ڈسٹرب یا کبیدہ نظر نہ آرہے تھے مگر اعجاز بیٹھے سے اکھڑا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

جلیس الحسن نے جھک کر اُس کے شانے پر ہاتھ دھر دیا اور بڑے ملائم لہجے میں بولے "بیٹا جی! آپ کی کیا مرضی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ اُن کی طرف دیکھے بنا سپاٹ لہجے میں بولا۔

"کیا ٹھیک ہے شاہزادے؟" جلیس الحسن نے اُس کا شانہ تھپتھپایا۔

"مل لیتے ہیں جی اُن سے۔" وہ نیم دلی سے بولا۔

"اُن سے کن سے؟" جلیس الحسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔

اعجاز جزبز نظر آنے لگا۔

"بیٹے جی!" جلیس الحسن نے رسانیت سے کہا "میں مانتا ہوں کہ وہ آپ کی سگی ماں نہیں مگر شاید آپ کی ماں سے اس لحاظ سے بہتر ہیں کہ آپ کی ماں اس گھر کو اور آپ سب کو چھوڑ کر آپ کی پروا کیے بغیر بہت دُور چلی گئیں جبکہ آپ کی نئی ماما اپنا گھر، اپنے امی ابو اور بھائی بہنوں کو چھوڑ کر آپ کا خیال رکھنے کے لیے اس گھر میں آئی ہیں۔ اب آپ لوگوں کو اُن کا خیال رکھنا ہوگا، اُن کی عزت کرنی ہوگی اور انھیں شکایت کا موقع کم سے کم دینا ہوگا۔ کیونکہ ہمیں اُن کی ضرورت ہے۔" انھوں نے توقف کیا پھر بولے "آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

"جی پاپا!" اعجاز نے سر ہلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے تو پھر اٹھو اور چل کر اپنی نئی ماما سے ملو!"

اعجاز بے دلی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

مسلسل کئی گھنٹے تک بیٹھے رہنے سے الفت کی کمر تختہ ہو چکی تھی۔

جلیس الحسن خاصی دیر کے بعد پلٹے۔

قدموں کی آہٹ سنتے ہی الفت کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔

سرزد ہوں گی..... حالات نے انہیں اُجڈ بنا دیا ہے۔ ان کے مسائل کو ماں کی نظر سے دیکھئے اور ان کے دکھ سکھ کو اسی حیثیت بنانے کی کوشش کیجیے گا اور جب اُن سے غلطیاں سرزد ہوں تو اُن کے لیے کوئی سزا تجویز کرنے سے قبل لحظہ بھر کو اتنا سوچ لیجیے گا کہ اگر ان بچوں نے آپ کے بطن سے جنم لیا ہوتا تو اُن کی غلطی یا لغزش پر آپ کا ردِ عمل کیا ہوتا؟ آپ ان بچوں کے معاملے میں مجھ سے تعاون کیجیے، میں آپ کے ہر معاملے میں آپ سے تعاون کروں گا۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ خوب گاہ میں ایستادہ بلند و بالا چوبی الماری تک گئے۔ الماری کھولی۔ اُس میں سے ایک سنہرا ڈبہ نکالا اور دوبارہ اُس کے نزدیک آ بیٹھے اور اُس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تیسری انگلی میں موجود انگوٹھی کے آگے ایک اور بیش قیمت ہیرے جڑی انگوٹھی پہناتے ہوئے بولے۔ "اگرچہ دانشوروں کا یہ مقولہ عالمگیر شہرت کا حامل ہے کہ مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ اُس کے معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ میری طرح کے حالات کا شکار ہوا ہوتا تو یقیناً یہ کہتا کہ ایک بچوں والے مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ اُس کے بچوں کے دل سے ہو کر گزرتا ہے!"

اور چند لمحوں بعد

حنا لیں، اس کو فرشتوں سے مہکتی خواب گاہ میں پھیلا دودھیا اُجیلا تیرگی کی لطیف و سحر انگیز باہوں میں سمٹ گیا۔

اگلی صبح جلیس الحسن نے بہت ہی آہستگی سے اُس کا شانہ ہلاتے ہوئے اُسے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

"اُلفت! بچے ناشتے پر ہمارے منتظر ہوں گے۔"

غنیمت ہوا کہ ذمہ داری کی تشکیل تھی۔

ورنہ شاید جلیس الحسن یہ بھی کہتے کہ

"انہیں اسکول بھیجنا ہے۔"

یا

"انہیں اسکول بھی پہنچانا ہے۔"

یا پھر یہ کہ

"انہیں اسکول بھی جانا ہے۔"

اُس کے دل پر دھچکا سا پڑا۔

گزری رات نئی منزلوں کی دہلیز پر ہی چار بچوں کی ماں بن جانے کا صدمہ ابھی دھیما نہ پڑا کہ صبح آنکھ کھلنے سے پہلے ہی پھر بچوں کا ذکر!

وہ اُٹھ بیٹھی۔

محتاط اور محجوب سی!

جلیس الحسن نہاتے دھوتے نکھرے نکھرے سے تیار کھڑے تھے۔

وائل کا سفید براق کلف دار کرتا اور کھڑا پاجامہ۔

گریبان میں طلائی بٹن

کلائی پر دمکتی سنہری گھڑی۔

پیروں میں سلیم شاہی جوتے

اور نفاست سے آراستہ بال۔

اُن کے وجود سے اُٹھتی کولون کی ہوشربا مہک نے الفت کی مشامِ جاں کو معطر کر دیا۔

اُس نے ایک نظر انہیں دیکھا اور غرور کا احساس اُس کے دل میں سرزد جوانی کی طرح انگڑائیاں لینے لگا۔

"کل رات شادی میں جن اشات میرز نے دیکھا ہوگا، دل تھام کے رہ گئی ہوں گی!" الفت نے جی ہی جی میں سوچا۔

"اور اگر اس وقت دیکھ لیں تو.......!"

اُسے یاد تھا کہ جب اُس کی ساتھی رخشی کی شادی کے موقع پر شادی میں شریک اشات میرز نے رخشی کے دولہا کو دیکھا تھا تو اُن کی صفوں میں یہاں سے وہاں تک رشک کے ملے جلے جذبات کا سیلاب اُمڈ آیا تھا اور اگلی صبح اسکول میں سلام دعا کے بجائے یہی پوچھا جا رہا تھا کہ رخشی کے دولہا کو دیکھا؟

مگر

جلیس الحسن

اُس کا اپنا شریکِ زندگی تو رخشی کے دولہا کو کہیں پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

رخشی کے دولہا کی خفتہ رنگت ہی تو سرخ و سپید تھی جس پر اشات میرز مر مٹی تھیں۔

اُس کا شریکِ سفر تو مردانہ وجاہت کے سات سُروں میں ڈوبا نظر آتا تھا۔

دراز قامت

اپنی پرسنلٹی کا بھرپور خیال رکھنے والے کسی اسپورٹس مین کی طرح مستعد اور چاق و چوبند۔

چہرے پر متانت اور تازگی۔

آنکھوں میں خمار

گھنی مونچھیں

اس مجموعی حیثیت کو سنجیدگی اور متانت نے دو آتشہ کر دیا تھا۔

شاید وہ نوجوانی میں ہاتھ پیچھے نہ تکا کرتے ہوں گے جتنے کہ اس درمیانی عمر میں لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر کچھ ایسا تاثر ملتا تھا جیسے کسی لمبے اور لق و دق راستے کے بیچ و سط میں کوئی راہ رو چلتے چلتے یک بیک ٹھہر گیا ہو، کچھ دیر سستانے کی خاطر اور پلٹ کر پیچھے آنے والوں کو بصد غرور و ناز دیکھتے ہوئے کہتا ہو "دیکھو تم سے کتنا آگے نکل آیا ہوں....... اور پھر گردن موڑ کر پیچھے نظر دیکھتے ہوئے آگے نکل جانے والوں سے کہتا ہو "فکر مت کرو، میں پہنچا ہی چاہتا ہوں!"

ایک کمانا پیشہ رہو رات کھڑ کھڑا رہا تھا، ہنوز برس سکا رہتا۔

حنا لیں، بہت ہی آہستگی سے کمرے کی تنگ فضا میں ہلکورے لے رہی تھی۔

کمرے میں جلیس الحسن کی موجودگی الفت کو ایک عجیب سے سحر انگیز احساس سے ہم آغوش کیے دے رہی تھی۔

وہ اُٹھ بیٹھی تھی اور محجوب مگر مسابقتی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

"میں کچھ مدد کر سکتا ہوں میں؟" جلیس الحسن اُس کی نگاہوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

"وہ..... شاکرہ بھابی......"

"انہیں بلواؤں؟" انہوں نے بڑی رسانیت سے پوچھا۔

"جی!"

اُسے زیب تن کرنے کے لیے نیا جوڑا چاہیے تھا۔ گو بری اور جہیز کے ملبوسات پر مشتمل دونوں سوٹ کیس، اسی کمرے میں رکھے تھے۔ جہیز والے سوٹ کیس کی چابی جیسے وہ کسی رنگ سے پہچان سکتی تھی۔ سائیڈ بورڈ پر ایک دوسری کی رنگ کے ساتھ جو یقیناً بری والے سوٹ کیس کی آب جیسی دو چابیاں اپنے حلقے میں سمیٹے ہوئے تھی، پڑی تھی مگر حجاب کا تقاضا تھا کہ وہ نئی صبح کے لیے نیا جوڑا منتخب کرنے کے مسئلے میں شاکرہ بھابی کو زحمت دے۔

جلیس الحسن کے کمرے سے جانے کے بعد اُس کی متلاشی نگاہیں کمرے کے طول و عرض میں بھٹکنے لگیں اور پہلو بہ پہلو ایستادہ تین شیشوں والی ڈریسنگ ٹیبل پر نظر پڑتے ہی اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

ڈریسنگ ٹیبل ان تمام لوازمات سے مزین تھی جو جدید دور کی ایک فیشن ایبل عورت اپنے حسن کی آرائش کے لیے استعمال کیا کرتی ہے۔

یقیناً وہ لوازمات آرائشِ حسن جلیس الحسن کی پہلی بیوی کے استعمال میں رہے تھے جو اگرچہ اُن کی زندگی سے نکل چکی تھی مگر اپنے نقوش پا چھوڑ گئی تھی۔

اس ان دیکھی، انجانی عورت سے رقابت کا احساس خلش کی صورت الفت کے رگ و پے میں پاؤں پسارنے لگا۔

شاکرہ بھابی تنہا کمرے میں آئیں اور انہوں نے آتے ہی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ملامت سے میں کہا: "سچ کہتی ہوں الفت! رات بھر اس خیال نے مجھے بے کل رکھا کہ جب تمہارے دولہا نے رات کو چاروں بلا بھیجا، سے سر پہ لا کھڑی کی ہوں گی تو تمہارے دل پر کیا گزری ہو گی؟"

الفت کو یوں لگا جیسے گھاؤ ابھی ابھی لگا ہو۔
لیکن اگلے ہی لمحے وہ متعجب ہو کر شاکرہ بھابی کی جانب دیکھنے لگی۔
"آپ کو کس نے بتایا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔
"بتاتا کون...... میں نے خود دیکھا۔"
"مگر...... آپ...... آپ تو یہاں سے جا چکی تھیں!"
"ہاں تو کیا! یہاں سے جا چکی تھی تو کیا ہوا۔ تھی تو اسی گھر میں۔"
"تو آپ نے...... دیکھا؟"
"ہاں بالکل دیکھا اور کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔"
"اس کمرے کی؟" وہ گھبرا کر چہرہ اوپر دیکھنے لگی۔
"تمہیں یعنی اُس کمرے کی جو تمہیں سونے کے لیے دیا گیا!"
الفت نے سکون کا سانس لیا۔
وہ تو اس خیال ہی سے وحشت زدہ ہو گئی تھی کہ کہیں کھڑکی سے شاکرہ بھابی رات بھر...... !
"بی بی! میں تو یونہی ذرا کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ دیکھا تو تمہارے دولہا چاروں بچوں کو سینے سے چمٹائے زینے سے نیچے اتر رہے تھے...... میرا دل تو جیسے کسی نے چھری تلے دبا دیا۔" شاکرہ بھابی نے توقف کیا پھر بولیں۔ "کہیں لے کر گئے تھے؟"
"سلوانے۔" اُس نے بوجھل آواز میں کہا۔
"لو بھلا ایسے تو کوئی نہیں کیا کرتا ہے...... بات نہ چیت...... سلام نہ دعا، چار بچے لا کر کوری دلہن کے سر پر کھڑے کر دیے۔ صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے کیا! ارے بھئی کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھیں تم۔ آپ تو صبر شکر کر کے اسی گھر میں رہنا ہے۔"
الفت پر اضطرابی کیفیت طاری ہونے لگی۔
"کچھ کہہ رہے تھے؟"
"کچھ نہیں۔"
"منہ دکھائی کو لائے تھے؟" شاکرہ بھابی کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔
"جی۔"
"کس کی؟ اُن کی یا تمہاری؟"
الفت کے لبوں پر لرزش سی طاری ہونے لگی۔
شاکرہ بھابی اپنی تیوریوں پر پڑے بلوں میں مزید اضافہ کرتے ہوئے بولیں۔ "بی بی! یہ بتاؤ تمہارے دل پر کیا گزری؟"
"کیا گزرنی تھی بھابی!" اُس کے لہجے سے ملال اور دل شکستگی عیاں تھی۔
شاکرہ بھابی نے ایسی سرد اور وہیں سانس کھینچی جو اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں کھبتی محسوس ہوئی۔
"سارے خاندان والوں کو دکھ ہے اس بات کا۔" انھوں نے کہا۔
"کس بات کا؟" الفت نے استفہامیہ انداز میں شاکرہ بھابی کی جانب دیکھا۔
"تمہیں چار بچوں پر دیے جانے کا۔"
الفت کو یوں لگا جیسے اُس کا دل ہمیشہ کے لیے دھڑکنا بند کر دے گا۔
اُسے اپنی سماعت بے کار محسوس ہوئی۔
یہ بات شاکرہ بھابی کہہ رہی تھیں!
شاکرہ بھابی! جنھوں نے ایک روز عظمت آپا کے ساتھ بیٹھ کر اُسے سمجھایا بجھایا تھا کہ چار بچوں کے باپ سے اُس کی شادی کوئی عجوبہ امر نہ ہوگی۔
ان گنت کنواری لڑکیاں بیاہی گئی ہیں مطلقہ اور رنڈووں کے ساتھ۔
اور ایسے مرد تو اپنی دوسری بیویوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔
بہت خوش رہتی ہیں وہ۔
اور ویسے بھی مر جانے یا چھوڑ کر چلی جانے والی ماؤں کے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنا کارِ ثواب ہوا کرتا ہے۔

ماں چھوڑ کر چلی گئی تو بے چارے بچوں کا کیا قصور!
وہ تو پیار محبت کے بھوکے ہوں گے۔
ذرا سا پیار کرو گی اور محبت سے سر پہ ہاتھ دھرو گی تو تمہارے ہی بن جائیں گے۔
اور
اب اس وقت!
وہی شاکرہ بھابی کہہ رہی تھیں کہ سارے خاندان والوں کو تمہیں چار بچوں پر دیے جانے کا رنج ہے!
کیسے یقین کر لیتی وہ اس بات کا؟
وہ تنہا تھی اور سارا خاندان اُس کے مقابل صف آرا تھا۔
اُس کا انکار تھا اور ان سب کا اصرار!
ان سب نے مل کر اُسے زہراب پیش بھی کیا تھا اور آنکھیں بند کر کے پی جانے پر مجبور کیا تھا۔ ان سب نے تو مل کر اُسے صلیب پر چڑھایا تھا اور پھر اُس کے بدن میں میخیں ٹھونکی تھیں۔ کیسے یقین کر لیتی وہ شاکرہ بھابی کی اس بات پر کہ خاندان والوں کو اُس کی بدقسمتی کا ملال تھا۔
وہ تو خوش ہوتے ہوں گے اُس کا تابوت سجا کر!
لیکن
شاکرہ بھابی کی یہ بات سچ بھی تو ہو سکتی تھی۔
وہ خود بھی تو اُسے زہراب پیش کرنے اور صلیب پر چڑھانے کا اُس کے بدن میں میخیں ٹھونک دینے والوں میں شامل رہی تھیں۔
اس وقت اگر وہ اس کے مقدر پر رنج و ملال کا اظہار کر رہی تھیں تو دوسرے بھی ایسا کر سکتے تھے۔
تو
اس وقت ان سب نے اس کے گرد اپنا حصار اتنا تنگ کیوں کر دیا تھا کہ اُس کا دم گھٹنے لگا تھا کوئی راہِ فرار نہ رہی تھی۔
اور اُس نے گردن ڈال دی تھی۔
"تو پھر اس وقت سب میری جان کو کیوں آ گئے تھے؟ آپ نے بھی تو اصرار کیا تھا!" الفت گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔
"سچی جب تمہارے اپنے گھر والے بخوشی راضی تھے تو دوسروں کو مخالفت کرنے کا بھلا کیا اختیار تھا؟ کسی کا حق ہی کیا تھا؟ یہ بات تو تمہارے گھر والوں کے سوچنے کی تھی...... وہ...... وہ سب تو خوشی سے بیٹھے۔ اسے کہتے ہیں دیکھتے بھالتے مکھی نگل جانا۔"
شاکرہ بھابی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔
جب سگے اپنے ہی ہوں تو پھر دوسروں سے گلہ شکوہ کیسا؟
چپکے سے اُس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔
شاکرہ بھابی نے چاروں اطراف نظر دوڑائی پھر رشک آمیز لہجے میں بولیں۔ "صبح اٹھتے ہی میں نے اوپر نیچے سارے گھر کا چکر لگایا۔ ماشاء اللہ گھر بہت بڑا اور بہت اچھا ہے۔ راج کرو گی۔"
راج!
[illegible]! جو بھی تھی!
ابھی ذرا دیر پہلے تو شاکرہ بھابی اُس کی بدقسمتی کا نوحہ پڑھ رہی تھیں۔
اور اب کہہ رہی تھیں راج کرو گی!
اُن کی کس بات کا یقین کرتی وہ؟
"مگر دیکھو بھئی!" شاکرہ بھابی دوبارہ سے پرتشویش لہجے میں اُس کے نزدیک سرک آئیں اور بہت رازداری سے بولیں۔
"بچوں کو ہرگز سر پر چڑھانا ورنہ سر پکڑ کر روؤ گی۔ اول دن سے ہی سختی رکھنا۔ شہر کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے سوتیلی اولاد کو اور ہم کہاں ہیں فرشتہ بھی خود سوچنا کہ کبھی تمہارے اپنے بچے بنیں گے؟ اللہ بخشے ہماری بڑی خالہ کو دل نکال کر رکھ دیا انھوں نے اپنا سوتیلے بچوں کے سامنے مگر کہلائیں سوتیلی ماں ہی۔ خالو جی کے مرنے کے بعد بڑی خالہ نے ساری جائداد سوتیلے بچوں کے نام کر دی تھی...... اپنے بچے کب ہیں... کیونکہ اُن کے اپنے تو دو بچے ہوئے اور دونوں بچپن ہی میں مر گئے تھے مگر سوتیلی اولاد کی بھی محبت

کر جو بھی خالہ کا احسان ماننے کے بجائے کہہ دیا جاتا ہے باپ جیسا کہ تو حق جاتا تھا۔ کون سا ہماری سوتیلی ماں اپنے گھر سے لائی تھیں ..... اور ہمیشہ برا مت ماننا تم، تمہارے دولہا کے بچے تو مجھے بڑے ہی چھچھورے اور بد ذات لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں گھر کا نچلا حصہ دیکھ چکی اور اوپر والی منزل دیکھنے کے لیے اوپر پہنچی تو چاروں بدذات سر جوڑے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا تو بڑے والوں نے مجھے اس بری طرح گھورا کہ میں تو الٹے قدموں پلٹ آئی۔ اکٹھا تو تم انھیں بیٹھنے ہی مت دینا۔ جب بیٹھیں گے سازبازیں ہی کریں گے تمہارے خلاف۔"

شاکرہ بھابی کی باتوں نے اُس کو گھبراہٹ اور وحشت سے دوچار کر دیا۔

"وہ..... شاکرہ بھابی ... میرے لیے کپڑے نکال دیں گی آپ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں ..... اے لو دیکھو میں بھی کتنی پاگل ہوں، آتے ہی دوسری باتوں میں لگ گئی یہ تو پوچھا ہی نہیں تم سے کہ دولہا نے تمہارے رونمائی میں کیا دیا؟"

اُلفت نے سائیڈ ٹیبل پر ڈھیر زیورات میں سے ہیرے کی ایک خوبصورت انگوٹھی اُٹھا کر چپ چاپ شاکرہ بھابی کے سامنے کر دی۔

شاکرہ بھابی نے انگوٹھی لے کر اُسے خوب اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا پھر پورے اطمینان کے بعد بولیں "ماشاءاللہ.. اچھی ہے۔ اللہ بہتر نصیب کرے۔"

انگوٹھی میں جڑے ہیرے کی جگمگاہٹ بلاشبہ خوبصورت تھی، رشک شاکرہ بھابی کی آنکھوں میں تیرتی دیکھی جا سکتی تھی۔

انگوٹھی اُسے لوٹانے کے بعد شاکرہ بھابی نے اُس سے جہیز کے ملبوسات والے سوٹ کیس کی چابیوں والی کی رنگ لی اور ذرا سی دیر میں اُس کے لیے وہ جوڑا نکال لائیں جس کی بابت عفت آپا نے انھیں کل صبح جوڑے اس سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ اگلے دن کو پہننا ہوگا۔

پھر انھوں نے الفت کو سہارا دے کر مسہری سے اُترنے میں اُس کی مدد کی اور اُسے ملحقہ باتھ روم تک پہنچانے کے بعد وہیں کمرے میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد جلیس الحسن چند ثانیے کو کمرے میں آئے اور یہ دیکھ کر کہ الفت باتھ روم میں تھی اور شاکرہ بھابی اُس کی منتظر، پلٹ گئے۔

غسل خانے سے نکلنے کے بعد الفت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی اور شاکرہ بھابی اُس کے عقب میں کھڑی ہو کر اُس کے بال سلجھانے لگیں۔

اُلفت نے ڈریسنگ ٹیبل پر دھرے لوازمات آرائش حسن کو حیرت سی نگاہوں سے دیکھا پھر اُس کی نظریں سنگھار میز کے تینوں آئینوں پر جا ٹکیں۔ یکے بعد دیگرے تینوں آئینوں میں اُس نے اپنا عکس دیکھا اور اپنے اس خیال پر لرز کر رہ گئی کہ ان آئینوں میں اس سے پہلے بھی ایک عورت برسوں اپنا عکس دیکھتی رہی ہوگی۔

وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم ہوئی کہ اُسے پتا بھی نہ چلا کب بھابی اُس کے بال چھوڑ کر اُس کے عقب سے ہٹیں اور اُس کی بری کا وینٹی بکس اُٹھا لائیں۔

ڈریسنگ ٹیبل پر وینٹی بکس اُس کے سامنے دھرتے ہوئے شاکرہ بھابی ڈریسنگ ٹیبل پر کاسمیٹک لوازمات دیکھ کر چونک گئیں۔

"اے بنّے! لگتا ہے یہ سب کچھ تمہارے دولہا کی پہلی بیوی کا ہے۔ پہلی فرصت میں انھیں اٹھا کر پھینکو ورنہ۔ ایک چیز بھی نہ رہنے دینا اس بدبخت کی اس گھر میں..... "شاکرہ بھابی جھکیں اور سرگوشی میں بولیں "مرد بڑے چالباز ہوتے ہیں۔ ہزار بہانوں سے جانے والی عورت کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں..... ارے بھئی وہ تو ہی اُس کی یاد میں ہی رہی..... کوئی چیز نہ رہنے دینا اس گھر میں۔"

الفت کے دل پر ایک عجیب سا ملال طاری ہو رہا تھا۔

اب کیونکر بتاتی وہ شاکرہ بھابی کو کہ اُسے تو اپنے روبرو ایستادہ تینوں آئینوں میں نظر آنے والا اپنا عکس بھی اُس عورت کا محسوس ہو رہا تھا جو اس گھر سے جا چکی تھی!

اور یہ کتنی حیرت کی بات تھی۔

ڈائننگ لاؤنج میں جلیس الحسن بچوں کو جو ناشتے کی میز پر آ چکے تھے سمجھا رہے تھے کہ جب ان کی نئی ماما ناشتے کی میز پر آئیں تو انھیں اسی طرح صبح بخیر کہا جائے جیسے وہ اپنی مام کو کہا کرتے تھے۔

لیکن

جب وہ شاکرہ بھابی کی معیت میں الفت کو ناشتے کی میز تک لائے تو سوائے نگین کے اور کسی نے بھی گڈ مارننگ نہیں کہا۔ اور نگین نے بھی سر جھکائے جھکائے سپاٹ لہجے میں کچھ اس طرح کہا جیسے دیواروں سے کہا جاتا ہے۔

اعجاز سر جھکائے بیٹھا رہا۔

فرزانہ اور زرین ٹکر ٹکر دیکھا کیے۔

جلیس الحسن نے الفت کو کھانے کی میز کے گرد وہ مخصوص کرسی پیش کی جس پر کبھی عاصمہ بیگم بیٹھا کرتی تھیں۔

اعجاز اور نگین نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے باپ کے اس اقدام پر دلی ناگواری کا اظہار کیا۔ فرزانہ اور زرین بدستور خاموشی کی تصویر بنے رہے۔

شاکرہ بھابی نے خاصی گہری نگاہوں سے بچوں کی اس دبی دبی ناگواری کا نوٹس لیا اور الفت کے عین مقابل میز کے دوسری طرف پڑی کرسی پر پوزیشن سنبھال لی۔

ناشتہ کیا ہی جا رہا تھا کہ بھیا اور بھابی جان اُس کے لیے حسب دستور میکے کی جانب سے بھجوایا گیا پر تکلف ناشتہ لیے آ پہنچے۔ انھی نے یہ رسم بھی نبھائی تھی۔

بھابی جان نے اُسے گلے سے لگایا تو وہ ان کے شانے پر سر ٹکا کر بے اختیار رونے لگی۔ بھیا آگے بڑھ کر اس کا سر تھپتھپانے لگے۔

شاکرہ بھابی نے اپنی دانست میں بھابی جان سے نگاہوں ہی نگاہوں میں یہ کہنے کی کوشش کی، الفت کی آنکھوں سے بہنے والے ان آنسوؤں کا بنیادی سبب جلیس الحسن کے چار بچے تھے!

جلیس الحسن کا خیال تھا الفت سے بچوں کی بے تعلقی کی راہ تھوڑی سے ناشتے کی میز پر ہموار ہوگی اور کچھ ناشتے کے بعد۔ مگر ناشتے کی میز پر شاکرہ بھابی کی موجودگی اور پھر بھیا اور بھابی جان کی آمد اس ضمن میں حارج رہی۔

جلیس الحسن بھیا اور بھابی کی آمد سے جس قدر خوش ہوئے اسی قدر یہ جان کر ناخوش ہوئے کہ وہ حسب دستور الفت کو سسرال سے میکے لے جانے کے لیے آئے تھے۔ ان کا پروگرام تو یہ تھا کہ ناشتے کے بعد وہ الفت اور بچوں کو لے کر بیٹھیں گے اور ان کے مابین اجنبیت اور سرد مہری کی دیوار کو ڈھانے کی کوشش کریں گے۔

وہ جلد از جلد بچوں کو الفت کے نزدیک کر دینا چاہتے تھے مگر افسوس کہ ایک دیرینہ رسم پہلے ہی ان کا تقاضا کر رہی تھی۔

جلیس الحسن کی خوشنودی کی خاطر بھیا اور بھابی نے ناشتے کی میز پر موجود ان کے چاروں بچوں سے بھی بظاہر خاصی گرمجوشی سے میل جول کی۔ مگر ان کے لہجے اور انداز سے عیاں تھا کہ وہ ایسا کر رہے تھے ورنہ ان بچوں سے انھیں قطعاً کوئی دلچسپی یا رغبت نہ تھی۔

دلچسپی یا رغبت تو ان بچوں کو بھی قطعاً نہ تھی بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ ان سب کو بالخصوص نگین اور اعجاز کو اپنے گھر میں ان لوگوں کی موجودگی انتہائی ناگوار گزر رہی تھی اور اس کا واضح اظہار انھوں نے ان کی ظاہری مگر پرجوش میل جول کے جواب میں بے رخی اور دلی ناگواری کے ذریعے کر بھی دیا جس سے جلیس الحسن نے بجائے خود خفت محسوس کی۔

ناشتے کے بعد بچے خاموشی سے اٹھے اور اوپر چلے گئے۔ بھابی جان اور شاکرہ بھابی الفت کو میکے لے جانے کے لیے تیار کرنے کو اُس کے کمرے میں لے گئیں اور جلیس الحسن بھیا سے باتیں کرنے بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد بھابی جان اور شاکرہ بھابی لاؤنج میں پلٹ آئیں اور بھابی جان نے جلیس الحسن سے کہا "جلیس بھائی! الفت تیار ہیں اگر آپ اجازت دیں تو......؟"

"جی ضرور!" جلیس الحسن اٹھ کھڑے ہوئے "بس دو منٹ کی اجازت چاہوں گا آپ سے" انھوں نے بھیا کی جانب اجازت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بھابی جان اور شاکرہ بھابی وہیں رکیں اور جلیس الحسن نے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

الفت نئے سرے سے دلہن کے روپ میں سجی بیٹھی تھی۔ جلیس الحسن کمرے میں داخل ہوئے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے دیکھ کر اُس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

اُس کا خیال تھا وہ اُس کے قریب آ کر اُس کے شانوں پر ہاتھ دھر دیں گے پھر اُس کی ٹھوڑی تھام کر اُس کا چہرہ اونچا کر کے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی محبت سے کوئی رومان پرور اور طرب انگیز مکالمہ بولیں گے۔

برآمدے کی سمت پیش قدمی کی۔

بیگم ہمدانی نے بھیا، بھابی اور شاکرہ بھابی سے علیک سلیک کے بعد الفت کی جانب توجہ کی۔ اس کی ٹھوڑی تھام کر دوستانہ پرپیار سے اُسے دیکھا پھر روئے سخن جلیس الحسن کی جانب کرتے ہوئے بولیں۔ "دیکھا جلیس بھائی کیسی دھنک اُتری ہوئی ہے آپ کے گھر میں۔ ہم نہ کہتے تھے آپ سے کہ آپ شادی کر کے تو دیکھیں، روٹھی ہوئی بہاریں بھر سے پلٹ آئیں گی؟"

روٹھی ہوئی بہاریں!

بیگم ہمدانی کا بے حد اپنائیت سے کہا ہوا یہ فقرہ بھی الفت کو اپنے دل میں ترازو ہوتا محسوس ہوا۔

گویا کبھی بہار جلیس الحسن کی زندگی کا ایک معتبر حوالہ تھا!

ورنہ بیگم ہمدانی، روٹھی بہاروں کی بات کیوں کرتیں

کتنے بہت سے لمحے

کتنی بہت سی باتیں

اُس کے دل میں ترازو ہوتے جا رہے تھے۔

ابھی تو فقط ابتدا تھی۔

نہ جانے میزان دل میں کتنا بوجھ اور سوار ہونے جا رہا تھا۔

وہ پہلا قدم اٹھاتے ہی اس خیال سے ہراساں ہو چلی تھی کہ کیا وہ اس سارے بوجھ کو جو میزان دل میں چڑھ جانے کا منتظر تھا، سہار سکے گی؟

"اچھا آپ لوگ میکے لے جا رہے ہیں انھیں؟" بیگم ہمدانی نے مسکراتے ہوئے بھابی جان سے پوچھا۔

"جی ہاں، ہمارے ہاں دستور ہے......"

اس سے پہلے کہ بھابی جان پوری بات کہتیں، بیگم ہمدانی نے کہا "جی...... جی ہاں...... ہمارے ہاں بھی یہی دستور ہے بلکہ میرا خیال ہے ہمارے بیشتر گھرانوں میں یہی دستور ہے کہ شادی کی اگلی صبح دلہن میکے جایا کرتی ہے۔"

"بیگم صاحبہ! اگر یہ دستور آپ کے علم میں تھا تو اس وقت بے موقع یہاں حارج ہونے کی کیا ضرورت تھی؟" بختیار صاحب بولے۔

"بھئی ہم تو کھڑے کھڑے ملنے کو آئے تھے۔ یہ کہیے کہ بروقت پہنچ گئے ورنہ اگر یہ جا چکی ہوتیں تو شاید افسوس ہوتا کہ بے موقع پہنچے" بیگم ہمدانی نے کہا۔

"دیکھا سا جواب تھا؟" بختیار ہمدانی نے مسکراتے ہوئے پہلے بھیا کو دیکھا پھر جلیس الحسن کو اور بولے۔ "یہ ہے خواتین کا کمال کہ جھوٹ کو سچ، غلط کو صحیح اور بے موقع کو برموقع ثابت کر دیتی ہیں!"

"اچھا" بیگم ہمدانی نے انھیں گھورا۔

بختیار ہمدانی کان کھجاتے ہوئے زیر لب مسکرانے لگے۔

"اچھا بھابی! آپ کو زیادہ دیر نہیں کھڑا رکھیں گے ہم" بیگم ہمدانی نے الفت کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

بھابی!

کسی نے پہلی بار اُسے اس رشتے سے پکارا تھا اور اُسے بہت اچھا لگا تھا۔

یہ رشتے ناتے بھی عجیب کڑیاں ہیں!

یہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر زنجیر حیات کو زیادہ قوی اور مستحکم بناتے چلے جاتے ہیں۔

اور

ان رشتے ناتوں کو معنی دینے والے الفاظ کا بھی عجیب کمال ہے!

بے جان مگر پُرمعنی

نزاکتوں، لطافتوں اور حلاوتوں سے عبارت۔

جذبوں کی عجیب پُراسرار دنیائیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے!

"کچھ دیر کو بیٹھ جاتے ہیں؟" بھیا نے اخلاقاً کہا۔

"نہیں...... نہیں آپ لوگ بسم اللہ کیجیے۔ ہم تو گھر کے لوگ ہیں، پھر آجائیں گے بلکہ آتے ہی رہیں گے" بیگم ہمدانی بولیں۔

"اب ہم بھی گھر ہی کے لوگ ہیں، آتے رہیں گے اور انشاء اللہ آپ سے ملنا ہوتا رہے گا" بھابی جان نے برجستہ کہا۔

سب ہنس دیے۔

الفت کے دل پر چھائے رنج و ملال کے بادل تیرتے ہوئے خدا جانے کس سمت نکل گئے تھے۔

اُسے یہ مقبتی مسکرانٹ بے ابر دنیا سے دل بڑی دلکش لگ رہی تھی۔

جب وہ بھیا کی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تو اس نے جلیس الحسن کو بھیا سے کہتے سنا "بارہ بجے پہنچ رہا ہوں میں!"

"ابھی تو وہ...؟" بھیا بولے "یعنی کسی بھی وقت جلیس صاحب، اب تو آپ ہی کا گھر ہے"

وہ کار میں بیٹھ چکی تھی۔

بھابی جان اس کے دائیں جانب بیٹھی تھیں اور شاکرہ بھابی بائیں جانب۔ بھیا ڈرائیونگ سیٹ پر تھے۔ جلیس الحسن گاڑی کے قریب ہی انھیں رخصت کرنے کو موجود تھے۔ بختیار ہمدانی اور بیگم ہمدانی ان سے دو قدم پرے بر آمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔

بھیا نے ریورس میں گاڑی لے کر دائیں جانب کو موڑی تو الفت کی جھکی ہوئی نگاہیں بے اختیار اٹھ گئیں۔

جلیس الحسن، بختیار صاحب اور ان کی بیگم مسکراتے ہوئے اور ہاتھ ہلا کر انھیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

"میری اشاعت مہر تو ان کی وجاہت دیکھ کر رشک سے مر گئی ہوں گی۔ آج تو فون پر فون کھڑکا رہی ہوں گی!" الفت نے نادان ہوتے ہوئے سوچا۔

رفتہ رفتہ

اُس کی نظر اور دائرہ پھیلا اور وہ دم بخود رہ گئی!

کوٹھی کی بالائی منزل پر شیشوں کی آہنی ریلنگ کے نزدیک جلیس الحسن کے چاروں بچے کھڑے اُدھر ہی دیکھ رہے تھے۔

اُس نے آنکھیں موند لیں۔

یوں جیسے انھیں دیکھنا نہ چاہتی ہو۔

پھر جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو شاکرہ بھابی کو ریئر اسکرین کے اُس پار دیکھتے پایا اور اُن کی گردن گاڑی کے "حسن لاج" کے صدر دروازے سے باہر نکل جانے کے بعد اپنی اصل مقام پر واپس پلٹی۔ انھوں نے ترحم آمیز نگاہوں سے الفت کو دیکھا اور اُس نے گھبرا کر نگاہیں چرا لیں۔

"توبہ توبہ" شاکرہ بھابی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے پھر اپنے گالوں کو باری باری پیٹ ڈالا۔

بھابی جان نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔

بھیا کی نظریں اپنے سامنے والے آئینے پر جا ٹکیں۔

"اللہ توبہ...... بھئی یہ تم لوگوں نے بے چاری الفت کو کس جنجال میں پھنسا دیا؟"

"کیا مطلب؟ کیسا جنجال؟" بھابی جان نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"بھئی پورے چار بچے کوئی کم بڑا جنجال تو نہیں ہوتے؟" شاکرہ بھابی بولیں "رات ایک سانپ روئی دولہا صاحب نے چاروں کو لا کر الفت کے سینے پر مونگ دلنے کو بٹھا دیا۔ صبح اٹھتے پر کل جو دیکھا وہ ابھی اس وقت آپ نے تو غور توجہ نہیں کی میں نے دیکھا اور الفت نے بھی کہ چاروں شیطان اوپر کھڑے تاک رہے تھے...... مجھے تو شکلوں ہی سے نہایت بدذات بچے لگتے ہیں اور بگڑے ہوئے بھی...... انھوں نے حفظ ما تقدم کو خاموشی اختیار کی پھر بولیں "ارے بھئی تم لوگوں نے خود بھی دیکھا ہوگا کہ ناشتے کی میز پر کیسے گھٹے سے بیٹھے تھے جیسے زبانیں کٹ گئی ہوں، بیاہ کر جاتے ہوں یہ کل ہم سے باپ کا بچہ لینے...... تم نے تو شاید کیا ہوگا کہ جب تم لوگوں نے ان سے حال چال پوچھا تو کیسے تنے بیٹھے جواب دیا، اپنی زبان سے کمال...... ٹھیک ہیں خدا الفت کو ہمت دے اور حوصلہ دے کہ یہ اس رشتے کو برداشت کر سکیں۔"

"شاکرہ بھابی! ابھی پہلا دن ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بچے ہیں رفتہ رفتہ مانوس ہوں گے الفت سے بھی اور ہم لوگوں سے بھی" بھابی جان نے بڑے تدبر سے کہا۔

"ارے چھوڑو...... ہاں اب اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں بچے۔ بڑی بیٹی خدا جھوٹ نہ بلوائے پندرہ سولہ سے تو کیا کم ہوگی۔ بڑا بیٹا بھی اچھا بڑا ہے۔ سب ہی کچھ دار ہیں وہ جو چھوٹا ہے تو ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ سچ پوچھو تو بچے اگر چھوٹے ہوتے تو پھر کیا کوئی بات نہ تھی، پیار سے، مار سے قابو میں آ ہی جاتے مگر یہ جو بڑے ہوتے ہیں، یہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ تو نہ پیار کی سنتے ہیں نہ مار کی۔ کیسے کھڑے تھے ابھی نہیں دھرنے دیتے اور کچھ اپنی مرتی ہوئی تو کبھی بھی وہ دھارس بندھ جاتی۔ وہ تو زندہ بیٹا اس کا خیال تو بچوں کے دل سے جا ہی نہیں سکتا۔"

بھابی جان نے اُداس نظروں سے الفت کی طرف دیکھا پھر دھیمے لہجے میں قدرے بگڑ کر ان سے بولیں "یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں شاکرہ بھابی؟"

سنہری گلاب جامنیں اور فضیلت نے گرم مسالے والا پان انھیں پیش کر کے اُن کے گُن بنانے اور دوسروں کے ہنسنے کا سامان کیا۔

عظمت آپا اپنے بڑے پن کا لحاظ رکھے رہیں۔

جملہ اہلِ خانہ کے پُرزور اصرار کے باوجود جلیس الحسن بہت کم وقت وہاں ٹھہرے۔ امّی ابا اور دیگر اہلِ خانہ نے بہت چاہا کر ظہرانہ تناول کر کے جائیں مگر انھوں نے معذرت چاہی۔

اور جب وہ اُٹھ کر رخصت ہوتے تو اُلفت اُن کے ہمراہ جانے کو چپ چاپ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ہنستی خوا واقعی کھوئے گئی لگ رہی ہیں!

جلیس الحسن کی شکستہ مدّتی کا انتہائی سبک رفتاری سے رواں دواں تھی اور اُلفت اگلی نشست پر اُن کے پہلو میں خاموشی کی صورت بنی چُپ چاپ بیٹھی تھی۔

اُس کی مسلسل اور مستقل خاموشی پر بالآخر جلیس الحسن کو کہنا پڑا: "خواتین اور بالخصوص ٹیچرز تو اتنی خاموش نہیں دیکھی جاتیں۔"

"جی!" وہ چونکی اور بے ساختہ استفہامیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"حضور!" انھوں نے ہلکی سی گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا تو اس نے محجوب ہو کر نظریں نیچی کر لیں۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیے اور بولے: "میں نے عرض کیا کچھ بولیے۔"

"کیا؟"

"حیرت ہے ایک خاتون کو یہ بتانا پڑے گا کہ وہ کیا بولیں! ابھی آپ لوگوں کے پاس تو موضوعات کا ذخیرہ ہوا کرتا ہے اور ہر موضوع پر بے تکان بول سکتی ہیں؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔

"آپ کی ہمشیرگان تو خاصی باتونی نظر آتی ہیں۔"

اُس نے بدستور خاموشی پر اکتفا کیے رکھا۔

"شام کو تمہارے ہاں سے کسی کے ہماری طرف آنے کا پروگرام ہے؟"

"جی پتا نہیں۔"

"کل تقریبِ ولیمہ میں تو ہم میزبان ہوں گے!"

"جی!"

"پتا ہے ناتمہیں کہاں ہو رہی ہے یہ تقریب؟"

"جی!"

"کہاں بھلا؟"

جلیس الحسن کسی نہ کسی بہانے اُسے بولنے پر مجبور کر دینا چاہ رہے تھے۔

"انٹر کانٹی نینٹل میں؟"

"شکر ہے تم جی سے آگے تو بڑھیں!" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ڈیش بورڈ پر لگی ننھی سی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولے۔

"اوہ! گھڑی کی سوئیاں بھی کتنی تیزی سے حرکت کرتی ہیں! تقریباً بارہ بجے تمہارے ہاں پہنچا تھا اور تھوڑی سی دیر بیٹھا ہوں مگر گھڑی کی سوئیاں ڈیڑھ سے آگے نکل گئیں۔"

"ذرا..... سی..... دیر اور رُک جاتے آپ..... وہاں!" اُلفت نے کہا۔ اُسے امّی ابا اور بھیا کے علاوہ دیگر اہلِ خانہ کے پُرزور اصرار کے باوجود جلیس الحسن کے دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ دیر اور نہ رُکنے کا قلق ہوا تھا۔ کتنی جلدی جلدی بھیجی اور بھاوج نے باہم مل کر اُن کے لیے پُرتکلف لوازمات تیار کیے تھے۔ بریانی، قیمہ، شامی کباب، رائتہ، شاہی ٹکڑے، شیرمال اور وڈی جیسا بزنس روڈ سے بیٹے دوڑے تھے اور بزنس روڈ بھلا نزدیک رکھا تھا! اور اس خیال سے کہ گھر آئے دُولہا میاں تو دل بھلا دیجیے، سبھی کے لیے یہ پُرتکلف کھانا تیار کیا گیا تھا کہ سب دسترخوان پر ایک ساتھ مل بیٹھیں گے۔ مگر جلیس الحسن کے کھانے سے انکار بلکہ صاف انکار پر بہنوں اور بھائی جان سے کے منہ اُتر گئے تھے اُن کی انتہائی پھرتی کے باوجود ساری محنت رائیگاں گئی تھی۔ بھلے سے دو نوالے ہی کھا لیتے وہ مگر انکار تو نہ کرتے اور اُن کے انکار کر دینے کے بعد وہ بھلا کیسے رُک جاتی کھانے کے لیے۔ انھیں تو بس واپسی کی جلدی پڑی ہوئی تھی!

"جا رہا ہوں" ابا کو اہلِ خانہ سے کہنا پڑا: "طبیعت اصرار مت کرو۔ ہو سکتا ہے جلیس میاں کسی خاص سبب سے جلدی میں ہوں۔ آنا جانا تو اُن کے ہاں لگا ہی ہوگا۔ جانے دو انھیں..... کھانے کے لیے رُکنے پر اصرار مت کرو..... اب تو ماشاء اللہ آتے جاتے ہی رہیں گے۔"

"ابا! اتنی جلدی جلدی اتنی محنت سے اور اتنا ڈھیر سارا پکایا ہے!" عظمت آپا نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا!" ابا نے آہستہ سے کہا۔

چلتے سمے تہنیت نے اُس کے کان میں کہا: "اپنا وہ اعلیٰ بھائی سے کہہ دیجیے گا کہ انھوں نے کھانے پر نہ رُک کر ہمارا دل توڑا ہے۔"

"ہاں اور کیا، ہمیں دوسروں کو موجیں تھوڑی سی اُڑانی تھیں۔ جلیس بھائی کی خاطر تو ہم نے جلدی جلدی تازہ کھانا پکایا اور بھیا کو بزنس روڈ دوڑایا اور شکل دیکھ کے کا بہت کھانا بچا رکھا تھا رنج میں!" فضیلت نے سرگوشی میں کہا۔

شادی کے بعد پہلا دن تھا۔

حجاب مانع رہا۔

وہ جلیس الحسن سے رُکنے کو نہ کہہ سکی۔

اور جب وہ جانے کو اُٹھے تو امّی، ابا اور گھر میں موجود دیگر بزرگانِ خاندان کی دُعائیں دامن میں سمیٹتی وہ چُپ چاپ اُن کے ساتھ ہو لی۔

مگر اُس کا دل وہیں پڑا رہ گیا تھا۔

کیا تھا اگر سب کا دل رکھنے کو دو نوالے لے لیے جاتے!

موقع پاتے ہی شکوہ دبی دبی صورت میں اُس کی زبان پر آ گیا تھا۔

"ذرا..... سی..... دیر اور رُک جاتے آپ..... وہاں!"

"کھانے پر؟" جلیس الحسن کے لہجے میں استفہامیہ کیفیت تھی۔

"جی!"

"مجھے ہفتے میں ایک ہی تو دن ملتا ہے بچوں کے ساتھ کھانا کھانے کا، ورنہ تو ہفتے کے باقی دنوں میں دوپہر کے وقت تو میں گھر سے باہر دفتر میں ہوا کرتا ہوں۔ اب اگر یہ ایک دن بھی میں کہیں اور گزار دوں یا کسی اور کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا لوں تو یہ بچوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہوگی..... بچے ہمارے منتظر ہوں گے؟"

اُلفت نے اپنے جبڑوں کو پوری سختی سے باہم بھینچ لیا۔

اُس کا رواں رواں سلگنے لگا۔

اپنے بچوں کی خاطر وہ اُس کے گھر والوں کو مایوس کر کے آئے تھے۔

اُن کے جذبات کا ذرا پاس نہ کیا تھا انھوں نے۔

اُس کا جی چاہا جلیس الحسن کے اس رویے پر اُن سے شکوہ کرے، احتجاج کرے، اپنی خفگی اور ناراضگی کا واضح طور پر اظہار کرے۔

مگر

پھر اس خیال نے اُسے زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا کہ یہ ساری صورتِ حال تو وہ شادی سے بہت پہلے اس پر واضح کر چکے تھے۔

اُس سے اس امر کی یقین دہانی لے چکے تھے کہ وہ اُن کے جملہ حالات سے باخبر تھی اور اُن کے چار بچوں کی ہر قدم، ہر دُکھ سُکھ میں اُن کی شریک بننے پر آمادہ تھی۔

اس امر کی تصدیق کر لی تھی انھوں نے کہ اس شادی پر اس کی آمادگی کسی جبر یا دباؤ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر آمادگی ظاہر کی تھی۔

اُن سے اس کی شادی کسی حادثے یا اتفاق کا نتیجہ نہ تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اُس کے متعلقین نے یہ فیصلہ کیا تھا اور اُس کی آمادگی کے بعد ہی جلیس الحسن کو زبان دی تھی۔

تو پھر

ساری صورتِ حال جانتے بوجھتے آمادگی اور قبولیت کے بعد اب اس صورتِ حال کا شکوہ کیسا!

ما داستان محفوظ تھی۔

باجراں کے جاتے ہی وہ بے تحاشا دھڑکتے دل کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتی دبے پاؤں تکین کے کمرے میں پہنچی اور البم کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سناٹے میں کچھ سرسراہٹ سی سنائی دی اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اعجاز اور دونوں بچوں کے اسکول سے واپس آنے میں ابھی بہت وقت پڑا تھا اور تکین کہیں باہر گئی ہوئی تھی، بُری طرح گھبرا کر بیڈ سے باہر نکل آئی اور بغیر کچھ لیے ڈگ بھرتی نیچے اتر آئی۔

خدا جانے وہ ہوا کی سرسراہٹ تھی یا کھڑکی کے نزدیک سے کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر گزر گیا تھا۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی تھا الفت جب نیچے اتری تو اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ سراپا ہلکی سی لرزش طاری تھی اور دل ایک نامعلوم سے احساسِ جرم سے دوچار ہوتا جا رہا تھا۔

اپنے ہی گھر میں وہ خود کو چور محسوس کر رہی تھی۔

بہرحال

شوقِ تجسس اس البم کے ایک ایک ورق کو دیکھنے کی قسم کھا چکا تھا۔

پھر ایک روز جب باجراں نے اعجاز کے بستر کی چادر بدلنے کے لیے پلنگ پر بچھی گدی جو سرکائی تو اس سے لپٹا ایک فریم اوندھا رکھا دیکھا۔ الفت نے اسے اٹھا کر دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔

وہ یقیناً جلیس محسن کی سابقہ بیوی کی تصویر تھی۔

"تاہم الفت نے جانتے بوجھتے بھی انجان بنتے ہوئے باجراں سے پوچھا" باجراں ذرا دیکھو تو یہ کس کی تصویر ہے؟"

باجراں مسکرا دی۔

"بیگم صاحب جی آپ نہیں جانتیں جی انھیں؟"

"نہیں۔"

"کون ہو سکتی ہیں جی یہ سوائے صاحب جی کی پہلی بیگم صاحب کے؟"

"چڑیل!" الفت نے جی ہی جی میں کہا اور شدید نفرت کے ساتھ تصویر کو دیکھا۔

تصویر بزبانِ حال جلیس محسن کی پہلی بیوی کے خوبرو ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔

اُس کا چہرہ، چمپئی رنگت، آنکھیں غزال، ناک ستواں اور دہانہ تنگ تھا۔

"یہ تصویر یہاں کیوں رکھی ہے؟" الفت نے فریم شدہ تصویر پلٹ کر دوبارہ وہیں رکھ دی جہاں سے اُٹھائی تھی۔

"بیگم صاحب جی یہ تصویر تو ہمیں جب کبھی اعجاز صاحب کے بستر کی چادر بدلنی ہوتی ہو ادھر ہی پڑی ہوتی ہے جی۔"

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ جی اعجاز صاحب ادھر ہی رکھتے ہوتے ہیں۔"

"وہ تو میں پوچھ رہی ہوں کہ کیوں؟"

"کیونکہ جی اعجاز صاحب بہوتی پیار کرتے ہیں اپنی ممی جی کے ساتھ۔"

الفت نے تشنگی کی کیفیت کے ساتھ اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

قرینہ بتاتا ہے کہ باجراں بہت کچھ جانتی تھی۔

اس گھر کے ماضی سے آشنا تھی۔

جلیس محسن کے ماضی سے آشنا تھی۔

اُن کے بچوں کے کمروں میں سربستہ رازوں کی امین تھی۔

جلیس محسن کی سابقہ بیوی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔

وہ الفت کو بہت کچھ بتا سکتی تھی۔

اس گھر کی نئی پرانی کہانیاں سننے کے لیے باجراں کو اعتماد میں لینا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

* * * * * * * * *

دوسری شادی جلیس محسن نے اس خیال کے تحت کی تھی کہ گھر کی شیرازہ بندی ہو سکے بچوں کو ماں کا پیار و توجہ میسر آ سکے۔ اور خود انھیں ایک ایسی ہمسفر، رفیقِ سفر و دکھ سکھ کی ساتھی مل جائے جو ان کے مسائل کو سمجھے اور ان کے حل میں تعاون کی کوشش کرے۔

وہ گھر کی رونقیں، ہوائی خوشبوؤں کو دوبارہ ہم کلام دیکھنے کے متمنی تھے۔ اور یہی تمنا اُن کی دوسری شادی کا محرک بنی تھی۔

لیکن

اُن کی دوسری شادی کے بعد سامنے آنے والی صورتحال اُن کی توقعات پوری کرنے میں قطعاً ناکام رہی تھی۔

تین ماہ سے زائد عرصہ ہونے کو آیا تھا۔

نہ بکھرے ہوئے گھر کی شیرازہ بندی کے آثار نظر آتے تھے۔

نہ بچوں کو ماں کی توجہ اور پیار ملنے کی امید بندھ سکی تھی۔

نہ ہی اُن کی رفیقِ سفر نے اُن کے مسائل کو سمجھا اور اُن کے حل کے ضمن میں اُن کی مددگار و معاون ہونے کی کوشش کی تھی۔

بلکہ حقیقت یہ تھی کہ

گھر کا شیرازہ دوبارہ منتشر ہوتا نظر آ رہا تھا۔

بچوں کو ماں کا پیار ملنا تو دور کی بات وہ تو باپ کی محبت اور توجہ سے بھی محروم ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

کیونکہ دوسری شادی سے قبل تو جلیس محسن کا گھر میں بسر ہونے والا تمام وقت بچوں کے لیے وقف ہوتا تھا بلکہ بچوں ہی کی خاطر وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے وقت کشید کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ماں کے بچھڑ جانے کے بعد انھوں نے شام کو جلد گھر لوٹ آنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ بچوں کو زیادہ وقت دینے کی کوشش کرتے اور اُن کے جذباتی مسائل کی تسکین کی حتی الامکان کوشش کرتے۔

مگر دوسری شادی کے بعد وہ اپنے آپ کو بٹا ہوا سا محسوس کرنے لگے تھے۔ کبھی بچوں کو زیادہ وقت دینے کی کوشش کرتے تو الفت کو اپنے سے دور کھڑا پانے لگتے اور الفت کو خوش اور مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تو بچے انھیں دور سے گھورتے کھڑے نظر آتے۔

عجیب مشکل تھی۔

نہ وہ پورے طور الفت کو مطمئن کر پاتے تھے۔

نہ بچوں کو۔

بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اپنی اپنی جگہ دونوں فریق انھیں اپنے سے بدگمان دکھائی دیتے تھے۔

اُن کی نگاہوں میں بدگمانیاں ڈولتی دکھائی دیتی تھیں۔

اور ہونٹوں پر شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔

جلیس محسن الجھ کے رہ گئے تھے۔

گھر کی شیرازہ بندی کا خواب تشنۂ تعبیر ہوتا نظر آتا تھا۔ البتہ اپنا ذہنی شیرازہ ضرور بکھرتا محسوس ہوتا تھا۔

الفت اُن کی رفیقِ سفر اُن کے مسائل کو سمجھنے اور اُن کے حل کے ضمن میں اُن کی مددگار ہونے کے بجائے خود مسائل کا ذریعہ نظر آتی تھی۔

بلکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ بذاتِ خود مسئلہ بن گئی تھی۔

تین ماہ سے زائد عرصہ بیت گیا تھا مگر اُس نے ایک قدم بھی تو بچوں کی جانب بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہیں کی وہیں تھی جہاں آئے دن تھی۔

بلکہ شاید اس جگہ سے بھی دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی!

بچوں سے اُس کی ذرا بھی مفاہمت نہ ہو سکی تھی۔

صبح ناشتے کی میز پر "گڈ مارننگ"، اسکول جاتے ہوئے "خدا حافظ" اور رات کے کھانے کے بعد اوپر جانے سے قبل "گڈ نائٹ"۔ اُس کے اور بچوں کے مابین فقط اتنا ہی رابطہ تھا۔

وہ اُن سے لاتعلق، اُن کی ہر ذمہ داری سے بے نیاز اور اُن کے جذباتی مسائل سے ناآشنا رہنا چاہتی تھی۔

اُسے اُن کی کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اور انھیں نظر انداز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔

لیکن طرفہ تماشا یہ تھا کہ اس انتہا درجہ لاتعلقی کے باوجود جلیس الحسن کے چاروں بچے اُسے ہر وقت اپنے اعصاب پر سوار محسوس ہوتے تھے۔

جس قدر وہ ان کے خیال سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی، اُسی قدر اُن کا خیال اُس کے ذہن کا گھیراؤ کیے جاتا تھا۔

وہ اُسے رقیب روسیاہ اور دشمن جاں لگتے تھے۔

جلیس الحسن سے اُن کا ہم کلام ہونا، اُن کے ہمراہ کہیں آ جانا، کوئی فرمائش کرنا اُسے زہر لگتا تھا۔

جلیس الحسن کو اُن سے محبت سے بات کرتے یا انہیں پدری شفقت سے معمور نگاہوں سے مسکراتے دیکھ کر اُس کا رُواں رُواں سلگنے لگتا تھا۔

جس رات وہ اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد اُس کے پاس آتے تو وہ اُن سے کروٹ لیے پڑی رہتی۔ وہ منانے کی کوشش کرتے تو بات کرنے دیتی۔ اُس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو انہیں بری طرح جھڑک دیتی اور اُن کے سوچا نے کے ابتداً کبھی انگاروں پر لوٹتی رہتی۔

دو چار مرتبہ اُس کی اس نوعیت کی خفگی کے بعد جلیس الحسن سمجھ گئے تھے کہ وہ بچوں کو نہ صرف اپنے التفات سے محروم رکھنا چاہتی تھی بلکہ ان سے بھی بچوں کے ساتھ بے رخی برتنے کی طلب گار تھی۔

چنانچہ اب یہ ہوا تو رات کو اُس سے پہلے ہی کچھ وقت بچوں کے ساتھ گزار کر آتے تھے یا اگر رات کے کھانے کے بعد اوپر جاتے تو دس پندرہ منٹ بعد ہی نیچے لوٹ آیا کرتے تھے۔

الفت اس گھر میں بچوں کو عاصمہ کی زندہ پرچھائیاں سمجھتی تھی۔

وہ اُن پرچھائیوں سے خوف آتا تھا۔

اُن سے جلیس الحسن کا اظہار رغبت اُس کے دل میں اس وسوسے کو زیادہ مضبوطی سے قدم جمانے پر اُکساتا کہ درحقیقت وہ دراصل عاصمہ سے اپنے لگاؤ کا اظہار کرتے تھے۔

دن بھر میں بیسیوں دفعہ اُس کے دل میں یہ وسوسہ سر اُٹھاتا کہ عاصمہ اس گھر سے چلے جانے کے باوجود بھی ان بچوں کے روپ میں اس گھر میں بستی تھی۔

اُسے یقینی ہوتا کہ جب تک یہ اس گھر میں موجود تھے عاصمہ کا خیال جلیس الحسن کے دل سے محو ہو جانا ناممکنات میں سے تھا۔

بار بار یہ خدشہ اُسے پریشان رکھتا کہ عاصمہ واپس بھی آسکتی تھی!

اُس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس گھر میں اُس کے چاروں بچوں کی موجودگی ایک نہ ایک دن اس گھر میں اُس کی واپسی کا سبب بن جائے گی۔

اگر وہ اپنے کم زاد کی محبت کی اسیر ہو کر بچوں کو چھوڑ کر جا سکتی تھی تو اس محبت کا سحر ٹوٹ جانے پر بچوں کی طرف واپس بھی لوٹ سکتی تھی۔

اور بچوں کی جانب اس کی واپسی کا مطلب تھا جلیس الحسن کی جانب واپسی!

وہ کسی وقت نکاح اور پھر اُس سے قطع، طلاق کے بعد وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پہلے شوہر کی جانب لوٹ سکتی تھی۔

قانون اور شریعت دونوں اس کی اجازت دیتے تھے۔

جلیس الحسن کی سابقہ بیوی کی واپسی کا خدشہ یوں تو الفت اپنے میکے ہی سے دل میں بسا کر آئی تھی لیکن شادی کے بعد اس گھر میں آنے کے بعد یہ خدشہ دھیرے دھیرے یقین کا روپ دھارتا جا رہا تھا۔

اس گھر میں عاصمہ کے بچوں کی موجودگی اُسے بری طرح کھٹکتی تھی اور اگر اُس کا بس چلتا تو وہ جلیس الحسن کو اُن سے ہمیشہ کے لیے چھین لیتی۔

اور

بچوں کا اگر بس چلتا تو وہ جیتے باپ کو اس عورت سے ہمیشہ کے لیے چھین لینے جو موقع پاتے ہی انہیں دشمن کی طرح گھورنے لگتی تھی۔

جس کی گھر میں آمد نے اُن کے باپ کو اُن سے کس قدر دور کر دیا تھا۔

جس کی کوئی ادا انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی بلکہ وہ اکثر اُس کا باجماعت مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

امجا تو اُسے "دیچ" یعنی جادوگرنی کہا کرتا تھا اور جب کبھی بہت بداخلاقی دکھانے پر آمادہ ہوتا تھا تو اُسے "بیچ" کہنے

لگے بھی نہ چوکتا!

حالانکہ یہ سراسر بدتمیزی تھی کیونکہ

الفت کا رویہ اُن کے ساتھ کتنا ہی نامناسب کیوں نہ ہی بہرحال وہ اُن کی بڑی تھی اور اُن کی ماں کی جگہ آئی تھی۔

اب وہ اور بات تھی کہ اُس نے ماں نہ ثابت ہو سکنے کی ہر ممکن ند بیر آزما رکھی تھی۔

علاوہ ازیں ایمانداری کی بات یہ تھی کہ اگر الفت کا رویہ اُن کے ساتھ نامناسب تھا تو وہ کون سا اُس کے آگے جھکے پلکوں کی راہ میں بچھے جا رہے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کے روبرو ڈٹے کھڑے تھے۔

مقابلہ اظہار نفرت کا تھا۔

برابر کا تھا۔

اور سخت تھا!

جلیس الحسن بختیار ہمدانی کی رائے کے مطابق انہیں وقت دے کر آزما رہے تھے۔

• • • • • • • • • •

باجراں کو اعتماد میں لینے میں الفت کو چنداں دشواری نہ ہوئی

ہر دوسری عورت کی طرح الفت کو بھی جلیس الحسن کی سابقہ بیوی کے بارے میں انتہائی تجسس تھا اور وہ اُس کے بارے میں سب کچھ جان لینے کی خواہاں تھی۔

اُس کی خوبیاں کیا تھیں اور خامیاں کیا۔

تاکہ اُس کی خوبیوں کو نیچا دکھانے کی تگ و دو کر سکے۔

اور اُس کی خامیوں کو جلیس الحسن اور اُن کے بچوں کی کمزوری بنا کر ہر اٹھتے وقت اُس کمزوری پر اپنا پاؤں دھر کر انہیں تلملانے اور بلبلانے پر مجبور کر سکے۔

مکین کے کمرے میں ایک نہیں چار البم رکھے تھے، جن کی جائے وقوع سے باجراں بخوبی آگاہ تھی اور اسی نے الفت کو وہ البم دکھائے۔

ان البمز میں جلیس الحسن اور عاصمہ کی شادی سے قبل سے لے کر عاصمہ کی جلیس الحسن سے علیحدگی سے چند دن قبل تک کی تصویریں چسپاں تھیں۔

جلیس الحسن کے والدین اور اُن کے عزیز و اقارب کی تصویریں بھی تھیں۔ خود جلیس الحسن کی نوائی کے ابتدا ولیت تک کی تصویریں موجود تھیں اور ان تصاویر سے عیاں تھا کہ والدین کی واحد اولاد ہونے کے سبب اُن کے ساتھ انتہائی لاڈ و پیار روا رکھا گیا تھا۔

عاصمہ سے اُن کی منگنی اور پھر شادی کی تصاویر ایک علیحدہ البم میں لگی تھیں اور اس امر کی غماز تھیں کہ عاصمہ کو بہت چاہت سے بیاہ کر لایا گیا تھا۔

چاروں بچوں کی اُن کی عمر کے مختلف ادوار کی تصویریں بھی تھیں۔ اُن کی مختلف سالگرہوں کے خوش رنگ مناظر... دوستوں کے ساتھ بیسیوں تصاویر...... اور والدین کے ساتھ مختلف مواقع اور مختلف مقامات کی ان گنت تصویریں۔

جلیس الحسن، عاصمہ کے ساتھ ایک تصویر میں اُس کے روبرو کھڑے مسکرا رہے تھے، اُس کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کیے کھڑے تھے۔ اس حد درجہ حسد و رقابت سے قطع نظر جو الفت جلیس کے ساتھ عاصمہ کی تصاویر دیکھ کر محسوس کر رہی تھی کھینچنے والے نے یہ تصویر اس درجہ کمال کے ساتھ کھینچی تھی کہ اُڑتے لمحوں کو جوں کا توں کیمرے کی آنکھ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ دیکھنے والے کو یوں لگتا تھا جیسے دونوں ابھی بول اُٹھیں گے!

بچوں کے ساتھ جلیس الحسن اور عاصمہ کی تصاویر یوں حال سے گواہی دے رہی تھیں کہ اس کنبے نے زندگی کی مسرتوں کا بھرپور لطف اُٹھایا ہوگا۔

وہ خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولے ہوں گے۔

اور گھر خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا ہوگا۔

یہ تصویریں اس امر کی عکاس تھیں کہ جلیس الحسن، عاصمہ اور بچوں کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ ہر تصویر میں اُن کی آنکھوں سے عاصمہ اور بچوں کے لیے محبت اور چاہت کا امرت ٹپکتا محسوس ہوتا تھا۔

اُن کی ماں کو جس کی یادوں سے بھی وہ اُس کے وجود کی طرح محبت کرتے تھے بُرا بھلا کہہ کر اُس میں عیب جوئی کر کے وہ انھیں بلیلانے پر مجبور کر دیتی۔

جب وہ اُن کی اس کمزوری پر پاؤں دھرتی تو اُن کے لب سی سے جاتے۔ آنکھیں چپکے سے بھیگ جاتیں اور وہ بہلو تہی کرنے لگتے۔

اُن کو اس کیفیت سے دوچار دیکھ کر الفت کو کیسا گونہ قلبی سکون ملتا اور اُس کی جھنجلاہٹ ایک عجیب سی تسکین میں بدل جاتی۔

لیکن

کب تک؟

کب تک بچّے اُسے اپنے کمزور پہلو پر حملہ کرنے کی اجازت دیے جاتے۔

ایک روز جب اُس کے دل کا چور ان الفاظ کی صورت زبان پر آیا کہ:

"ماں خود تو چلی گئی اپنی جنم دی ہوئی مصیبتیں دوسروں کے بھگتنے کو چھوڑ گئی۔"

تو اعجاز اُس کے روبرو آ کھڑا ہوا اور اُس نے چلّا کر کہا "یو وچ! شٹ یور ماؤتھ..... بکواس بند کرو تم اپنی۔"

"کیا!" الفت دہاڑی۔ "تو نے مجھے وچ کہا..... بدمعاش..... کیا کہا تو نے بکواس بند کرو۔"

"ہاں یہی کہا ہے میں نے۔" اعجاز نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"ذلیل کمینے زبان چلاتا ہے۔"

"شٹ اپ!" اعجاز نے حقارت سے کہا۔

"جاجی پلیز تم چپ رہو۔" نگین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

فراز تھر تھر کانپنے لگا۔

زرمین سہم کر ایک جانب کو دبک گئی۔

"باپ کو تم اپنے گُن آ لینے دو اُن سے شکایت کروں گی۔" الفت نے سگی سوتیلی ہر قسم کی ماؤں کی مخصوص دھمکی آزمائی۔

"کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔" اعجاز نے کہا۔ "پاپا سے تو آپ روزانہ ہی ہم لوگوں کی شکایتیں کیا کرتی ہیں۔"

"دفع ہو جاؤ کمینو میرے منہ ہی نہیں لگنا چاہتی۔"

"ارے آپ تو منہ لگنے کی بات کر رہی ہیں، ہم تو آپ کا منہ ہی نہیں دیکھنا چاہتے، خدا جانے کیوں بیچ سے اوپر آ جاتی ہیں۔" اعجاز نے بھڑک کر کہا۔

"بیٹے میاں کا گھر ہے، میں تو پورے گھر میں پھروں گی تمہیں تکلیف!"

"ہمارے بھی باپ کا گھر ہے۔" اعجاز سینہ تان کر بولا۔

"جاجی! بیسٹ بھائی تم ہی چپ ہو جاؤ۔" نگین نے لجاجت سے کہا۔

"جی! بھائی کو اُن کے کمرے میں لے جائیں۔" فراز پر رقت طاری ہو رہی تھی۔

فراز اور زرمین کی حالت خاصی قابلِ رحم ہو رہی تھی، مگر الفت کو اُن پر ذرا رحم نہ آیا اور نہ ہی وہ پسپا ہونے پر آمادہ نظر آئی۔

"اور تمہارا آیا باپ کے گھر والا۔ اسی ایک باپ کے گھر پر زور دیتے تمہارا اور سے ایک اور باپ بھی تو بتا رکھا ہے تمہارے لیے تمہاری ماں نے وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟" الفت نے قطعاً بازاری عورتوں کے سے انداز میں کہا۔

اعجاز جو بڑی بہن کے اصرار اور چھوٹے بھائی بہن کے ہراساں ہو جانے کے پیشِ نظر اپنے کمرے کا رُخ کرنا ہی چاہتا تھا کہ الفت کے اس اوچھے ہتھیار نے اُسے تڑپ کر پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

وہ مڑا اور بڑے فیصلہ کن انداز میں قدم اُٹھاتا اُس کے روبرو آ کھڑا ہوا اور "ب" سے خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولا "کیا کہا تم نے؟" وہ "آپ" سے "تم" پر آ گیا۔

الفت کو اُس کے تیوروں سے خوف سا آنے لگا آخر کو وہ گرم خون کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔

مگر اُس نے اعجاز پر اپنے خوف کا اظہار نہ ہونے دینے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے بظاہر ڈھیٹ دبنگ انداز میں کہا "سمجھتے جو کہنا تھا میں کہہ چکی۔"

"اگر آئندہ ایسی بات کی تو......"

"تو کیا کرے گا تو میرا؟" الفت نے اُس کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے اُسے پرے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اعجاز اُس کی اس حرکت کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ لڑکھڑایا، مگر جیسے سنبھلا بجلی کی سی سُرعت سے وہ الفت کی جانب بڑھا اور اُس کے دونوں بازو دبوچ کر اُسے شدید نفرت اور غصے سے دیکھتے ہوئے بولا "اگر آئندہ تم نے ایسی بات کی تو میں شوٹ کر دوں گا۔"

زرمین کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ بُری طرح رونے لگی۔

"جاجی! بیسٹ بھائی پلیز!" نگین نے اعجاز کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تمہیں کیا ہو رہا ہے؟" اعجاز اُس پر غرایا۔

"ذرا دیکھو تو فراز اور چھوٹی رو رہے ہیں۔"

اعجاز زرمین کو دلاسہ دینے کے لیے اُس کی طرف بڑھ گیا۔

الفت نے موقع غنیمت جان کر اُس کی گرفت سے نکلتے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے کوچ کیا۔

"ڈِچ!" اعجاز نے حقارت سے کہا۔

شام کو جب جلیس الحسن گھر واپس ہوئے تو الفت اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی اونگھ رہی تھی۔ انھوں نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟"

بس پھر کیا تھا۔

آہ و زاری اور شکوہ شکایات کا طوفان سا اُمڈ آیا۔

الفت اعجاز کو جس قدر بُرا بھلا کہہ سکتی تھی اُس نے کہا اور رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لیں۔

جلیس الحسن اُس کی سننے کے بعد حسبِ معمول بچوں کے پاس اوپر پہنچے تو اعجاز کو بپھرا ہوا اور نگین، فراز اور زرمین کے چہروں کو ستا ہوا پایا۔

"کیوں بیٹے آج کیا ہوا؟" جلیس الحسن نے اعجاز سے پوچھا۔

"پاپا! آپ ان سے کہہ دیں آئندہ وہ میری ماما تک نہ آئیں۔" اعجاز تنبیہی اور فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"پاپا! جب بھائی کی ان سے لڑائی ہوئی تو میں ڈر گئی تھی۔" زرمین نے بتایا۔

جلیس الحسن تھکے تھکے سے نگین کے قریب آ بیٹھے اور انھوں نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے انتہائی متفکر لہجے میں نگین سے کہا "نگین بیٹا! آپ بتاؤ کیا کیا جاسکتا ہے؟"

نگین نے سر جھکا لیا۔

آج اس کا دل بہت دکھا ہوا تھا۔

"تم چاروں بھائی بہنوں میں سب سے بڑی ہو بیٹا گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں بتاؤ کیا کیا جائے؟"

"پاپا!" اس نے بوجھل آواز میں کہا "کیا آپ ہم لوگوں کے ہاسٹل میں رہنے کا بندوبست کرسکتے ہیں؟"

جلیس الحسن دم بخود رہ گئے۔

نگین کے الفاظ تیر کی صورت اُن کے دل میں اُترتے چلے گئے تھے!!

"نہیں بیٹے!" انھوں نے نگین کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "اگر مجھے آپ لوگوں کو ہاسٹل ہی میں رکھنا ہوتا تو گھر میں یہ عورت نہ آتی۔"

بچوں کی دلجوئی کی خاطر وہ ان سب کو لے کر کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر چلے گئے۔

باہر گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سُن کر الفت نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو جلیس الحسن کو بچوں کے ہمراہ گھر سے باہر جاتے دیکھا۔

کمرے سے باہر نکل کر اُس نے ملازم لڑکے سے سُن گُن لینے کی کوشش کی تو اُس نے بتایا کہ صاحب بچوں کے ساتھ باہر گئے ہیں۔

الفت آزردہ خاطر بستر پر آ پڑی۔

جلیس الحسن نے بچوں کے ساتھ جتنا وقت بھی باہر گزارا، بظاہر تو اُن سے ہنستے بولتے رہے مگر باطن بہت اُلجھے ہوئے تھے۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"میں بالکل صحیح سمجھ رہی ہوں...... آپ اس عورت کو بھلانا نہیں چاہتے۔ وہ اب تک آپ کے خیالوں میں بسی ہوئی ہے۔"

"اوہ! نو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" انھوں نے بڑی شدت سے اس کی بات رد کرنی چاہی۔

"بالکل یہی بات ہے۔"

"خدا کے واسطے عقل کی بات کرو۔"

"اگر اسی کو یاد رکھنا تھا تو میری زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" الفت کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔

"تمھیں بدگمانی ہے اور کچھ نہیں۔"

"ہاں اپنی چوری پکڑے جانے کو آپ بدگمانی اور غلط فہمی پر محمول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"پلیز!" جلیس الحسن گڑگڑائے اور انھوں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"مت ہاتھ لگائیں مجھے۔" وہ ان کے بازو جھٹکتے ہوئے بولی۔

"میں تمھارا شوہر ہوں اور مجھے اس حق سے کوئی نہیں روک سکتا۔" انھوں نے بڑے کٹر لہجے اور زعم کے ساتھ کہا۔

"میں روک سکتی ہوں۔" اس نے اپنے بازوؤں کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی دوبارہ کوشش کی۔

انھوں نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور بولے۔ "تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں جانتی ہوں!"

جلیس الحسن کے ہاتھ اس کے بازوؤں کو اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے میکانکی انداز میں نیچے آ رہے۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم جیسی پڑھی لکھی عورت بھی ایسی بے عقلی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔"

"ہاں...... ہاں میں بے عقل ہوں، احمق ہوں، بدگمان ہوں، جاہل ہوں، ساری عیب مجھ میں...... ساری خوبیاں تو آپ کی اس بیگم میں تھیں جو شاید واپس آ جائے تو آپ اسے پھر سر آنکھوں پہ بٹھائیں اور اس کے سارے عیبوں کو ثواب اور خامیوں کو خوبیاں سمجھنے پر تیار ہو جائیں گے۔"

"اگر ایسا ہوا تو قصور وار تم ٹھہرو گی۔" انھوں نے بڑی متانت سے کہا۔

"کیوں؟ میں کیوں قصور وار ٹھہروں گی؟"

"کیونکہ پہلی عورت سے مرد کا تعلق ٹوٹ جانے کے بعد دوسری عورت کے ہوتے ہوئے بھی اس کی پہلی منکوحہ کی واپسی کا امکان ہو یا ایسی ہو جائے تو اس کا واضح مطلب یہی ہو گا کہ دوسری نااہل تھی جو مرد کے دل سے پہلی کا خیال محو نہ کر سکی۔"

"چاہے مرد بے ایمان اور بددیانت ہو قصور بے چاری دوسری ہی کا ٹھہرے گا؟"

"کیا مطلب؟"

"دوسری عورت کے ہوتے ہوئے مرد کو سوتے کے دن میں پہلی کی تصویر لگا کے رکھنے کی کیا ضرورت؟ کیا یہ مرد کی بددیانتی اور بے ایمانی کی دلیل نہیں ہے؟"

"خیر وہ بددیانتی ہے نہ وہ بے ایمانی فقط ایک سہو ہے۔ ہجوم روزگار میں مجھے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی کہ البم میں لگی ناصرہ کی تصویر ایک دن کسی کو مجھ سے بدگمان کرنے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔"

"واہ! کیا خوب! اپنے عیب کی پردہ پوشی۔"

"اچھا بفرض محال میں مان بھی لوں کہ تم درست کہہ رہی ہو تب بھی میں تصور وار تمھی کو کہوں گا۔"

"کیوں؟" وہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔

"کیونکہ تم اگر دانشمند ہوتیں تو پہلے حاوت پیدا کرتیں کہ میں اس البم میں سے ناصرہ کی تصویر نکال کر اس کی جگہ تمھاری تصویر لگانے پر مجبور ہو جاتا۔"

"آپ کے دل میں تو اول دن سے بے ایمانی تھی...... آپ کو تو اپنے بچوں کے لیے ایک نوکرانی درکار تھی اور بس۔"

"یہ سراسر بہتان ہے۔ نوکرانی کی اس گھر میں کیا کمی تھی؟" انھیں غصہ آ گیا۔ "مجھے اپنے بچوں کے لیے ماں کی ضرورت تھی اور تمھیں ان کی ماں بنا کر ہی لایا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب کی عافیت اور بقا کا واحد راستہ یہی ہے کہ تم اپنے دل سے تمام بدگمانیاں، وسوسے اور خدشات دھو کر صدق دل سے بچوں کی ماں بننے کی کوشش کرو۔"

"میں تھوکتی ہوں ان پر۔"

"الفت!" جلیس الحسن کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"مجھے نفرت ہے آپ کے نالائق اور بدتہذیب بچوں سے۔"

"کچھ جنون کی دوا کرو۔"

"میں ان سے نفرت کرتی ہوں۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"آل رائٹ!" جلیس الحسن اپنے جبڑوں کو باہم بھینچے غصے سے سرخ چہرہ لیے فیصلہ کن انداز میں اس کے قریب سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کچھ دیر عجیب کیفیت سے دوچار کھڑے رہے پھر انھوں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "مجھے اپنے بچوں سے محبت ہے جبکہ تم ان سے نفرت کا اعلان کر رہی ہو گویا ہمارے راستے ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ہمارا ایک ساتھ چلنا مشکل قرار پا سکتا ہے۔"

پھر وہ جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں۔" وہ پیشانی پر بل ڈالتی ہوئی بولی۔

"پھر بھی میں تمھیں ایک موقع اور دینا چاہتا ہوں...... سوچ لو کہ ہمیں ساتھ چلنا ہے یا علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے راستے پر۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔"

"بعد میں پچھتانا ہو گا۔"

"نہیں ہو گا کیونکہ میں اس کے لیے تیار تھی اور اسی لیے میں نے اپنی ملازمت کو برقرار رکھا ہوا تھا۔" اس نے بڑے زعم سے کہا۔

"کیا؟" جلیس الحسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں محترم جلیس الحسن صاحب...... آپ نے تو یہ احکامات صادر فرمائے تھے کہ میں ملازمت ترک کر دوں مگر میں نے استعفیٰ نہیں دیا تھا بلکہ چھٹی لی تھی اور تین ماہ بعد اس میں مزید تین ماہ کا اضافہ کروا لیا تھا۔"

"مگر جب شادی کے بعد میں نے تم سے پوچھا تو تم نے یہ بتایا تھا کہ تم استعفیٰ دے چکی ہو گویا تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے!"

"مصلحتاً۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بددیانتی اور بے ایمانی تو تمھارے دل میں تھی نہ کہ میرے دل میں۔"

"اب آپ جو بھی کہیں...... میں تو آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ عورت اس قدر بے وقوف اور نادان نہیں ہوتی جتنا کہ آپ مرد لوگ اسے گردانتے ہیں...... میں اگر آپ کے حکم کی پابندی کرتے ہوئے اپنے حق کی بات نہ کرتی تو آج کس اعتماد سے یہ فیصلہ کر سکتی جو کہ کر چکی ہوں۔"

"سراسر احمقانہ فیصلہ!" وہ سر جھٹک کر بولے۔

اور الفت ان کے غصے کو جھلاہٹ پر محمول کرتے ہوئے زیر لب مسکرا دی۔

وہ جی ہی جی میں رعنا جمیل کی مشکور تھی جنھوں نے اسے بذریعہ استعفیٰ برقرار رکھنے کا مشورہ دیا تھا بلکہ پہلی بار چھٹی کی مدت ختم ہو جانے کے بعد مزید تین ماہ کی رخصت کے سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کی تھی۔

رخصت میں اضافے کے سلسلے میں الفت کی سکول اور بورڈ تعلیم کے دوچکر بھی لگانا پڑے تھے۔ اور جلیس الحسن کی بے پناہ مصروفیت کے سبب انھیں کانوں کان اس کا رسوائی کی خبر نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے تو الفت کو بیاہتے ہی پورے گھر کا اختیار دے دیا تھا اور گھر کے تمام امور اس کے سپرد کر کے اسے بھرپور اعتماد دے کر بے فکر ہو گئے تھے۔

ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ اسی سے اعتماد کو دھچکا پہنچائے گی!

"دیکھو اب بھی وقت ہے۔"

"وقت گزر چکا ہے۔" الفت نے بڑی سرد مہری سے کہا۔

کچھ دیر وہ طول و ملول گرفتہ سے کھڑے رہے پھر انھوں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر الفت کے چہرے پر ڈالتے ہوئے مغموم لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے...... سمجھ لوں کہ ہمارے راستے واقعی مختلف ہو گئے ہیں؟"

وہ زبان سے کچھ نہیں بولی۔

چپ چاپ اٹھی، مسہری کے نیچے سے اپنے جہیز کا بڑا سا خالی سوٹ کیس کھینچ کر نکالا اور اسے مسہری پر رکھنے لگی۔

پیشے ملتے بولے۔ "بیٹی! بظاہر تو جلیس میاں بہت ہی تہذیب یافتہ، باشعور، مخلص اور شریف النفس نظر آتے ہیں؟"
"جی ہاں بظاہر۔" الفت اپنی رنگت پر قابو پا چکی تھی۔
بابا سوچ میں پڑ گئے۔
"درحقیقت وہ شخص بہت ہی خود غرض اور دوغلا ہے۔" الفت نے کہا۔
"خدا اُسے غارت کرے۔" امی بڑبڑائیں۔
"اگر آج اُس کی پہلی بیوی واپس آجائے تو وہ اُسے دوبارہ اپنے گھر میں رکھ لے۔" الفت نے یقین کے ساتھ کہا۔
"لاحول ولا قوۃ۔" بابا بولے۔
"کیا واقعی؟" تہنیت نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔
"میں غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ گھر اُس کی تصویروں سے بھرا پڑا ہے... اور وہ بظاہر تہذیب اور شریف نظر آنے والا شخص اپنے لاکٹ میں اُس کی تصویر لگائے پھر رہا ہے۔"
"میرے خدا!" امی نے دل ہاتھوں سے تھام لیا۔
"میں تو اتنے دن برداشت کرتی رہی اور آپ لوگوں کو اس خیال سے نہ بتایا کہ آپ سب کو رنج ہوگا۔ آپ سب یہ سمجھتے رہے کہ میں بہت خوش ہوں اور وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری حیثیت اس گھر میں نوکروں سے بھی بدتر تھی... اُس کے بچے میری نقلیں اُتارتے تھے، میرا مذاق اُڑاتے تھے، گالیاں دیتے تھے اور تہا یہ ہوا کہ کل مجھ [illegible] کرنے کو چڑھ آئے۔" الفت نے رقت آمیز لہجے میں بتایا۔
"بیٹی! تم اتنے دن چپ چاپ جھیلتی رہیں اور ہمیں کچھ نہ بتایا۔ پہلے بتایا ہوتا تو ہم اُس ودو جلیس کا گریبان پہلے ہی نہ پکڑ لیتے۔ افسوس کہ تم نے ہمیں بتانے میں دیر کی اور ہم سے اتنے دن چھپائے رکھا۔" امی نے کہا۔
"اچھی بیٹیوں کا یہی قرینہ ہوا کرتا ہے۔" بابا بولے۔
"چاہے بیٹیاں اپنی جان سے گزر جائیں۔" امی نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔
"خدا نہ کرے۔" بابا نے دھیمے سُر میں کہا۔
"جائیے اور جا کر اس مردود سے اُس کا گریبان پکڑ کر پوچھیں کہ ہماری بچی کے ساتھ اُس نے کیوں ظلم کیے؟" امی نے بابا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
"جذباتی مت ہو... کریں گے... ضرور کریں گے جلیس الحسن سے بات مگر ابھی تازہ تازہ معاملہ ہے۔ ذرا ٹھنڈے ہو لینے دو پھر بات کریں گے۔"
"نہیں بابا! کوئی ضرورت نہیں ہے بات کرنے کی۔ وہ بہت ہی خود غرض آدمی ہے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"
"ارے میری جان! ایسی باتیں نہیں کرتے۔" بھابی نے ملائمت سے کہا۔
"آپ کو نہیں پتا بھابی کہ اس گھر میں ان چند دنوں میں میں نے کتنے دکھ اُٹھائے ہیں۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔
"تم یقیناً درست کہہ رہی ہو مگر الفت جان یہ بڑے مشکل راستے ہوتے ہیں ان پر بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا ہوتا ہے... بابا ٹھیک کہتے ہیں۔ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے پھر جلیس صاحب سے بات کی جائے گی۔"
"کوئی ضرورت نہیں ان سے زیادہ بات کرنے کی۔ میرا اب فیصلہ ہے کہ اب میں اس گھر واپس نہیں جاؤں گی۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔
بھابی نے ابا کو دیکھا اور بابا نے الفت کو۔
"بیٹی! بات کریں گے ہم جلیس الحسن سے۔ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہے۔ [illegible] ..... ہم بات کریں گے اُن سے۔"
امی دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔
"امی جی پلیز!" تہنیت نے لجاجت سے کہا۔
"میری بچی نے کتنے دکھ سہے۔" امی نے روتے ہوئے کہا۔
"او ہو! کبھی کبھی ایسے اُتار چڑھاؤ تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔" بابا بولے۔
"اب کیا ہوگا؟"
"امی!" الفت نے اپنا ہاتھ بڑھا کر امی کے شانے پر دھرتے ہوئے انہیں تسلی دی۔ "آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔

جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ میں اپنے گھر لوٹ آئی ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں، میری ملازمت برقرار ہے اور میں مطمئن ہوں۔"
"عظمت کی ماں! تم تو ذرا سی دیر میں پریشان ہو جاتی ہو... کبھی تحمل و حکمت کا دامن بھی تھامو۔ تم سے کہا ہے ہم نے کہ بات کریں گے ہم جلیس الحسن سے۔ یہ زندگی کے معاملے ہوتے ہیں کھیل یا مذاق تو نہیں۔" بابا نے [illegible] کہا۔
"امی! تم اُٹھو اور ہاتھ منہ دھو لو۔" بھابی نے الفت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
"صبح سویرے ہی نکال دیا بدبخت نے میری بچی کو گھر سے۔" امی کلپ کر بولیں۔
"امی! [illegible] کسی نے نہیں... تو میں خود ہوں۔"
"بہت اچھا کیا تم نے اس جہنم سے نکل آئیں۔"
"چلو شاباش تم ہاتھ منہ دھو لو۔" بھابی الفت کو لے کر کمرے سے نکل گئیں۔
"عظمت کی ماں! تمہارا بھی جواب نہیں۔ بیٹی سسرال سے آ رہی ہے اور تم کہتی ہو بہت اچھا کیا۔"
"تو کیا بیٹیوں کی مائیں جہنم میں جل کر خاک ہو جائیں۔"
"یہ تو میں نہیں کہہ رہا۔"
"تو اور کیا مطلب ہے آپ کا؟"
"مطلب یہ کہ بیٹیوں کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ گھروں کا بسنا بہت مشکل ہے اُجڑنا مشکل نہیں۔ ہمیں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں صبر و تحمل اور عقل و دانش سے کام لینا ہوگا۔ ابھی معاملہ گرم ہے۔ الفت رنجیدہ بھی ہے اور غصہ میں بھی۔ ممکن ہے یہی کیفیت جلیس الحسن کی بھی ہو کیونکہ سیانوں کا کہنا ہے کہ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ معاملہ ٹھنڈا ہو لینے دو۔ رنج اور غصہ اُدھر بھی رفع ہو جائے اور اِدھر بھی حالات نارمل ہو جائیں۔ پھر ہم معاملہ سلجھانے کی کوشش کریں گے۔ مرد و زن کا رشتہ عجیب پُراسرار رشتہ ہے۔ لڑ جھگڑ تو لیتے ہیں خفگیاں بھی ہوتی رہتی ہیں مگر پھر یوں دل صاف ہو جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ یاد کرو ہمارے درمیان خفگیاں نہیں ہوتی تھیں کیا؟"
"ہاں ہوتی تھیں مگر ہماری آپس کی بات دوسری تھی۔ خدا نہ کرے آپ کے سوتیلے بچے تو نہ تھے جو میرا تمسخر اُڑاتے، مذاق اُڑاتے، گالیاں دیتے، مارنے کو کھڑے ہو جاتے۔ اور نہ کبھی آپ نے دل میں دوسری عورت کا خیال بٹھا رکھا تھا... یہ سب کچھ تو میری الفت ہی کیا کوئی عورت بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"
"ہاں یہ سنجیدہ معاملات ہیں اور ان کے سلسلے میں جلیس الحسن سے بات کرنی پڑے گی۔ ہو سکتا ہے آج کل میں وہ خود ہی یہاں آ جائیں۔"
"اور اگر نہ آئے تو؟"
"تو ہم خود رجوع کریں گے ایک دو روز انتظار کرنے کے بعد۔"
"ہرگز نہیں... اس سے تو وہ اور شیر ہوں گے۔ اُن کی غرض ہو تو سو مرتبہ ناک سے لکیریں کھینچتے آئیں۔ اگر وہ خود آئیں تو ٹھیک ورنہ آپ تو ابھی چپ لگا جائیے۔"
"اچھی بات ہے۔" بابا نے بحث و تمحیص میں اُلجھنے کے بجائے معاملہ چند الفاظ میں مختصر کیا۔

....

دوپہر کو جب ابا حسبِ معمول اعجاز، فراز اور زرین کو اُن کے اسکول سے، وزیبن کو اُس کے کالج سے لینے گیا تو اُس نے ان تینوں کو لے کر ثمین کے کالج جاتے ہوئے راستے میں اعجاز کو بتایا۔
"آج پھوپھو صاحب تو اپنے گھر چلی گئیں۔"
"اپنے گھر؟"
"جی چھوٹے صاحب۔"
"تمہارا مطلب ہے جہاں سے آئی تھیں وہاں؟"
"جی ہاں۔"
"گڈ!" اعجاز نے زیرِ لب کہا۔
فراز جو پچھلی نشست پر بیٹھا سُن رہا تھا بولا۔ "بھائی! کیا کہہ رہے ہیں ابا؟ تو صاحب؟"
"تمہاری پھوپھو اپنے گھر چلی گئیں۔"
"رئیلی بھائی؟"

بات پہاڑ کی طرح سر پر کھڑی تھی۔

وہ جس قدر اپنے خیال، اپنی سوچوں کو جلیس الحسن کی طرف جانے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اسی قدر اس کا دھیان ادھر جا رہا تھا۔

ایسی وجیہہ جلیس الحسن کی آراستہ پیراستہ، صندلیں اثر فرنیچر سے سجی، سحرانگیز ماحول والی خوابگاہ کے مقابلے میں اُسے یہ کمرہ ایک قفس سا معلوم ہو رہا تھا۔
کتنی گھٹن تھی اس کمرے میں!
یا شاید اسی کو محسوس ہو رہی تھی۔
جلیس الحسن اپنے معطر سراپا اور وجیہہ شخصیت کے ساتھ بار بار اُس کے دل میں در سے چلے آ رہے تھے!
ان کے گھر سے تو وہ آسودگی کا احساس دل میں لیے نکلی تھی۔
دل کبھی وہیں بھٹکتی رہی تھی
مگر اب وہ احساس ایک احساس خام محسوس ہو رہا تھا۔
اس گھر سے تو بہت سی یادیں دل کا دامن تھامے اُس کے ساتھ ساتھ چلی آئی تھیں۔
اُسے جلیس الحسن کی قربت میں گزارے ہوئے ان گنت لمحے یاد آ رہے تھے!
تنہائی اور ان کا قرب زندگی کو کس قدر پُرنشاط، پُرسحر اور دلفریب بنا دیا کرتے تھے!!
اگر اس سے پہلے ایک اور عورت اُن کے دل کے راستے سے نہ گزر گئی ہوتی تو شاید اس سے بڑھ کر معزز عورت اس دنیا میں کوئی اور نہ تھی۔
اُن کی قربت میں وہ خود کو کتنا شانت محسوس کیا کرتی تھی۔

اور
اُن سے دور آ کر دل کیسا مضطرب ہو رہا تھا۔
ساری گڑبڑ بچوں کی وجہ سے ہوئی ورنہ وہ خود تو بہت اچھے تھے! دل نے کہا اور اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسو تکیے کو بھگونے لگے۔
جلیس الحسن کی یاد میں روتے روتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔
لیکن طرفہ تماشا یہ ہوا کہ اگلی صبح بھی دل کم بخت طوطا چشمی دکھاتے ہوئے انھیں پہلے سے شد و مد سے بُرا بھلا کہنے لگا۔

اور پھر
اس بدبخت نے یہ روزانہ کا معمول بنا لیا کہ رات کو ہجر و فراق کے نغمے الاپتا اور دن میں دشنام طرازیوں پر اتر آتا۔

بابا جلیس الحسن کے بیتابی سے منتظر تھے۔
امی کا دعویٰ تھا کہ وہ ناک گھسیٹتے آئیں گے۔ چچا بچوں کے باپ کو بے تمیزی تو سیدھے سے رہی تھی!

قسم روٹھے ہم چھوٹے کے مصداق جلیس الحسن نے تو ایسی چپ سادھی کہ پلٹ کر خبر بھی نہ لی اور یوں لاتعلق ہو گئے جیسے الفت سے کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔
فقط الفت ہی پر کیا موقوف، کسی سے بھی تعلق نہ رکھا۔
آنا مشروط تھا۔
دونوں گھروں میں فون لگے تھے۔ فون پر رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ الفت سے نہ سہی امی، بابا یا بھیا ہی سے سہی، گھر پر فون نہ کرنا چاہتے تو بھیا سے اُن کے دفتر کے نمبر پر بات کر لی ہوتی لیکن جب تعلق نہ رکھنا مقصود ٹھہرے تو پھر فون کیا، رابطے کا ہر ذریعہ دھرا رہ جاتا ہے۔
امی کا یہ دعویٰ بھی کہ جلیس الحسن ناک کے بل گھسیٹتے آئیں گے، دھرا رہ گیا۔
بابا جو اول دن سے ہی جلیس الحسن کا بیتابانہ انتظار کر رہے تھے، اُن کا انتظار ناقابل بیان اضطراب میں بدل گیا۔ فکر بھیا اور بھابی کو بھی تھی۔ مگر مصلحتاً اس فکر کا زیادہ اظہار کرنے سے گریز کرتے تھے۔
عظمت آپا تو الفت کے خفا ہو کر میکے آ جانے کی خبر سے ایسی متوحش ہوئی کہ فیض کر دل تھام کے بیٹھ گئی تھیں۔ انھوں نے گھر میں ہر ایک کو خبردار کر دیا کہ میاں کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی جائے ورنہ وہ اپنی بہنوں کو بتائے بنا نہ رہیں گے اور وہ آپس میں بتانے میں ایسی ماہر کہ ان کا ناطقہ بند کر دیں گی۔ کچھ عجب نہیں کہ دو کی چار کر کے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیں۔

اس وقت کی گئی عظمت آپا اب تک تو میکے آئی نہیں تھیں کہ جب وہ میکے آئیں گی تو میاں بھی انھیں چھوڑنے اور لینے تو ضرور ان کے میکے پہنچیں گے۔ خدانخواستہ ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی اُن کے کان میں تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔
انھوں نے الفت سے بات کی تو اس کے تیوروں نے انھیں ہولا کر رکھ دیا کہ وہ تو جلیس الحسن سے مفاہمت پر قطعاً آمادہ نہیں بلکہ بقول اُس کے وہ تو دو چار روز میں اسکول سے بچوں کی رخصت قبل از وقت ختم کروانے کے بعد اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے جا رہی تھی۔

بابا نے عظمت آپا سے کہا "بیٹی! میں تو جس روز الفت گھر آئی ہے اُسی دن جلیس میاں سے رابطہ قائم کر لیتا مگر تمہاری والدہ نے مجھے سختی سے منع کر دیا۔ الفت نے کہا 'بابا اگر آپ نے جلیس کو یہاں بلایا تو میں یہ گھر بھی چھوڑ کر چلی جاؤں گی' شادی شدہ بیٹی ہے اب اگر وہ ایسا کوئی قدم اٹھا جائے تو کوئی بعید نہیں چنانچہ میں خاموش ہو رہا۔ تمہاری امی کا خیال تھا کہ وہ ایک دو روز میں خود ہی ناک کے بل گھسیٹتے آئیں گے۔ آج پانچواں روز ہے اب تک تو انھوں نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی ہے۔"

جاتے جاتے عظمت آپا نے امی سے کہا "امی جی! بات کو زیادہ آگے مت بڑھنے دیجیے گا ورنہ بڑی جگ ہنسائی ہو گی۔ اپنے پرائے سب ہی باتیں بنائیں گے۔ بابا جلیس بھائی کو بلا کر سمجھا دیں اور الفت کو اُن کے ساتھ کر دیں۔"
"تمہارے بابا کیوں بلائیں جلیس کو؟" امی نے تیوری چڑھا کر عظمت آپا کو دیکھا "ان کو ضرورت ہو گی تو خود آئیں گے سو مرتبہ۔"

"امی کوئی حرج نہیں اگر بابا خود بلا لیں انھیں۔"
"اے واہ! حرج کیوں نہیں۔ جلیس تو اکڑ جائیں گے آئندہ کو اور شیر ہو جائیں گے۔"
"امی جی بات بنانے سے بنتی ہے بگاڑنے سے بگڑتی ہے۔ بہتر ہے کہ بنانے کی کوشش کریں۔ آپ دیکھ لیجیے کتنی

"مطلب یہ ہے جی کہ کچھ پتا نہیں۔"
"کیوں بھئی؟"
"بس جی کچھ ایسی بات ہوگی ہے گی۔ آپ رات تو ناشتہ تک بھی صبح سویرے صاحب جی وہاں فون فون کرکے پوچھ لیتی ہو۔"
"کیسی ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟ میں ان کی گھر کی پہیلی ہوں مجھے تو پریشانی ہونے لگی ہے۔ کچھ تو بتاؤ کب سے بات ہوئی؟"

"وہ جی ...."
"ہاں ہاں بولو نا رک کیوں گئیں؟"
"وہ تو بیگم صاحب جی روٹھ کے گئی ہیں جی!"
"کیوں؟"
"یہ تو جی آپ بیگم جی کو پوچھنا ...... ہم نوکر لوگوں نے کیا بتانا ہے؟"
شاکرہ بھابی نے اپنے اس معرکے کا احوال اپنے سسرالیوں کے سامنے بارہ مسالوں کی چاٹ بنا کر پیش کیا اور سننے والوں نے حسب توفیق بات آگے بڑھائی۔
الفت کے اسکول جوائن کرنے کی بھنک تابوت میں آخری کیل کے مصداق ثابت ہوئی۔
گھر والوں کی تمام پیش بندیاں دھری رہ گئیں۔
بہانہ سازیوں کے پردے چاک ہوگئے۔

****

ادھر اسکول جوائن کرنے کے بعد سے الفت کی ساتھیاں اس کی جان کو آئی ہوئی تھیں۔
سوال پر سوال!
استفسار پر استفسار!
"کیوں الفت اب تمہیں نوکری کی کیا ضرورت؟" زیادہ تر کا یہی سوال تھا۔
"گھر بیٹھ کرنے کو کچھ نہیں۔ سارا دن فارغ بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں اس لیے اسکول جوائن کرلیا۔" اس نے اچھا جواب دے سب کی تسلی کی۔

جواب معقول تھا۔
سو اس کے اسکول جوائن کرلینے کے متعلق تو زیادہ بحث و تمحیص نہیں کی گئی۔
لیکن صبح اس کے ان سے اسکول آنے اور وہیں واپس جانے ہوئے بڑے تواتر کے ساتھ مسز نیازا اور مس راجیہ نے اس کے ٹکراؤ نے مسز نیاز اور مس راجیہ کے علاوہ اس کی دیگر ساتھیوں کو بھی متجسس کر دیا۔
پہلے ان کے مابین چہ میگوئیاں ہوئیں۔
پھر الفت کو کریدنے کی کوشش کی گئی تو اس نے اس جواز سے کام چلایا کہ۔
"چھوٹی بہن کی شادی کی تیاریاں کی جا رہی ہیں امی نے ہاتھ بٹانے کو بلا لیا ہے۔"
مگر اس بہانے سے آخر کتنے دن کام چلایا جا سکتا تھا؟
اس کی ساتھیوں کی جانب سے نوع بنوع استفسارات ہونے لگے۔
"الفت! بہن کی شادی کی تیاریوں میں تمہارا بیٹا گھر نظر انداز نہیں ہو رہا کیا؟"
"بس... وہاں کرنا ہی کیا پڑتا ہے ہر کام کے لیے تو نوکر موجود ہیں۔"
"پھر یہاں دو جوں کو تو تمہاری ضرورت ہوگی۔"
"بس کام چلا رہے دو چار گھنٹے وہاں بھی گزار آتی ہوں!"
"تمہارے میاں تو اس حساب سے مثالی شوہر ہوئے ورنہ ہمارے میاں کا تو یہ حال ہے کہ ساتھ چپک کر جاتے ہیں ہمارے میکے اور ساتھ ہی واپس لے آتے ہیں۔" مسز الٰہی بخش بولیں۔
"ہاں واقعی! اچھا جواب سے پُر زور تائید ہونے لگی۔
"بہن کی شادی کب ہو رہی ہے؟"
"ابھی تاریخ تو نہیں ٹھہری ہے لیکن رجب میں متوقع ہے۔"

بہنوں کے فوارے چھوٹ لے۔
"واہ بھئی! ابھی تاریخ طے ہوئی نہیں ہے بہن کی شادی کی اور تم ابھی سے میاں کا گھر چھوڑ کر میکے آگئیں۔ تاریخ ٹھہر جانے کے بعد تو شاید تم میکے سے بلوائی بھی نہیں۔"
شکوک و شبہات بڑھتے گئے۔
تجسس پسند فطرت کی ساتھیاں بال کی کھال نکالنے کی کوشش میں لگ گئیں۔
اور وہ ان کے الٹے سیدھے استفسارات اور معنی خیز نگاہوں سے بچنے کی خاطر اپنے فری پیریڈز اور وقفے کے دوران اسٹاف روم میں بیٹھنے کے بجائے اسکول لائبریری، کینٹین یا سائنس لیبارٹریز میں وقت گزارنے لگی۔
معنا جمیل نے سچ ہی کہا تھا کہ۔
"ہماری مشکلات ہونے والے اور مشکل بنا دیتے ہیں۔"

****

بات چھپنے والی تھی نہ چھپ سکی۔
جب خالہ بی بی نے جو منہ بند کی خدمت سے جلد ہی اکتائیں اور بیٹا کی بیگم بن جانے والی تھیں امی کو اپنی جان کی قسم دے کر پوچھا۔
"سے آپا! انہیں میری قسم بتاؤ تو الفت جہاں اتنے دنوں سے یہیں کیوں ہیں؟"
تو امی خالہ بی بی سے اپنے موجودہ رشتے کی پائیداری اور آئندہ رشتے کی نزاکت کے پیش نظر انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کرنے پر مجبور ہو گئیں۔
کچھ تو اس لیے کہ خالہ ان کی پرچھائیں ہوا کرتی ہے۔
کچھ اس لیے کہ خالہ بی بی دل کی موم صورت تھیں۔
اور کچھ اس سے اپنے موجودہ رشتے کے استحکام اور آئندہ رشتے کا بھی خیال رکھتے ہوئے خالہ بی بی الفت کو گلے لگا کر خوب ہی تو روئیں۔
خالہ بی بی نے اپنے گھر میں تذکرہ کیا۔
ان کے گھر سے ٹرن خالہ کے ہاں بات پہنچی مگر اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی اور سے نہ کہنا۔
تائی اماں کو چچی جان نے بتایا تھا۔
چچی جان کو پھوپھی جان کے ہاں سے خبر ملی تھی۔
اور
یوں گویا شہر بھر کو خبر ہو گئی کہ الفت جہاں کا میاں سے جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ گھر آ بیٹھی ہیں
پھر
تصدیق و تائید کا سلسلہ شروع ہوا۔
مشہر کا مہر تصدیق کے لیے ان کے پاس دوڑا چلا آیا۔
نہ ہو جیسا کہ پرلس مانند ڈورنہ موقع پر وحشت سے کا تھا۔
اپنے دستخطوں کے ساتھ ایسا علامیہ کچھ اس مضمون کا جاری کر لیں کہ:
"ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ میری بیٹی الفت جہاں ولد ریاست علی اپنے خاوند مسمی جلیس الحسن ولد نفیس الحسن سے اختلافات کے بعد باپ کے گھر آ بیٹھی ہے۔ یہ اعلامیہ ہر خاص و عام کو در دِ سر سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا جا رہا ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے الفت جہاں کے جلیس الحسن سے تعلقات کے سلسلے میں اگر کسی کو کوئی اعتراض ہو تو سات دن کے اندر اندر متعلقین الفت جہاں سے رجوع فرمائیں۔ بعد ازاں کوئی اعتراض نہ سنا جائے گا۔"
اور
اس اعلامیے کی ڈھیروں فوٹو کاپیاں بنوا لیتیں کہ کچھ تو کسی غریب کا بھی بھلا ہوتا۔
پھر
کسی اوقت کمشنر کو ٹھیکہ دے کر دروازے پر بٹھا دیتیں کہ میاں جو آئے تصدیق کا ٹھپہ لگاؤ، دستخط کرو معقول

"جی..... مگر آپ کو کیسے معلوم؟"

وہ دھیرے سے مسکرا دیں، پھر بولیں "کیونکہ اب اتنے تجربہ کار ہو چکے ہیں ہم اس میدان میں کہ آپ لوگوں کے چہرے سے لفافہ دیکھ کر..... ظاہر ہے ہم خود بھی تو اسی میدان کے ہیں۔" الفت خاموش رہی۔ انھوں نے پھر پوچھا

"اچھا یہ بات بتاؤ، اپنا اندازہ.... تمہارے میاں کیسے ہیں تمہارے ساتھ؟"

"برے نہیں..... ٹھیک۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہی سہی۔"

"ٹھیک ٹھاک؟"

"یعنی ٹھیک ٹھاک یا اچھے؟"

"اگر بچوں کی بیچ نہ ہوتی تو بہت اچھے۔"

"تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے؟"

"بہت زیادہ۔"

"لیکن؟" رعنا جمیل نے کہا پھر پوچھا۔

"محبت کرتے تھے تم سے؟"

"ظاہر تو یہی کرتے تھے۔"

"تمہیں شبہ ہے کہ وہ تم سے زیادہ بچوں سے محبت کرتے ہیں؟"

"شبہ نہیں یقین ہے مجھے۔"

"کوئی ایسی خامی یا برائی جو تمہارے لیے ناقابل برداشت رہی ہو؟"

"نہیں۔"

رعنا جمیل نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بولیں "الفت! تمہیں پھولوں سے کچھ شغف ہے یا نہیں؟"

"جی تھوڑا بہت۔" اُس نے اُن کے سوال پر حیرانی سے انھیں دیکھا۔

"کبھی ایک سیزن کے آخری دنوں میں پھولوں سے بھری کیاری میں اگلے سیزن کے بیج بوتے دیکھے ہیں؟"

الفت نے حیران ہو کر انھیں دیکھا۔

بات کیا ہو رہی تھی اور وہ موضوع کیا لے بیٹھی تھیں۔

رعنا اس کی حیرانی پر ہونٹ سے مسکراتے ہوئے بولیں "کبھی اس تجربے سے گزر کے دیکھو تو تمہیں پتا چلے گا کہ ایک رُت جاتی رُتوں کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہے۔ جاتی رُت کے پھولوں سے بھری کیاری میں بیج بوئے والی اگلی رُت کو تقریباً ساپودا شروع شروع میں تو جاتی رُت کے پھولوں کے بیچ ہی گم رہتا ہے اور بڑا حقیر اور بے وقعت سا نظر آتا ہے لیکن دھیرے دھیرے یہی ننھا پودا اگلی رُتوں کا اثاثہ بن جاتا ہے اور کیاری کو بھر دیتا ہے۔" انھوں نے چند لمحے توقف کیا پھر بولیں "ذرا محبتوں کا بھی یہی حساب ہے۔ پرانی محبتوں کے بیچ نئی محبت کو خود بخود ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے..... کچھ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں بھی انتظار کرنا چاہیے تھا۔"

"اور اگر نئی کونپل کو کیاری میں پرانے پودے پنپنے کا موقع نہ دیں۔ اُس کا راستہ روک لیں تو؟"

"نئی کونپل اپنا راستہ آپ ہی نکال لیتی ہے۔ وہ پتے بازوؤں کو پھیلا کر راستہ بنانے اور اپنا چہرہ اٹھا کر اوپر دیکھنے کی کوشش کرے تو کیسے نہیں ملے گا اُسے پنپنے کا راستہ۔ البتہ استقامت اور عزم شرط ہے۔"

الفت لاجواب سی نظر آنے لگی۔

"یہ بتاؤ یہ معاملہ بگڑا کہاں تک ہے؟"

"بس میں امی کے یہاں آ گئی۔"

"تمہارے میاں نے سمجھوتے کی کوشش کی؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اور شاید تم اور تمہارے گھر والے اس آس میں بیٹھے ہوں گے کہ مفاہمت میں پہل کیوں کریں؟"

"مفاہمت کرنی ہی نہیں ہے۔"

"کیا یہ تمہارے گھر والوں کا فیصلہ ہے؟"

"اُن سے زیادہ میرا۔"

"ایسی حماقت کرنا مت۔"

"حماقت! آپ ایک بروقت اور درست اقدام کو حماقت کا نام سے رہی ہیں!"

"ہاں کیونکہ میں ذاتی طور پر اس تجربے سے گزر چکی ہوں..... تب میں نے بھی یہی سمجھا تھا کہ میرا فیصلہ بہت دانشمندانہ ہے۔ مگر بہت جلد مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ میں غلط فیصلہ کر رہی ہوں۔" انھوں نے توقف کیا پھر بولیں "اگر چہ یہ پوچھنے پر تم نے مجھے یہ بتایا ہو گا کہ تمہارے شوہر تمہارا خیال نہیں رکھتے تھے تمہاری ضرورتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تم سے محبت نہیں کرتے تھے یا یہ کہ ظالم و جابر تھے یا کوئی ایسا عیب تھا جو تمہیں گوارا نہ تھا تمہارے لیے ناقابل برداشت تھا تو تب تم نے کبھی اچھی طرح سوچ سمجھ کر گزارا کرنے کی کوشش کرو اور گر تم یہ سمجھتی ہو کہ گزارا کسی قیمت پر ممکن نہیں تو ٹھیک ہے علیحدگی اختیار کر لو۔ مگر تم یہ کہتی ہو کہ وہ تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے تم سے محبت بھی کرتے تھے۔ ان میں کوئی برائی نہیں اور اگر بچوں کی بیچ نہ ہوتی تو وہ بہت اچھے تھے اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ تمہیں میاں سے نہیں اُن کے بچوں سے شکایت ہے..... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ جس شخص سے تمہیں کوئی شکایت نہیں اُسی کو تم نے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا کہ وہ چار نالائق اور بدتمیز بچوں کا باپ ہے کہاں کا انصاف ہے بلکہ سچ پوچھو تو ایسا شخص تو زیادہ تعاون اور محبت کا حقدار ہے۔ تمہاری تھوڑی سی یا شفقت تھوڑا سا صبر و تحمل اُسے ہمیشہ کے لیے تمہارا اسیر کر سکتے ہیں۔ ایک زخم خوردہ مرد کو عورت کی محبت..... ذرا سا کبھی اس کا غلام بنا سکتے ہیں۔"

"آپ کے اور میرے حالات مختلف ہیں اس لیے ایک زخم خوردہ مرد کے بارے میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر میرا خیال ہے آپ سے مختلف ہے۔"

"بالکل وہی رسے کہا کہتا ہے آپ کا تجربہ؟"

"میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ایک مر جانے والی عورت کے شوہر کو تو شاید دوسری عورت کی محبت اور وفا کسی حد تک اس کا غلام بنا سکتے ہوں مگر چھوڑ کر چلی جانے والی زندہ عورت کے شوہر کا دل پہلی اور دوسری عورت کے درمیان منقسم رہتا ہے۔ وہ پہلی کو بھلانے نہیں سے سکتا۔ اسے بار بار بہانے بہانے سے یاد کرتا ہے۔ بہانے بہانے سے اس کا نام اپنی زبان پر لاتا رہتا ہے وہ دوسری عورت میں بھی پہلی کو تلاش کرتا ہے۔ دوسری عورت اُس کا عشیا کبھی ہی نہیں سکتی۔"

رعنا جمیل یہ کہتے ہوئے الفت کے تصور میں قلیبس الحسن کی الماری میں رکھا وہ البم آیا جس میں عاصمہ کی تصویر لگی تھی۔

تاہم الفت نے رعنا سے اُس کا تذکرہ کرنے سے گریز کیا۔

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتی ہو۔" رعنا بولیں۔

تب ہی گھنٹی بج گئی۔

اور الفت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پیریڈ ہے تمہارا؟"

"جی۔"

"ہماری بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے جاری ہے پھر بیٹھیں گے اور بات کریں گے۔" رعنا اٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی بہت بہتر۔"

"اس کے بعد کوئی پیریڈ فری ہے تمہارا؟"

"جی ہاں چھٹا۔"

رعنا نے اپنے بیگ کی چھوٹی جیب سے اپنا ٹائم ٹیبل نکال کر دیکھا اور خوش ہوتے ہوئے کہا "اتفاق سے چھٹا پیریڈ میرا بھی خالی ہے۔ کہاں ملو گی؟" وہ مسکرا کر مزید بولیں "یہ سوال تم سے اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ شامت عدم میں اب تم شاذ ہی نظر آتی ہو۔"

"جی ہاں..... کیونکہ لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" الفت نے بیگ شانے پر لٹکایا کاپیوں کا بنڈل جو کہ کانوں اٹھایا اور لائبریری کے خارجی دروازے کی سمت چل پڑی۔

رعنا بھی ساتھ ساتھ ہو لیں۔

راہداری سے گزرتے ہوئے کئی ٹیچرز سے ٹکراؤ ہوا اور الفت کو ایک کر دہ احساس جرم نے اُن سے نظر [illegible]

پڑ جاتا تھا۔

مگر اس کے وجود کو انھوں نے اپنی کمزوری نہ بننے دیا تھا۔

وہ ان مردوں میں سے نہیں تھے جو عورت کو اپنی کمزوری بنا لیتے ہیں۔

یہ بھی نہیں کہ الفت کے لیے انھوں نے اپنے گھر کے دروازے بند کر دیے ہوں۔

مگر یہ طے کیے بیٹھے تھے کہ الفت کی واپسی اگر ہو گی تو اُن کی اپنی شرائط پر نہ کہ الفت یا اُس کے متعلقین کی شرائط پر۔

الفت کے میکے جانے کے بعد ادھر سے جو سن گن نہ تھی اس خاموشی کے باعث انھیں یقین تھا کہ الفت خود یا اُس کے متعلقین میں سے کوئی نہ کوئی رجوع ضرور کرے گا۔

چنانچہ بھیا اور بھابی کو دیکھ کر انھیں پہلا گمان یہی گزرا کہ وہ مجھوتے اور مصالحت کی بات کرنے کے لیے اُن کے پاس آئے تھے۔

بچے جو اُن کے ساتھ ہی سبزہ زار پر موجود تھے اپنی سوتیلی ماں کے دو قریبی متعلقین کو دیکھ کر کچھ پریشان اور ناخوش سے نظر آنے لگے۔

ناخوش اس لیے کہ سوتیلی ماں اور اُس کے جملہ متعلقین انھیں بُرے لگتے تھے۔

پریشان اس لیے کہ اُن کی فہم و سمجھ نے اُن کے کان میں سرگوشی کی کہ کہیں اُن کا آنا اُن کی سوتیلی ماں کے دوبارہ گھر آنے کا پیش خیمہ تو نہ تھا۔

وہ اُس کی واپسی کو کسی صورت بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اُس کے جانے کے بعد وہ باپ کو ہر ممکن طریقے سے خوش اور مطمئن رکھنے کی مشترکہ کوششیں اسی لیے کر رہے تھے کہ سوتیلی ماں کی واپسی کے راستے پر ہمیشہ کے لیے تالا لگا دیا جائے۔

وہ چاہتے تھے کہ اُن کا باپ اپنی کتابِ زندگی سے اس عورت کا نام ہمیشہ کے لیے مٹا دے۔

ایسی صورت میں انھیں اپنی سوتیلی ماں کے کیاتی اور بھابی کا آنا کیسا لگا ہو گا!

رسمی علیک سلیک کے دوران جلیس الحسن نے رد و بدیہ نگاہوں سے چاروں بچوں کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی۔

گو بھیا اور بھابی نے بہت اپنائیت اور محبت سے ان چاروں کا حال چال پوچھا مگر جلیس الحسن نے دیکھا کہ اُن کی اپنائیت اور محبت کے جواب میں ان چاروں ہی نے انتہائی سرد مہری اور روکھائی کا مظاہرہ کیا۔

چنانچہ بچوں کو وہیں دھوپ تاپتے چھوڑ کر جلیس الحسن مہمانوں کو اپنے انتہائی آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

الفت بہت ہی بے وقوف تھی: بھابی نے بیش قیمت فرنیچر اور آرائشی اشیاء سے سجے دلکش اور خوبصورت ڈرائنگ روم کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔

"آپ لوگ چائے پینا پسند کریں گے یا کافی؟" جلیس الحسن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جلیس بھائی! ابھی ناشتا کر کے ہی نکلے ہیں ہم لوگ۔"

"ایک کپ اور سہی۔"

"سچ، ابھی نہیں..... ویسے بھی ہم لوگ آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے کیونکہ تھوڑی سی عجلت میں ہم خود بھی ہیں۔"

"خیریت؟"

بھتیا نے بھابی کی جانب توجہ کی۔

بھابی نے اپنے بیگ میں سے جناب جلیس الحسن کے نام کا دعوت نامہ نکال کر میاں کی جانب بڑھا دیا۔ بھیا نے خوبصورت دعوت نامہ اُن سے لے کر جلیس الحسن کو پیش کرتے ہوئے بولے "یہ تہنیت کی شادی کا دعوت نامہ ہے۔"

"شکریہ۔"

انھوں نے دعوت نامہ لے کر لفافے پر درج تحریر پر ایک نظر ڈالی۔

"جناب جلیس الحسن صاحب مع عیال۔"

وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"آپ کو آنا ضرور ہے۔" بھابی نے کہا۔

"مع عیال.....؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولے۔

"جی بالکل۔" بھابی نے جواب دیا۔

"آپ یہ جانتے ہوئے کہ بچے ہی میرے اور آپ کی......" وہ کہتے کہتے رک گئے پھر بولے "معاف کیجیے گا رشتوں کے سلسلے میں میری معلومات خاصی ناقص ہیں۔ الفت کیا ہوئیں آپ کی؟"

"نند۔" بھابی نے مسکرا کر بتایا۔

"اس نند کے درمیان باعث نزاع قرار پانے والے ان بچوں کو الفت کی بھتیجی کی شادی میں اتنے کھلے دل سے اجازت دے رہی ہیں آپ!"

"جلیس بھائی اب خاک ڈالیے اس جھگڑے پر۔"

"آپ کی نند کیا کہتی ہیں؟ کیا وہ ابھی تک میرے بچوں سے نفرت کرنے کے موقف پر قائم ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"مطلب یہ کہ وہ علی الاعلان کہہ گئی تھیں کہ انھیں میرے بچوں سے نفرت ہے اور وہ ان پر تھوکتی ہیں۔"

"کیا! الفت نے ایسا کہا؟"

"یہی نہیں اور بھی بہت کچھ۔"

"حیرت ہے! حالانکہ الفت تو ہماری ان چاروں بہنوں میں سب سے زیادہ سمجھدار خیال کی جاتی ہے۔" بھابی بولیں۔

"جلیس صاحب!" بھیا نے بات ختم کرنے والے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہماری اِتنی آپ بسہولت الفت کی موجودگی میں!!! اور ماتی وغیرہ کے سامنے پیش کیجیے گا۔ فی الحال نہیں تو آپ اجازت دیجیے کیونکہ کئی اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔"

"جی بہتر۔"

"مگر دیکھیے آپ کی شرکت لازم ہے۔" بھیا نے جتایا۔

"بالکل۔" بھابی نے تائید کی اور توضیح بھی۔ "مایوں، مہندی، شادی، ولیمہ سب میں۔"

"کوشش کروں گا۔"

"ایں! یہ تو آپ ٹالنے والی بات کر رہے ہیں۔" بھتیا نے بڑی اپنائیت سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی! آپ فیملی ممبر ہیں آپ کی شرکت بہت ضروری ہے۔"

"اوکے۔ آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔"

"آپ نہ آئے تو بابا کو بہت مایوسی ہو گی۔"

"انھیں میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔"

"خود آ کے کیجیے گا سلام!"

گو الفت کے حوالے سے جلیس الحسن رشتے میں بھیا اور بھابی کے چھوٹے ہوتے تھے مگر خدا جانے یہ اُن کی قبل از وقت کھچڑی ہو جانے والی قلموں کا لحاظ تھا یا اُن کی امارت اور فراغت کا رعب کہ بھیا اور بھابی بیک عظمت آپ اور ان کے بیال کبھی اُن سے آپ جناب اور جلیس بھائی، جلیس صاحب کہہ کر ہی مخاطب ہوتے تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے چائے کافی کچھ نہیں پی۔" جلیس الحسن انھیں اٹھنے کا قصد کرتے دیکھ کر بولے۔

"پھر سہی..... کوئی غیر گھر تھوڑی ہے اپنا ہے۔" بھابی نے کہا مگر جی ہی جی میں بولیں "کاش الفت نے اجڑنے دیا ہوتا!"

چند ہی دنوں دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے شادی میں اُن کی شرکت پر اصرار کرتے ہوئے اُن سے اجازت چاہی۔ جلیس الحسن انھیں رخصت کرنے باہر تک گئے۔

اور

اُن کا مہمانوں کے ساتھ یہ پُرتپاک رویہ دیکھ کر سبزہ زار پر بیٹھے چاروں بچے ناپسندیدگی اور نفرت کے اظہار کے لیے ناک منہ چڑھاتے رہے۔

"پھر آ گئے یہ گندے لوگ؟" زریں دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"ممی ابھی! کیوں آتے ہیں یہ لوگ؟" فراز نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم!"

شاید قسمت یاد نہ کیا گیا!!
خدایا! کس قدر تنہا اور دل گرفتہ محسوس کر رہی تھی وہ خود کو ہال کے اس نیم تاریک گوشے میں دبکا ہوئے رخصتی پونے بارہ بجے عمل میں آئی۔
شادی ہال سے واپس ہوتے ہوتے سوا ایک بج گیا۔
راستے میں امی نے بابا سے کہا، "عظمت اور فضیلت دونوں اپنے گھروں کو پریشان گئی ہیں۔"
"کیوں خیریت؟"
"جلیس کے تقریب میں شریک نہ ہونے پر ان کے سسرالیوں میں خاصی چہ میگوئیاں ہوئیں۔"
"اچھا!"
"ہاں بلکہ فضیلت تو چلتے ہوئے میرے کان میں یہ کہہ گئی ہے کہ حامد بھری محفل میں اس سے یہ کہتے سے باز نہ رہے کہ تم نے اور تمہارے گھر والوں نے تو بہت چھپانے کی کوشش کی مگر آج ثابت ہو گیا کہ تمہاری آپا اور ان کے شوہر نامدار خاصی شدید قسم کی گڑبڑ ہے۔"
"ہاں ایسی باتیں چھپی کہاں رہتی ہیں بھلا" بابا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے حیرت ہے کہ جلیس میاں آخر آئے کیوں نہیں؟ کیا اتنی شدید ناراضگی ہے کہ انھوں نے ہماری خوشی میں شریک ہونا بھی گوارا نہ کیا۔ میں تو یہ باور کیے بیٹھا تھا کہ مایوں اور مہندی میں نہ آئے تو کوئی بات نہیں، شادی اور ولیمے میں ضرور آئیں گے۔"
"جب شادی میں نہ آئے تو ولیمے میں کیا آئیں گے!" امی نے خاصی دل شکستگی سے کہا۔
"تم ٹھیک کہتی ہو۔"
الفت مٹی کی مورت بنی چپ چاپ سن رہی تھی۔
اس رات جب وہ اس کمرے میں آئی جو تہنیت کے دم سے سجا سجا سا لگتا تھا تو بے اختیار جی بھر آیا۔
اگلے پچھلے سارے ہی بند ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔
"بہنوں کا ساتھ بھی کتنا مختصر ہوتا ہے..." اس نے آنسوؤں کے بہاؤ میں انتہائی دل گرفتگی سے سوچا۔ "کل تہنیت یہاں تھی آج نہیں ہے۔"
تہنیت کا خالی بستر دیکھ کر اس کا دل کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کمرے میں اس کا اسباب اس کی بری طرح یاد دلا رہا تھا۔
کرسی کی پشت پر اس کا دوپٹا پڑے دیکھ کر اسے لحظہ بھر کو توں لگا جیسے تہنیت یہیں کہیں گھر کے کسی کونے کھدرے میں چھپی تھی اور ابھی کوئی دم میں اپنی دلکش مسکراہٹ کے پھول بکھیرتی اس کے سامنے آ کھڑی ہو گی اور مسکرا کر کہے گی۔ "کیا بات ہے بندی پرور، ایسی چپ چاپ کیوں بیٹھی ہیں؟ ساری فکروں کو گولی ماریں اور فنافٹ بتائیں چائے چلے گی اس وقت؟"
کتنا خیال رکھا تھا اس نے اس کا۔
اس گھر میں اپنے آخری لمحے تک اس کی ہمدرد و غمگسار رہی تھی۔
جس روز مایوں بٹھایا گیا اس روز تمام مہمانوں کے جانے اور ساری مصروفیات سے فراغت پانے کے بعد جب وہ اس کمرے میں لوٹی تو تہنیت نے پوچھا تھا "آپا! آپ وہاں کیوں نہیں تھیں؟"
"کہاں؟"
"جہاں مجھے لے جا کر بٹھایا گیا تھا۔"
"تھی تو سہی" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"کوئی نہیں۔"
"ہاں کیسی؟"
"میرا سر جھکا ہوا اور آنکھیں بند تھیں تو کیا، کان تو کھلے ہوئے تھے۔ شاکرہ بھابی وارو غہ وقت ہی ایک ایک کو اس کے نام سے پکار پکار کر بلا رہی تھیں۔ آپ کا نام تو نہیں سنا میں نے۔"
"مجھی میں نے شاکرہ بھابی کو اپنا نام پکارنے کی زحمت جیسے بنا ہی مہندی کا تو اسا اور انہا ہے مت میں لے دیا تھا۔"
"مطلب کیا آپا؟" تہنیت نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "اپنی بہنوں کو تو میں ان کی خوشبو سے پہچان

سکتی ہوں۔"
"سوری جانی!" اس نے اپنے مصلحت آمیز جھوٹ کے پکڑے جانے پر خجل ہوتے ہوتے پھر ایک جھوٹ سے کام لینے کی کوشش کی۔ "دراصل اتنے بہت سے کام تھے جان کہ مجھے تمہاری طرف آنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔"
"جلیس بھائی نہیں آئے نا؟"
"نہیں۔"
پھر مہندی والے دن بھی اس نے یہی سوال دہرایا تھا۔
اور آج بھی
نکاح سے ذرا دیر پہلے جب وہ اس کے پاس جا کر بیٹھی تھی تو اس نے چپکے سے یہی سوال کیا تھا۔ جس کے بعد تصویروں اور مووی بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور وہ الگ تھلگ ہو گئی تھی۔
لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ جلتی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے غسل خانے میں جا گھسی۔
کھونٹی پر ٹنگے تہنیت کے زرد جوڑے کو دیکھتے ہی دل کا سارا دکھ حلق میں امڈ آیا۔ وہ آگے بڑھی اور ریشمی جوڑے پر یوں بیچ بیچ ہاتھ پھیرنے لگی جیسے وہ تہنیت کے وجود کا جز نہ ہو اس کا وجود ہو۔
آنکھوں پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے اس کے دل سے تہنیت کے لیے دعاؤں کی برکھا برسنے لگی۔
"خدا کرے تہنیت سکھی رہے۔"
"ڈھیروں خوشیاں ملیں۔"
"کوئی دکھ نہ پاسکے۔"
منہ دھو کر دوبارہ کمرے میں آئی تو اسے خفقان سا ہونے لگا۔
تنہائی کے جان لیوا احساس سے دم گھٹنے سا لگا۔
اس نے بتی بجھائی کینڈل پاور بلب روشن کیا اور برآمدے کے رخ کھلنے والے کھڑکی پر پڑے پردے سمیٹ کر دونوں پٹ وا کر دیے۔
برآمدے میں مدقوق روشنی بکھری پڑی تھی۔
اور ملحقہ کمرے سے بھیا اور بھابی کی دھیمی دھیمی آوازیں سناٹے میں ٹکڑے ٹکڑے اس تک پہنچنے لگیں۔
"جس نیم دلی سے انھوں نے دعوت قبول کی تھی اس کے پیش نظر مجھے اندازہ تھا وہ نہیں آئیں گے۔" بھیا کہہ رہے تھے۔
"الفت نے بھی تو نہال دی کر ان سے کہا کہ مجھے آپ کے بچوں سے نفرت ہے اور میں ان پر تھوکتی بھی نہیں۔"
"ہاں بالکل... کبھی مجھ سے تو اگر کوئی کہہ دے کہ مجھے تمہارے بچوں سے نفرت ہے تو میں اس کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہ ہوں۔"
"الفت کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔"
"اب اسے اپنی غلطی کا احساس کون دلائے۔"
"ایک بات کہوں؟"
"ہاں کہو۔"
"الفت نے مارے باندھے ہاں کر تو لی تھی... مگر اول دن سے اس کا نباہ کا ارادہ نہیں تھا۔"
"ہو سکتا ہے۔"
"ہو سکتا ہی نہیں بلکہ یہ بالکل یقینی بات کہہ رہی ہوں میں آپ سے۔"
"بہرحال اب تو جیسے تیسے مصالحت کی کوشش کی جانی چاہیے۔"
"مجھے تو جلیس الحسن کے تیور مصالحت کرنے والے نہیں لگتے۔"
"اگر ایسا ہے تو بہت برا ہے۔"
"سوچا تھا تہنیت اپنے گھر چلی جائے گی تو اس کا کمرا ارشد اور ماجد کے لیے سیٹ کر دوں گی۔ بے چارے بچوں کو ڈرائنگ روم میں سونا پڑتا ہے۔ مگر الفت کی تو واپس آ بیٹھیں اور مجھے تو اب واپس جاتی لگتیں نہیں۔ کنوارپن کا بنیل انترا تھا سو اتر گیا۔ اب یہیں راج کریں گی۔ سچ کہتی ہوں ذرا جو ملال دیکھا ہو میں نے الفت کے چہرے پر اس بات کا کہ میاں کو چھوڑے بیٹھی ہوں۔"

اس سے آگے سفنے کی الفت میں سکت تھی نہ تاب۔
کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے کھڑکی کے پردے برابر کیے اور بادو ندے منہ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔
انسانی چہروں پر ایسے بھی نقاب چڑھے ہو سکتے ہیں، اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔
دن کے اجالوں میں شفیق، مشفق، مہربان، ہمدرد اور مسیحا نظر آنے والی بھابی جان کی رات کے تاریک اندھیرے میں دکھائی دینے والی پرچھائیں کس قدر مہیب، کریہہ اور دل شکن تھی۔
اُسے پہلی بار شدت سے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ
دل دکھانے والے ان بے رحم دنوں سے بدرجہا بہتر تو وہ دن تھے جو اس نے "حسن لاج" میں گزارے تھے۔
وہاں دوسری نوعیت کے دکھ ضرور تھے مگر بے زمین، بے آسمان ہونے کا احساس تو خنجر کی طرح دل میں اُترتا محسوس نہ ہوتا تھا۔
رضا جمیل نے غلط نہ کہا تھا۔
اپنا گھر اپنی جنت ہوتی ہے!
اپنی گم گشتہ جنت کا خیال اُس کے دل کو تڑپا رہا تھا۔
بی حوا کو بھی اگر پتا ہوتا کہ وہ جنت سے نکل کر ایسی خوار ہوں گی تو وہ دانۂ گندم کو کھانا تو درکنار اس کے تصور سے بھی کانپ اٹھتیں۔
الفت کو جلیس الحسن بے طرح یاد آ رہے تھے۔
شاید بی حوا بھی بابا آدم کے لیے یونہی تڑپی ہوں گی۔
پریشان بھی ہوں گی۔
مگر جنت بدر کیے جانے کی ساری ذمے داری بابا آدم کے سر ڈال کر خود مٹی کی طرح ایک طرف منہ پھیر رہی ہوں گی کہ اگر بابا آدم نے ان کی تلاش کی تھی تو وہ بھی اُن کی جستجو میں دیوانہ وار ادھر سے اُدھر بھٹکتی پھری ہوں گی۔
اگر اپنے حصے کے دکھ بھوگنے کے بعد آدم اور حوا مل سکتے تھے تو وہ بھی جلیس الحسن سے ملنے کی امید باندھ سکتی تھی۔
اسی امید کا دامن تھامے تھامے وہ نیند کی مشفق اور مہربان آغوش میں سو گئی۔
رات کا بقیہ حصہ خواب دیکھتے گزرا۔
اونچے اونچے سربفلک پہاڑوں سے گھرے لق و دق چٹیل میدان میں وہ دیوانہ وار ادھر سے اُدھر بھٹکتی چیختی پکارتی پھرتی رہی۔
جلیس!
جلیس!
تم کہاں ہو میرے ہم نفس؟
شاید بی بی حوا نے بھی بابا آدم کو یونہی پکارا ہوگا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ منہ اندھیرے اٹھ بیٹھی۔
فجر کی نماز کے بعد حسب معمول نماز ادا کی۔
سورۂ توبہ کی تلاوت کی۔
سورۂ رحمٰن پڑھی۔
اور خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگی۔
یہ آزمودہ نسخہ تھا کہ
جب کبھی وہ کسی باعث پریشان ہوتی نماز کے بعد سر جھکا کر بیٹھ جاتی اور دل کھول کر رو لیتی۔
عجیب تقویت ملتی تھی دل کو اس عمل سے۔
جیسے اپنے مربی و محسن، اپنے ہمدرد و غمگسار، اپنے عزیز ترین دوست سے سب کچھ کہہ ڈالا ہو۔
کلام الٰہی کا سحر جدا تھا۔
جوں جوں تلاوت کرتی جاتی دل کا دکھ رفع ہوتا چلا جاتا۔

بابا اور امی کے پیے جانے جتا کر بے گئی اور اُن کے سرہانے دھرے ٹیلیفون سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔" بابا! ایک فون کرنا ہے۔"
" خیریت! اتنی صبح کسے فون کرنے کی ضرورت در پیش آ گئی؟"
" بس کسی کو کرنا ہے۔"
بابا اور امی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔
" فون ذرا اپنے کمرے میں اٹھا لے جاؤں بابا؟"
" آں ہاں ضرور۔"
ٹیلیفون کا تار تو خیر سے اتنا لمبا رکھوا لیا گیا تھا کہ حسب ضرورت گھر کے ہر کمرے تک لے جایا جا سکتا تھا۔
وہ ٹیلیفون سیٹ اٹھائے اپنے کمرے میں چلی آئی۔
گھر پر سناٹے کا عالم تھا۔ بابا، امی اور وہ بس یہی تین نفوس ابھی جاگے تھے۔ بھیا، بھابی، بچے، نانی اماں اور رشتے کی ایک خالہ جو خاندان بھر میں خلوص کی عرفیت سے مشہور تھیں اور گزشتہ رات شادی ہال سے سیدھی چلی آئی تھیں کہ کل ولیمہ تھی ہے کون نچوڑ ماسے کو رنگی سے یہاں آتا پھرے گا، سب ابھی تانے سو رہے تھے۔
بھیا نے دفتر سے تین دن کی چھٹی لے رکھی تھی۔
اور وہ خود بھی تین دن کی چھٹی پر تھی۔
" یہ صبح ہی صبح کہاں فون کرنے کی ضرورت پیش آ گئی الفت کو؟" امی نے بابا سے پوچھا اور اُن کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولیں۔" اتنی صبح تو کسی نے بھی نہ کھولا ہوگا۔"
زمانہ شناس بابا دھیرے سے مسکرا دیے۔
" لگتا ہے آج جلیس میاں سے پوچھا جائے گا کہ کل کیوں نہ آئے؟"
" اچھا! اب سمجھی۔"
" یہ کوئی نئی بات نہیں، تم ہمیشہ دیر سے سمجھتی ہو۔"
بابا کا قیاس غلط نہ تھا۔
الفت جانتی تھی، جلیس الحسن ابھی بستر ہی پر ہوں گے اور ٹیلیفون سیٹ حسب معمول اُن کے سرہانے دھرا ہوگا۔
اور ابھی "حسن لاج" پر سناٹا چھایا ہوا ہوگا۔
ریسیور جوتھی مرتبہ گھنٹی بجنے پر اٹھا لیا گیا۔
" ہیلو!" جلیس الحسن کی خوابناک آواز سنائی دی۔
الفت کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔
کتنے دنوں بعد!
اُن کی آواز کان میں پڑی تھی۔
" ہیلو!" اُنھوں نے دوسری جانب سناٹا پا کر دوبارہ کہا اور اس بار اُن کے لہجے سے قدرے حیرانی عیاں تھی۔
الفت کا جی بھر آیا۔
" میں بول رہی ہوں۔" اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔
ٹیلیفون سیٹ بولنے والے کی آواز کے ساتھ اس کی تصویر بھی دکھا سکتا تو وہ دیکھتی کہ جلیس الحسن نیند سے بوجھل آنکھیں بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسلتے یکایک سیدھے ہو بیٹھے تھے اور جلیس الحسن دیکھتے کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے سمندر میں یوں تیر رہی تھیں جیسے زندہ مچھلیوں کے گلپھڑوں کو چاک کر کے نکلے تالاب میں چھوڑ دیا گیا ہو۔
" کیسے خیال آ گیا آج؟"
" آپ..... نے..... بھیا اور بھابی کے سامنے..... سارا دوش مجھ پر ڈال دیا۔" اس نے شاکی لہجے میں کہا پھر بولی۔
" حالانکہ غلطی آپ کی بھی تھی۔"
جلیس الحسن زیر لب مسکرا دیے۔
اُس کا یہ کہنا کہ غلطی آپ کی بھی تھی اس کا محتاط اعتراف خطا تھا۔
گویا وہ تسلیم کر رہی تھی کہ غلطی اس کی بھی تھی۔

"میری تمہارے بھائی اور بھابی سے زیادہ بات ہی نہیں ہوئی۔"
"آپ نے یہ تو کہا کہ......"
"کہ کیا؟"
"کہ الفت یہ کہہ گئی ہے کہ مجھے آپ کے بچوں سے نفرت ہے اور میں اُن پر......" اُس نے ایک بار پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔
"ظلم کرتی ہوں۔" انھوں نے اُس کا جملہ مکمل کر دیا۔
"جی۔"
"ہاں یہ کہا ہے میں نے اُن سے۔" جلیس محسن نے اعتراف کیا پھر بولے۔ "اور میں نے غلط تو نہیں کہا...... کیا تم نے یہ بات نہیں کہی تھی؟"
"مگر آپ کو اُن لوگوں سے شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"
"کیونکہ وہ تمہارے قریب ترین متعلقین ہیں۔ انھیں پتا ہونا چاہیے کہ اصل قصہ کیا ہے؟"
"اور میں کس سے فریاد کروں؟ کس سے شکایت کروں ان زیادتیوں کی جو میرے ساتھ آپ کے گھر میں روا رکھی گئیں؟"
"مثلاً؟"
"اب کون کون سی زیادتی گنواؤں؟ اور گنوانے کا فائدہ بھی کیا؟ آپ نے پہلے کون سی میری شنوائی کی جو اب سُن لیں گے...! آپ کا حساب تو وہ ہے کہ ہم ہی قاتل ہم ہی مسیحا...... کوئی غیر جانبدار آدمی ہو تو اُسے بتایا بھی جائے...... آپ تو یہ کہہ دیں گے کہ ساری غلطی تمہاری ہی ہے؟"
"چلو کسی غیر جانبدار شخص کی خدمات حاصل کر کے فیصلہ کروا لیتے ہیں کہ غلطی کس کی ہے!"
"مجھے ہی کوئی پنچایت یا جرگہ نہیں بٹھوانا چاہتی۔"
"تو پھر فون کس لیے کیا ہے؟"
اُن کے اس سوال پر اُس کا ایسا جی اُمڈا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
پچھلے کچھ برسوں سے جلیس محسن سے اُس کا ایک ایسا رشتہ، ایسا تعلق تھا جس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے اس رشتے کی زنجیر اور تعلق کی ڈور میں بندھے مرد و زن ہی آشنا ہوتے ہیں۔
الفت کے ساتھ انھوں نے چار ماہ گزارے تھے۔
اُس کے دم سے اگر بہت سی تلخ یادیں وابستہ تھیں تو کچھ خوشگوار یادیں بھی منسوب تھیں۔
فون پر اُس کے رونے کی آواز سُن کر وہ مضطرب ہو گئے۔
"کیا ہوا؟"
"رو کیوں رہی ہو؟"
انھوں نے تڑپ کر یہ دو سوال کیے۔
پھر بڑی ملائمت سے بولے۔ "کچھ بتاؤ تو؟"
مگر وہ بتاتی کیسے!
آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا۔
حلق دُکھ رہا تھا۔
دل دُکھ کی بھاری صلیب تلے دبا تھا۔
"پلیز! رو تو مت۔" وہ منت سے بولے۔
مگر اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسو کہتے تھے کہ آج نہ تھمیں گے۔
"مجھے بتاؤ تو آخر بات کیا ہے؟"
"گھر میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟"
وہ کیسے بتاتی کہ اُس کا تو جیون ہی پلٹ ہو کے رہ گیا تھا۔
"دیکھو اگر تم نے رونا بند نہ کیا اور مجھے یہ نہ بتایا کہ رو کیوں رہی تھیں تو میں فون بند کر دوں گا۔" انھوں نے دھمکی آزمانے کی کوشش کی۔

سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان وقفے بتدریج بڑھنے لگے۔
جلیس محسن اُس کی سسکیاں تھم جانے کا انتظار کرتے ہوئے کبھی کھنکھار کر کبھی گہرا سانس کھینچتے ہوئے اور کبھی جمائی لے کر اُسے رابطہ برقرار رہ جانے کا یقین دلاتے رہے۔
جب وہ پُرسکون ہو گئی تب انھوں نے پھر کہا۔ "ہاں بھئی اب بتاؤ یہ رونا دھونا کس سبب سے تھا؟"
وہ بدستور خاموش رہی۔
"یار! تم عورتوں کے پاس ہتھیار بہت کارآمد اور آزمودہ ہیں...... ماں اولاد کو دودھ نہ بخشنے کی قسم دے کر ڈرا دیتی ہے۔ بہن بھائی کو اپنی قسم دے کر اُس سے ہر کام نکلوا لیتی ہے۔ بیوی اپنے شوہر کو رو کر سہا دیتی ہے۔"
چند پل کو دونوں طرف سناٹا سا چھا گیا پھر انھوں نے بڑے پریم سے کہا۔ "الفت!"
"جی!" وہ منمنائی۔
"روئیں کیوں اتنا؟"
"آپ نے دُکھ جو دیا۔"
"میں نے تمہیں یا تم نے مجھے؟"
"آپ نے مجھے۔"
"نہیں، تم نے مجھے۔"
دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو چکا تھا اور اب وہ خود کو بہت پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔
"کل آپ تہمینہ کی شادی میں کیوں نہیں آئے؟"
"کس نسبت سے آتا؟"
"کیا میری نسبت کافی نہیں تھی؟"
"تم تو راستے میں کانٹے بچھا گئی تھیں۔"
"آپ انھیں چُن کر راستہ صاف کرتے ہوئے آ سکتے تھے!"
"سوری! مجھے اپنی انگلیاں فگار کرنے کا شوق نہیں۔"
الفت کو اُن کی اس بات سے دھچکا سا پہنچا۔
گویا وہ اب تک وہیں ڈٹے کھڑے تھے۔
مگر الفت بھی فیصلہ کر چکی تھی کہ:
اگر دُکھ جھیلنا ہی ہے تو بے مقصد کیوں؟
اور اگر
اونچے نیچے سر بفلک پہاڑوں سے گھرے لق و دق چٹیل میدان میں دو ٹنے پھرنے کی سزا مقدر بن چکی تو پھر کیوں نہ جائے؟
کیوں نہ آدم کی نارسائی کو اسے العین ٹھہرا لیا جائے!
سو اُس نے کہا۔
"آج ولیمے میں آ جائیں گے؟"
"راستے میں کانٹے بچھے ہیں!"
"میں نے چُن لیے ہیں...... آپ آ کر تو دیکھیے راستہ صاف ملے گا!"
جلیس محسن سوچ میں پڑ گئے۔
الفت سے شادی کا فیصلہ تو انھوں نے تنہا کر لیا تھا۔ وہ اور بات تھی کہ سارے معاملات طے ہو جانے کے بعد انھوں نے بچوں کو بھی اعتماد میں لے لیا تھا۔
مگر اب الفت کو گھر واپس لے آنے کا فیصلہ وہ تنہا کرنے پر قادر نہ تھے۔
پہلے انھیں بچوں سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا تھا۔
الفت کے بھائی اور بھاوج کے آنے پر بچوں کی تشویش پچھلے جمعہ کی صبح سے کل شام تک برقرار رہی تھی۔
دعوت نامہ انھیں پڑھ کر ہوا بر آتے کے مشکی ستون کی آڑ میں دھرے جدید وضع کے خوبصورت گوشے دان میں

نظر آیا تھا اور وہ یقیناً چاروں بچوں میں سے کسی ایک کی حرکت تھی یا ملی بھگت تھی کیونکہ صفائی ستھرائی پر مامور ماجراں کی عادت سے تو وہ بخوبی واقف تھے کہ وہ کاغذ کا معمولی سے معمولی پرزہ بھی گھر والوں کو دکھا کر اطمینان کر لینے کے بعد ہی کوڑے دان میں ڈالتی تھی کہ وہ کام کا تو نہ تھا۔

کل شام جب وہ دفتر سے گھر واپس لوٹے تو بچوں کے چہروں پر گزشتہ کئی دن سے نظر آتی تشویش کا رنگ گہرا ہو چکا تھا۔ شام ڈھلے جب وہ تیار ہو کر لاؤنج میں پہنچے تو وہ چاروں پہلے انھیں پھر خاصی تشویش کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔

"بابا! آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟" نگین نے خاصی تشویش کے ساتھ پوچھا تھا۔

حالانکہ اگر بالفرض وہ کہیں جا بھی رہے تھے تو یہ کوئی غیر معمولی یا تشویش کی بات نہیں تھی۔

"جی بیٹے۔"

"کہاں؟"

"آپ بوجھیے کہاں؟" انھوں نے بچوں کو آزمانے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں بابا!" نگین دھیمے اور اداس لہجے میں بولی۔

پھر انھوں نے ایک ایک سے پوچھا اور ان میں سے ہر ایک نے مجھن کی طرح دھیمے سروں میں کہا تھا "پتا نہیں"

اور جب انھوں نے کہا "آج ہم سب چائنیز کھانے جا رہے ہیں"

تو وہ سب اچھل پڑے تھے۔

ان کی خوشی دیدنی تھی۔

چائنیز وہ پہلی مرتبہ نہیں جا رہے تھے۔ ان گنت مرتبہ گئے تھے مگر جیسی خوشی کا اظہار انھوں نے کل کیا تھا پہلے کبھی نہ کیا تھا۔

جلیس الحسن بہت تھکے کہ ان کی اس غیر معمولی مسرت کا سیاق و سباق نہ سمجھ سکتے۔

کل وہ چاروں ان کے ساتھ باہر جا کر اتنے خوش ہوئے تھے کہ اتنا خوش تو انھوں نے انھیں کبھی ان کی ماں کے زمانے میں بھی کسی موقع پر نہ دیکھا تھا

اس قسم کی صورتِ حال میں اعفت کو گھر واپس لانے کے لیے پہلے بچوں کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

"آئیں گے نا آپ؟" اعفت نے پھر پوچھا۔

"کوشش کروں گا۔"

"کوشش کروں گا نہیں، آپ کو وعدہ کرنا ہوگا۔" وہ بے حد لجاجت سے بولی۔

"شاید ایک دو روز کے لیے لاہور جانا پڑ جائے۔" انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"پلیز! آج نہیں کل چلے جائیے گا۔" وہ گڑگڑا کر رو دی۔ "ورنہ میں کل کی طرح آج بھی بہت تنہا محسوس کروں گی خود کو..... کل سب تھے سوائے آپ کے ..... میں خود کو بہت اکیلی اکیلی محسوس کرتی رہی ..... بولیں آئیں گے نا؟"

"ایک بات پوچھوں تم سے؟"

"جی؟"

"اتنا اصرار کیوں ہے؟"

وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیونکہ ..... شاید ..... شاید میں تھک گئی ہوں۔"

جلیس الحسن کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے۔

"او کے ..... آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ لیبر جو کہاں رہا ہے میرا مطلب ہے مجھے پہنچنا کہاں ہوگا؟"

"پہلے تو میں آ جائیے گا ان کے دن یہاں سے اکٹھے ہو کر جائیں گے وہاں ..... میں آپ کی منتظر رہوں گی۔"

"اینی تھنگ سپیشل فار دی اکیژن؟"

اس کے دل پر گھٹا سی برسنے لگی۔

وہ اس سے پوچھ رہے تھے کہ کیا اسے اس خصوصی موقع پر کسی چیز کی ضرورت تھی۔

گزری کل کے تصور نے اس کے دل کو تڑپا کے رکھ دیا۔

عظمت آپا اور فضیلت اپنے اپنے گھروں سے گلاب اور موتیا کے گندھے گجرے بالوں میں آراستہ کر کے آئی تھیں۔

بھائی کے لیے سہیا بطورِ خاص گجرا بنوا کر لائے تھے۔

کسی کو اس کا خیال نہ آیا تھا کہ وہ بھی تو سہاگن تھی!

کتنے یاد آئے تھے کل جلیس الحسن اسے کہ شام کو جب وہ اسے لے کر گھومنے پھرنے نکلتے تھے تو اس کے لیے طرحی بخشت اور چاہت سے گجرے خریدا کرتے تھے۔

اب جو انھوں نے پوچھا۔

"اینی تھنگ سپیشل فار دی اکیژن؟"

تو اسے گزری شام یاد آ گئی۔

جو بہت رنگین، بہت دلکش، بہت خوبصورت ہونے کے باوجود اسے بہت اداس محسوس ہوتی رہی تھی۔

"مجھے صرف آپ کی ضرورت ہے۔" اس کی آواز شدتِ جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔

"میں آؤں گا۔" انھوں نے کہا۔

اوہ!

جلیس الحسن سے بات کرنے کے بعد وہ کس قدر مطمئن اور پُرسکون محسوس کر رہی تھی خود کو!

جیسے سیاہ گھٹائیں دل کو ڈرا دینے کے بعد کہیں اور نکل گئی ہوں۔

جیسے اب وگیاہ رہگزار میں یک بہ یک رنگ برنگ پھولوں کے تختے کے تختے کھل اٹھے ہوں۔

مہیب اندھیارے میں کسی راہ گم کردہ کو قندیلِ نور انظر آ گیا ہو۔

یا حق کو بابا آدم کا سراغ مل گیا ہو۔

چہرے پر اطمینان و سکون کی خوشی لیے وہ ٹیلیفون سیٹ واپس رکھنے پاپا کی طرف مڑی تو بابا نے پوچھا

"صبح سویرے کس کو فون کرنے کی ضرورت پیش آگئی تھی بیٹی؟"

"آپ کے داماد کو بابا!"

"خیریت؟"

وہ ایک گہری سانس کھینچتی بابا کے قریب بیٹھ گئی۔

"بابا! جنگ میں کسی ایک فریق کو تو ہار ماننی ہی پڑتی ہے۔"

"تو تم نے ہار مان لی؟"

"یہی سمجھیے۔"

"مجھے خوشی ہوئی بیٹا۔"

اس نے چونک کر بابا کی طرف دیکھا

"میری ہار پر بابا؟" اس نے دھیمے سروں میں کہا۔

"تمہارے درست اور دانشمندانہ فیصلے پر۔"

"درست اور دانشمندانہ؟" وہ بے یقینی سے بولی

بابا مسکرائے، کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر دھیمے لہجے میں بولے۔ "بیٹا! عورت کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرد کے مقابلے میں بہت کمزور، بے بس اور بے زبان ہوتی ہے مگر میری ناقص رائے میں عورت کے پاس صبر اور خاموشی ایسے ہتھیار ہیں جن کو استعمال میں لا کر وہ اپنے گھر کی بے تاج ملکہ بن سکتی ہے۔" بابا نے توقف کیا پھر بولے "بیٹی! مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری راہ دشوار ہے۔ بہت پُرپیچ راستہ ہے۔ ایک بڑی آزمائش کا تم سامنا کر چکی ہو۔ آئندہ بھی آزمائش کے بہت سے موقعے آئیں گے۔ ہم ہوں نہ ہوں تم ثابت قدم رہنے کی کوشش کرنا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں بابا خدا آپ کو ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔"

"چلیے! ہم تو اب چراغِ سحری ہیں ..... ویسے سمجھانے کو تو چاہے تو تا قیامت کے بورہے سنوا لے ہم سے۔" بابا نے کہا "ہاں تو میں کہہ رہا تھا بہت سے نشیب و فراز آئیں گے تمہارے راستے میں، ہر موقع پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ..... بیٹی! شادی توڑ دو اور دو ڈالی کا دوسرا نام ہوتی ہے لیکن گر گر رہو یا پھر جان ہی سے گزر جاؤ ..... مجھے اس وقت عظیم رومی شہنشاہ مارکس

آریلیئس کا ایک قول یاد آرہا ہے، اُس نے کہا تھا خود غرضی کو الگ رکھو اور جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اس پر راضی اور شاکر رہو۔
الفت کے لیے یہ سمجھنا محال نہ تھا کہ بابا محتاط الفاظ میں اُس سے کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ یقیناً یہی کہ:
اُسے جلیس الحسن کے بچوں کو اپنا حریف نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی اُن سے خائف ہونے کی ضرورت ہے —
اُسے حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے اپنے مقدر پر شاکر ہو جانا چاہیے۔

"جانتی ہو بیٹی مارکس نے یہ بات کیوں کہی تھی؟"

"کیوں بابا؟"

"کیونکہ مارکس آریلیئس زندگی کی اس اہم حقیقت سے آشنا تھا کہ خوشی صرف اُن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو خود غرضی کو اپنی ذات سے علیحدہ رکھتے ہوئے اپنے اوپر حکومت کر سکتے ہیں۔" بابا نے گہری نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھا اور بولے
"تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"

"جی بابا۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔

تو یہ تھی اُس کے اُن گنت سنہرے خوابوں کی تعبیر جو وہ جلیس الحسن سے اپنی شادی ہونے سے پہلے دیکھا کرتی تھی! اور اب اُسے صبر اور خاموشی کے ساتھ بے چوں و چرا قبول کر لینے ہی میں عافیت تھی ورنہ بابا کے بکھر جانے کو ٹھیس پہنچنے اور دنیا کو باتیں بنانے اور ہنسنے کا مزید موقع ملنے، اور اُس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جانے کا احتمال تھا۔

حالات جیسے بھی تھے اُن سے سمجھوتا کر کے اگلی منزلوں سے صبر و رضا کے ساتھ گزرنے ہی میں عافیت تھی۔

اتنے دن سے وہ جلیس الحسن کے خلاف جن شکایتوں اور حکایتوں کا بوجھ دل پر لیے پھر رہی تھی وہ اُس کے دامن سے پھسل کر بابا کے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔

بابا دوا کی چائے پی چکے تھے۔ ٹرے اٹھا کر وہ اُن کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

....

اس روز جلیس الحسن نے دوپہر کا کھانا خلافِ معمول گھر پر بچوں کے ساتھ کھایا اور کھانے کے آخری مراحل میں انھوں نے نگین اور اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "آپ دونوں سے ایک مشورہ لینا ہے مجھے۔"

وہ دونوں ہی نہیں فراز اور زرین بھی چونک کر استفہامیہ نظروں سے اُن کی جانب دیکھنے لگے۔

وہ دھیرے سے کھنکھارے پھر انھوں نے کہا "مجھے معلوم ہے آپ کی دوسری ماں نے آپ کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ نہیں کیا اور اسی وجہ سے آپ لوگ انھیں پسند بھی نہیں کرتے...... میرا مطلب ہے کہ بہت زیادہ پسند نہیں کرتے لیکن... کبھی کبھی مصلحتاً ہمیں اُن لوگوں کے ساتھ بھی گزارا کرنا پڑتا ہے جو ہمیں اچھے نہیں لگتے...... میرا اور اُن کا اختلاف اسی بات پر ہوا کہ وہ آپ لوگوں کے ساتھ مناسب رویہ اختیار نہیں کر سکی تھیں......" انھوں نے اپنے مکالمے کا اہم ترین حصہ زبان سے نکالنے سے پہلے بچوں کے تاثرات سمجھنے کو توقف کیا اور اُن کے چہروں پر پھیلی سی ناگواری دیکھتے ہوئے کچھ بجھ کر بولے۔

"اب اگر وہ آپ لوگوں کے ساتھ مناسب رویہ اختیار کرنے اور آپ کا ہر ممکن خیال رکھنے کی شرط قبول کرتے ہوئے گھر واپس آنا چاہیں تو آپ کی کیا رائے ہے؟"

مخاطبین میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔

جلیس الحسن نے ان کی خاموشی کو اپنے موقف کی حمایت کے لیے بہترین وقت سمجھتے ہوئے مزید کہا۔ "نگی اور جاجی — بیٹے میں آپ دونوں کو یاد ہو گا کہ میں نے آپ کی دوسری ماں کے پہلی مرتبہ اس گھر میں آنے سے پہلے آپ لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ آپ چاروں کی خوشی اور طمانیت میری زندگی کی پہلی ترجیح رہے گی۔ میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں مگر آپ چاروں کو نہیں۔ آپ سے میرا وعدہ اب بھی برقرار ہے... میرے اس وعدے کا مکمل یقین کرتے ہوئے آپ مجھے کیا مشورہ دیں گے؟"

"بابا! ہم چاروں میں سے کوئی بچہ تو نہیں......" نگین کہتے کہتے رک گئی۔

"بہت نہیں کرتا" جلیس الحسن نے اُس کا ادھورا جملہ مکمل کیا پھر بولے "میں جانتا ہوں یہ بات بلکہ بہت اچھی طرح جانتا ہوں نگین بیٹا مسئلہ وہی ہے جو کہ پہلے تھا یعنی گھر میں ایک عورت کی ضرورت ہے!"

"بابا! کوئی بات نہیں نگی باجی تھوڑے دنوں میں اور بڑی ہو کر عورت بن جائیں گی۔" زرین نے کہا۔
اور اُس کی اس بات پر جلیس الحسن ہی نہیں نگین اور اعجاز بھی مسکرا دیے۔

"بیٹا! اس گھر کو ایک ماں کی ضرورت ہے۔"

"وہ تو نہیں بابا لیکن...... انھوں نے کیا کیا" اعجاز تلخی سے بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یار۔" وہ قدرے بے تکلفی سے ہموار کرنے کی کوشش میں بولے "مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک اور موقع دے دینے میں کوئی حرج نہیں۔"

"بابا! اُن کے جانے کے بعد سب کچھ اتنا اچھا اور ٹھیک ٹھاک تو چل رہا ہے پھر ایسے موقع دینے کی اور کیا ضرورت ہے؟" نگین نے ناگواری سے کہا۔

"تم بھی ٹھیک کہتی ہو۔ واقعی اُن کے جانے کے بعد سے سب کچھ بہت اچھا اور ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے مگر بیٹے میں کھل کر بات کروں تو بات یہ ہے کہ آج نہیں تو کل جب آپ لوگوں کی شادی بیاہ کے مراحل آئیں گے تو ایک ماں یا عورت کی سرپرستی لازمی ہو گی۔"

"بابا!" نگین نے خفگی بھری نگاہوں سے انھیں دیکھتے ہوئے کہا "کیا جن کی مائیں نہیں ہوتیں اُن کی شادی نہیں ہوتی؟"

"اور کون سی وہ ہماری سگی ماں ہیں۔" اعجاز نے گرہ لگائی۔

جلیس الحسن سمجھ گئے کہ بے خوف ماحول کے پروردہ اور شہر کے بہترین انگریزی تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم بچوں سے نمٹنا چنداں کارِ آسان نہیں۔

چنانچہ انھوں نے قصے کو طول دینے کے بجائے مختصر کرتے ہوئے کہا "مجھے آپ لوگوں کی حمایت سے سو فیصد اتفاق ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ انھیں ایک چانس اور دینے میں کوئی مضائقہ نہیں!" وہ رک کر پھر بولے "جب بابا آپ کی بات سے اتفاق کر لیتے ہیں تو بیٹے جی بابا کی ایک بات سے آپ لوگوں کو بھی اتفاق کر لینا چاہیے......اور یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر اب کی بار اس عورت نے گڑبڑ کی تو پھر اس گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"

نگین اور اعجاز نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا پھر اعجاز نے کہا "پرومس؟"

"بالکل پکی بات۔"

"پھر کبھی تو نہیں آئیں گی وہ یہاں؟" اعجاز کا انداز مشروط تھا۔

"کبھی نہیں۔"

"آل رائٹ ڈیڈی۔" اعجاز نے شانے اچکاتے ہوئے کہا "دے کر دیکھ لیں ایک اور موقع۔"

"ٹھیک ہو...... تھینک یو مائی سن۔" اور انھوں نے نگین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "تم تو ہمیشہ بھائی کا ساتھ دیتی ہو۔" پھر وہ فراز اور زرین کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولے "اور ان دونوں کا ووٹ تو تم دونوں ہی کے ساتھ ہو گا۔"

ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ اہم ترین مسئلہ کتنی آسانی کے ساتھ حل ہو جائے گا اور وہ الفت کی گھر واپسی کے سلسلے میں بچوں کی جانب سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں اتنی جلدی کامیاب ہو جائیں گے۔

ولیمے کی شام وہ سراپا انتظار بن گئی۔
اگرچہ جلیس الحسن نے اُس سے آنے کا وعدہ تو کیا تھا۔
مگر دل کو دھڑکا سا لگا تھا کہ
خدا جانے وہ وعدہ نبھائیں گے بھی یا نہیں!
آئیں گے یا دغا دے جائیں گے!
اُن کے اس وعدے کی بابت اُس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔
امی اور بابا کو بھی نہیں جنھیں اُس نے اپنی شکست خوردگی کی خبر پہلے سنا دی تھی۔
اس ضمن میں رازداری برتنے کا سبب یہ تھا کہ

وہ اُن کے نہ آنے کی صورت میں دوسروں کے سامنے خفت اور پشیمانی نہ اٹھانا چاہتی تھی۔
اور اُن کے آنے کی صورت میں دوسروں کا ردِعمل دیکھنا چاہتی تھی۔
اُسے میکے بیٹھے جو تھا بیٹا ہونے کو آیا تھا اور اس دوران اُس نے لوگوں کو اتنے رنگ بدلتے اور روپ دھارتے دیکھا تھا کہ خود اپنی ذات بھی اُسے بے بھرم محسوس ہونے لگی تھی۔
اوروں کا تو شکوہ کیا، سگے بھائی بہنوں کے رُخ بدل گئے تھے!
عظمت آپا جن کے لیے مناسب بر کے انتظار میں خود اُس کے کئی سنہری سال سُلوا گئے تھے اور وہ کبھی اس سلسلے میں حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی تھی جن کی ایک آواز پر وہ "یور موسٹ اوبیڈیئنٹ میڈ" بن جایا کرتی تھی جن سے اسے اتنی محبت تھی کہ شاید اگر کبھی انھوں نے جان بھی مانگی ہوتی تو اس نے دریغ نہ کیا ہوتا۔
جن کی شادی کے بعد بھی وہ دائے، درمے، سخنے اُن کے کام آنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہا کرتی تھی۔ اُن کے بچوں کی پیدائش، اُن کے دکھ سکھ، اُن کی ملاقتیں، تہواریاں، سالگرہیں، عقیقے، اسکول میں داخلے کی تیاری، داخلہ ٹیسٹ، ماہانہ ٹیسٹ، ششماہی اور سالانہ امتحانات، یونیفارم کی سلائی۔ غرض کون سا موقع تھا جب اُس نے آپا کی مدد اور معاونت سے انکار کیا ہو۔
مئی جون کی تپتی دوپہر میں بھی اگر وہ اکھڑی ہوئی کہہ دیتی کہ ذرا شاپنگ کے لیے بازار چلنا ہے تو وہ گرمی، دھوپ اور اپنی تھکن بھول کر اُسی دم اُن کے ساتھ جانے کو اُٹھ کھڑی ہوتی تھی اور گھنٹوں اُن کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔
جب اُن کے بڑے لڑکے عدنان کو یرقان ہوا اور وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ اسپتال میں داخل رہا تو اُن کی ساس، نندیں، جٹھانی اور دیورانیاں تو کھڑے کھڑے منہ دکھانے اسپتال آیا کرتی تھیں۔ وہ تو بھی جو اس موقع پہ پتا چلا کہ اس طرح کام آنی یعنی کہ عظمت آپا کی جگہ کوئی احسان اشتہا ان بند کی ہوتی تو ساری زندگی اس کا یہ احسان نہ بھولتی۔
اس موقع پر دن رات ایک کر دیا کرتی تھی۔ چھٹی کے بعد گھر جانے کے بجائے اسپتال چلی جاتی اور صبح وہیں سے اسکول جایا کرتی تھی۔ ایک دو نہیں مسلسل گیارہ راتیں اس نے پلک جھپکائے بنا عدنان کے سرہانے بیٹھ کر گزاری تھیں۔ عظمت آپا کو بھیج دیتے کہ گھر بیٹھی تھی کہ آپ دولہا بھائی اور دوسرے بچوں کا خیال رکھیے۔ عدنان کی دیکھ بھال کو میں ہوں اس کے پاس۔
شروع شروع تو ڈاکٹر اور نرسیں، دوسرے مریض اور اُن کے ورثا یہی سمجھا کرتے تھے کہ عدنان کی ماں وہی تھی۔
پھر جب سب کو پتا چلا کہ وہ ماں نہیں خالہ تھی تو سب کہتے تھے: "تبھی شاباش ہے خالہ ہو تو ایسی جان نثار اور بے غرض!"
عدنان کا یرقان کے شدید حملے سے بچ جانا اگر ایک معجزہ تھا تو شاباش الفت کو بھی تھی کہ اُس نے بھانجے کی دیکھ بھال میں دن کو دن سمجھا تھا نہ رات کو رات۔
اور ایک عدنان کی بیماری ہی کا کیا ذکر بہت سے موقعے ایسے آئے تھے جب وہ انتہائی بے غرضی سے عظمت آپا کے کام آئی تھی۔

مگر جب اس کا موقع آیا تو سوا شروع کے چند دنوں کے عظمت آپا نے اس کی غمگساری کی ویسی کوشش نہیں کی جیسی کہ اُن کا حق بنتا تھا بلکہ بعض اوقات تو وہ کچھ بیزاری کا اظہار کرنے لگی تھیں۔
فضیلت کی شادی کے موقع پر بالخصوص اُن کا رویہ بہت اہانت آمیز ہو گیا تھا۔
فضیلت کے ساتھ حسنِ سلوک میں اُس نے کون سی کسر چھوڑی تھی۔ ماں کی شادی میں جس جوش و خروش سے حصہ لیا، جس محنت اور خلوص کے ساتھ اُس کے جہیز کی تیاری میں مدد و معاون رہی، اُسے دیکھ کر اپنے پرائے سب ہی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔
"کمال ہے بیٹی نہیں ہوتا ایسی کہ ذرا اس بات کا ملال نہیں دکھائی دیتا الفت کے چہرے پر کہ مجھ سے چھوٹی بہن پہلے اپنے گھر کی ہو رہی ہے۔"
سب ہی نے اُس کی اس خوبی کا اعتراف کیا تھا اور سراہا تھا۔
اپنے حصے کا زیور تک اُس نے فضیلت کو دے ڈالا تھا۔
ایمان کی بات تھی، امی نے تو کہا تھا: "ارے الفت بیٹی! یہ تو تمہارے لیے رکھا ہے۔"
مگر اُس نے بڑی بے غرضی سے کہہ دیا تھا: "امی! اس وقت فضیلت کا پہلا حق ہے کیونکہ وہ اپنے گھر جا رہی ہے۔ ذرا خود غرضی جو دکھائی ہو اُس نے۔"

یا ملال ظاہر ہونے دیا ہو۔
شادی میں ایسے بڑھ چڑھ کر خوشی کا اظہار کیا کہ خاندان کی وہ ساری بڑی بوڑھیاں جو اپنے تجرباتِ زندگی کی بنا پر سوچے بیٹھی تھیں کہ چھوٹی بہن کی پہلی شادی ہو جانے کا الفت پر بڑا نفسیاتی اثر پڑے گا، دانتوں میں انگلیاں دبا کر بیٹھ گئیں۔
پھر فضیلت کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش پر جس چاہت سے اُس نے چھوچھک تیار کروانے میں حصہ لیا، اُسے دیکھ کر تو بعض بڑی بوڑھیاں بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔
"اے ہے، ذرا افسوس دکھائی نہیں دیتا الفت کے چہرے پر اس بات کا کہ میری چھوٹی بہن تو ماں بننے والی ہے اور میں ابھی ماں باپ کے گھر ہی بیٹھی ہوں۔"
الفت کے کانوں تک جب ایسی باتیں پہنچتیں تو وہ ہنس دیتی۔
"تو بھلا یہ بھی کوئی ملال کی بات ہے...... اپنی اپنی قسمت ہے بھئی!"
جب فضیلت کے میاں نیا مکان خریدنے لگے اور ۳۵ ہزار روپوں کی کمی پڑی تو بابا اور بھیا دونوں یہ رقم دینے کو تیار تھے مگر اُن سے پہلے اُس نے ۳۵ ہزار کا چیک لکھ کر فضیلت کے حوالے کر دیا تھا۔ اگرچہ اس نے لاکھ کہا کہ بابا سے لے لیں گے، بھیا سے لے لیں گے مگر اُس نے بڑی محبت سے فضیلت کو سمجھایا۔
"دیکھو! بابا کو سرٹیفکیٹ کیش کرانا پڑیں گے جبکہ بھیا اور بھابی اپنی بچت پلاٹ کی صورت میں رکھتے ہیں، انھیں بازار میں بیچنا پڑے گا جبکہ میرے پاس رقم بینک میں پڑی ہے۔ تم یہ چیک بینک میں جمع کروا دو اور یہ نہ سوچنا کہ میں دے رہی ہوں تو کوئی وقت...... میں تمہاری بہن ہوں کوئی غیر تو نہیں جو تم تکلف برت رہی ہو۔ بہنیں ہی بہنوں کے کام آتی ہیں۔ کبھی مجھے ضرورت ہے تو کل مجھے ہوگی، تم سے ہی لوں گی کسی غیر سے تھوڑی مانگنے جاؤں گی!"
اگرچہ نیا مکان فروخت ہوتے ہی فضیلت نے سب سے پہلے الفت ہی کے پیسے واپس کیے تھے مگر وقت پر پوری محبت اور بے غرضی سے تو الفت ہی سب سے آگے تھی کام آنے والوں میں۔
اور بھی
اور بھی بہت سے موقعے تھے جب اُس نے عظمت آپا کی طرح فضیلت کے سلسلے میں بھی محبت اور خلوص کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا کہا اُس کی بہن ہونے کا حق ادا کیا تھا۔

لیکن جب اُس کی باری آئی۔
جب اُس پر افتاد پڑی۔
تو فضیلت نے چھوٹی ہونے کے باوجود بھی اُسے کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ باتیں سنا دینے سے گریز نہیں کیا۔
عظمت آپا اور فضیلت دونوں کو بس اپنی اپنی پڑی تھی۔
الفت کے میکے آ بیٹھنے کی خبر کو اپنے شوہروں اور سسرالیوں سے چھپائے رکھنے کی کوشش میں وہ یوں ہلکان ہوتی جاتی تھیں جیسے خدانخواستہ وہ کوئی بڑا کام کر آئی تھی۔ یا اس دنیا کی پہلی لڑکی تھی جو میاں کے گھر سے خفا ہو کر میکے آ بیٹھی تھی۔
عظمت آپا اور فضیلت سے قطع نظر بھیا، بھابی، وہ اُن کے بچوں کے لیے بھی جو کچھ تھی تو اس کے بھتیجے ہی وہ کب سے سمجھ رہی تھی!
بھاوج کو ہمیشہ بہنوں کی طرح چاہا۔ جو چیز اپنے لیے پسند کی اُن کے لیے بھی ضرور لائی۔ اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلایا۔ اپنی گرہ سے خرچ کر کے انھیں پہنایا اور خوش ہوئی۔
بھتیجیوں کی کون سی فرمائش تھی جو پوری نہ کی ہو۔ رات گیارہ بجے بھی اگر انھوں نے کہہ دیا کہ پھپو جی! فلاں چیز چاہیے تو ان کی فرمائش پوری کرنے کو پاپیادہ نکل جایا کرتی تھی۔
رہے بھیا تو وہ اُن کے لیے تو ہر لمحہ اپنی آخری سانس تک بھی دینے کو تیار رہا کرتی تھی۔ وہ گھر سے نکلتے تو دعا دے کر نے پڑھ کے چپ سے اُن کے پیچھے روانہ کر دیتی اور جب بخیریت گھر لوٹ آتے تو شکرانے کے نفل پڑھا کرتی۔
اپنی جمع پونجی تک تو خیر اُس نے بھائی بھتیجیوں سے زیادہ بڑھ کر اہمیت دینے کی کبھی موہوم سی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اُس نے تو کبھی خود غرضی دکھانے کی کوشش نہیں کی۔
لیکن جب اُس پر آزمائش کا وقت آیا تو بھابی نے جو دن کے اجالوں میں بہت مہربان، مشفق اور ہمدرد نظر آتی تھیں، رات کی تیرگی میں بڑے کھردرے پن سے کہہ دیا!

"الفت سے یہ اندیشے ہاں تو کرلی تھی مگر اوّل دن سے اُس کا نباہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

اور یہ کہ:

"سوچا تھا تہنیت اپنے گھر چلی جائے گی تو اُس کا کمرہ ارشد اور مجد کے لیے سیٹ کردوں گی، بے چارے بچوں کو ڈرائنگ روم میں سونا پڑتا ہے۔ مگر الفت تمنی گوائی واپس آگئیں اور مجھے تو اب واپس جاتی تک نہیں۔ کنوار پن کا لیبل اُترنا تھا سو اُتر گیا اب یہیں راج کریں گی۔ سچ کہتی ہوں ذرا جو ملال دیکھا ہو میں نے الفت کے چہرے پر اس بات کا کہ میاں کو چھوڑ کے میکے میں بیٹھی ہوں۔"

یہ تو بہت قریبی لوگوں کے بدلے ہوئے رنگ تھے۔

ورنہ گھاؤ تو اور بھی بہت سے کھائے تھے دل نے گزشتہ چند ماہ کے دوران۔

وہ تن تنہا تھی۔

اور تیر ہر سمت سے برسائے گئے تھے۔

بالآخر وہ ادھ مری ہو کر گر پڑی تھی۔

اور تب اُس نے بہت ایمانداری سے سوچا تھا کہ تنہی و تنہا اس سے کہیں کم ذہنیت برداشت کر کے تو وہ اس میدان کی فاتح قرار پا سکتی تھی جہاں سے بددل ہو کر وہ میدان چھوڑ بھاگی تھی۔

اذیت کے انہی لمحوں میں اُس نے لبِ دیوار بیٹھے شکست خوردہ تیمور کی طرح اپنے مورچے پر لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شام ڈھلتے ہی وہ سراپا انتظار بن گئی تھی۔

جوں جوں تہنیت کے ولیمے میں جانے والے مہمان گھر میں جمع ہوتے گئے اُس کے دل پر بیتابی سی طاری ہوتی چلی گئی۔

"خدا جانے وہ آئیں گے بھی یا نہیں؟" وہ سہم کر بار بار سوچتی۔

"اگر نہ آئے تو!" بار بار یہ خدشہ اُس کے ذہن میں سر اُٹھاتا۔

ہر آہٹ پر، ہر گاڑی کے ہارن پر اُس کے کان کھڑے ہو جاتے۔

"کہیں وہی نہ ہوں!" دل سرگوشی کرتا۔

وہ انتظار کرتی رہی۔

کرتی رہی

یہاں تک کہ انتظار ماند پڑنے لگا۔ اور "چلو بھئی بہت دیر ہو گئی!" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

کار نشین کاروں میں اور بے کار بچتے بچتے فقتوں سے آراستہ کوسٹر میں بیٹھنے لگے۔

عظمت آپا اپنی گاڑی میں اپنے دولہا کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھیں۔ ان کی ساس اور بچے پچھلی نشست پر تھے۔

فضیلت اپنی کوسی میں اپنے میاں کے ساتھ اگلی نشست پر براجمان تھی جبکہ پچھلی نشست پر اُس کی نند اور بچے تھے۔ بھیا کے ساتھ اگلی نشست پر بابا بیٹھے تھے۔ پچھلی نشست پر بھابی، امی اور دونوں بچے۔

الفت سے کسی نے نہ پوچھا کہ وہ کونسی گاڑی میں بیٹھنے جا رہی ہے۔

ساری خواتین ہار گجروں سے لدی پھندی تھیں۔ اس کے حصے میں بھی ایک گجرا آیا تھا مگر اس طور کہ بھابی نے کہا

"الفت یہ ایک گجرا بچا ہے تم اپنے جوڑے میں لپیٹ لو۔"

اُس نے بھابی سے گجرا لے تو لیا تھا مگر اپنے بالوں میں آراستہ کرنے کے بجائے امی کی ہزار نہ اور تردد کے باوجود اُن کے بالوں میں آراستہ کر دیا تھا کہ اُس کے خیال میں امی کے بالوں میں اُسے زیادہ سجنا تھا آخر کو وہ ابھی سہاگن تھیں اور بابا کے ساتھ اُن کی ازدواجی زندگی قابلِ رشک تھی۔

وہ بھیا کی گاڑی کے پیچھے کھڑی کوسٹر میں بیٹھ چکی تھی اور کھڑکی سے سر ٹکائے اس ہجوم رنگ و بو میں بھی خود کو یکسر تنہا محسوس کرتے ہوئے انتہائی دل گرفتہ ہو رہی تھی کہ کھڑکی کے شیشے پر دستک نے اُسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

اُس نے دیکھا، اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

ذرا دیر کو تو اُسے حقیقت پر کسی خواب کا سا گمان گزرا۔

جلیس الحسن نے دغا نہیں دی تھی۔

وعدہ نبھایا تھا۔

وہ آ گئے تھے۔

اور اب کتنا قریب کوسٹر کی بند کھڑکی کے اُس پار بہت نزدیک کھڑے تھے۔

اُس نے بے اختیار کھڑکی کھول دی۔

"میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں اور تم یہاں بیٹھی ہو!" انہوں نے کہا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بیساختہ وہ چپل پہنتی وہ اُٹھی اور بے حد عجلت میں کوسٹر کے دروازے کی طرف لپکی۔

"الفت آپا! کوسٹر کا دروازہ تو بند کرتی جائیے!" نہ جانے کس نے کہا مگر اس وقت اُسے کسی اور کی بات پر توجہ دینے کی فرصت کہاں تھی۔

اور ذرا سی دیر میں یہاں سے وہاں تک ایک شور سا مچ گیا۔

"الفی کے دولہا آ گئے!"

"جلیس الحسن آ گئے!"

"جلیس صاحب آ گئے!"

"جلیس میاں آ گئے!"

"جلیس بھائی آ گئے!"

گاڑیوں میں بیٹھے بٹھائے لوگ گاڑیوں سے نکل آئے۔

امی، بابا، نانی اماں، چچا جان، چچی جان، بڑی پھوپی جان، چھوٹی پھپو، چھوٹے پھوپا، بھیا، بھابی، عظمت آپا، اُن کے دولہا، فضیلت، اُس کے میاں اور نہ جانے کون کون!

ان سب نے جلیس الحسن کے اور اُس کے گرد گھیرا سا ڈال دیا تھا۔

اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دو والیمہ ہونے جا رہی ہو۔

بالکل آخری لمحوں میں!

وہ خود کو معتبر محسوس کر رہی تھی۔

اور معتبر وہ تھی بھی!

اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے اپنی کھوئی عزت کے لیے ایک معتبر حوالہ مل گیا ہو۔

جگمگاتی روشنیوں کے سحر انگیز اجالوں میں وہ آپ اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

امی اور بابا مطمئن اور مسرور ہی نہیں بلکہ خود اس کی طرح مغرور نظر آ رہے تھے۔

اور ہر نگاہ میں جدا کیفیت تھی۔

کہیں استعجاب تھا

کہیں رشک

کوئی نگاہ بے یقینی میں ڈوبی دکھائی دیتی تھی۔

کوئی حیرانی میں

ہر نگاہ میں ایک سوال تھا!

"جلیس الحسن اچانک کیونکر آ گئے؟"

اس سوال کا جواب فقط الفت ہی دے سکتی تھی۔

وہی جانتی تھی کہ جلیس الحسن کو وہاں بلا کر اُن کے حوالے سے خود کو معتبر، مغرور، سربلند و سرخرو قرار دینے کی خاطر اسے اپنی انا کو سولی پر لٹکانا پڑا تھا۔ اس نے اس عورت کو جو ہر عورت کی طرح اپنے لیے خوشیوں کے پالنے جھولنا چاہتی تھی، ہمیشہ کے لیے مار ڈالا تھا۔

"آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی جلیس میاں۔" بابا نے رسمی علیک سلیک کے بعد کہا: "آپ کی شرکت سے تقریب کی رونق دوبالا محسوس ہوگی۔ اچھا آپ سے تفصیلی باتیں تو تقریب کے دوران رہیں گی۔ دیر ہو رہی ہے آپ ہم لوگ بیٹھے، گاڑی میں بیٹھیے۔"

"جی بہتر۔" وہ بولے پھر انہوں نے الفت سے کہا۔ "چلیں جناب۔"

وہ ان کی محبت میں اُن کی مسکراتے ہوئے اپنی کار کی طرف چل دی۔

اس کے لیے کار کا دروازہ انھوں نے خود وا کیا۔ پھر گاڑی کے اگلے دائیں دروازے سے اس کے برابر میں آ بیٹھنے کے بعد بولے: "یہاں سے روانگی کتنی دیر بعد ہے؟"

"بس بیٹھ رہے ہیں لوگ گاڑیوں میں۔"

"اپنے ساتھ بٹھانا ہے کیا کسی کو؟"

"نہیں۔" اس نے بلا تامل کہا۔

مگر اس لیے نہیں کہ وہ کسی کے لیے اپنے دل میں گنجائش نہ پاتی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ان سے ملاپ کے ان لمحوں میں کسی اور کو اُن کے اور اپنے مابین حائل نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔

وہ زیرِ لب مسکراتے اس کی طرف مڑ کر ترچھے ہو بیٹھے۔

"کیسی ہو؟" انھوں نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

خدا جانے کیوں اس کا جی بھر آیا۔

لبوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔

اور وہ ایک دم ہی بے حد جذباتی ہو گئی۔

وہ اس کی کیفیت تاڑ گئے۔

اس کے ذرا سا اور نزدیک ہوتے ہوئے انھوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے یوں لگا جیسے یک بیک وہ کسی پناہ گاہ میں آ گئی ہو۔

"بولو کیسی ہو؟" انھوں نے پھر پوچھا۔

"آپ کی بلا سے کوئی مرے یا جیے۔"

"خیر جی تو تم رہی ہو اور میرے اطمینان کے لیے یہ بات بہت کافی ہے۔"

"اتنی دیر سے کیوں آئے آپ؟"

"تاکہ تم اعتراف کر سکو کہ میں تمہارے لیے اہم ہوں۔"

"وہ تو ہر مرد اپنی عورت کے لیے ہوا کرتا ہے۔"

"واقعی!" وہ چونک کر بولے۔

شاید وہ اعتراف تھا جو ناصحہ نے اُن کے ساتھ اپنی اٹھارہ سالہ رفاقت میں ایک بار بھی اس قدر کھلے دل سے نہ کیا تھا۔

"ہاں!" اس نے دھیرے سے کہا۔

مرد عورت سے اور چاہتا ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ وہ اس کی بڑائی اس کی اہمیت کو تسلیم کر لے۔

"اتنے پیاری سی سوٹ ہے نا جو تم نے ماسٹر سے سلوایا ہے؟"

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"بچیوں کے کپڑے لینے گیا تھا تو مجھے ہینگروں میں لٹکے تمہارے چار دس جوڑے دکھا کر کہنے لگا: بیگم صاحبہ کے کپڑے بالکل تیار ہیں اگر وہ کسی بیٹی یا نوکر کے ہاتھ ڈیلیوری کروانے کی غرض سے مجھے یہ ہدایت نہ کر گئی ہوتیں تو میں ابھی اسی وقت آپ کے ساتھ کر دیتا۔" وہ ہنستے پھر بولے: "کیوں منع کرائی تھیں جی تم اسے؟"

"تاکہ آپ کو پتا نہ چلے!"

"یہ سوچا تھا کہ پھر کبھی کہ ایسی باتیں کتنے دن چھپائی جا سکتی ہیں!"

وہ ایک ٹھنڈی سی سانس بھر کے رہ گئی۔

یہ بات وہ اس سے کہہ رہے تھے!

اس سے!

جو پل صراط کا سفر طے کر آئی تھی۔

"گھر کیسا ہے؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"تمہاری بلا سے بنے یا بگڑے۔" انھوں نے بالکل اسی کے لہجے میں کہا۔

"پلیز! اب کبھی..... کبھی مت کہیے گا ایسی بات۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ کوئی بھی عورت اپنا گھر بگاڑنا نہیں چاہتی۔"

"گڈ!" وہ اُسے توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"بس اب چل دیے ہیں لوگ۔" وہ ونڈ اسکرین کے اس پار آگے کھڑی گاڑیوں کو دھیرے دھیرے حرکت میں آتے دیکھ کر بولی۔

جلیل الحسن سیدھے ہو بیٹھے اور انھوں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

کوسٹر میں بیٹھی شوخ و شنگ لڑکیوں نے جن بجھی ہوں بجانا اور گیت گانا شروع کر دیے تھے۔

کچھ دیر بعد جب یہ پُر مسرت قافلہ شہر کی روشن سڑکوں سے گزرنے لگا تو انھوں نے گردن ہی ذرا رخ گھما کر ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا اور بولے: "تم نے اپنے گھر کا حال تو پوچھ لیا گھر والوں کا نہیں پوچھا؟"

چند لمحوں کو تو وہ سکتے میں رہ گئی۔

اس کے دل میں ایک جوار بھاٹا لہرا اٹھی۔

اور اُسے یوں لگا جیسے یہ تند لہر بہت سے ان تمام کچے بندوں کو بہا کر لے جائے گی جو اس نے پچھلی نصف شب سے آج شام تک باندھے تھے۔

لیکن پھر اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بڑے تحمل سے پوچھا: "کیسے ہیں سب؟"

"سب کون؟"

"ہمارے بچے!"

اب گویا اُن کی باری تھی۔

چند لمحوں کو تو اُن پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

اُن کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایک ہی جست میں وہ تمام کٹھن منازل عبور کر جائے گی جنھیں وہ مرحلے وار طے کروانا چاہ رہے تھے۔

اس نے تو انھیں ابھی وہ کڑوی سچائی سنانے کی مہلت بھی نہ دی جو ناصحہ کی تمام بچوں ہی سے متعلق تھیں۔ "ہمارے بچے" کہہ کر اس نے گلے شکوے تمام جھگڑوں پر خاک ڈال دی تھی۔

کچھ دیر کو وہ دونوں ہی چپ ہو رہے۔

پھر انھوں نے کہا: "کیا میں یقین کر سکتا ہوں کہ تم میرے بچوں کو قبول کرنے، ان کی ان بچے جیسی کسی قسم کا تامل نہیں دکھاؤ گی؟"

لحظہ بھر میں اس پر قیامت سی گزر گئی!

نہ جانے کتنے پل صراط طے کر گئی وہ!!

پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا: "وہ اب میرے بچے ہیں۔"

"وہ نالائق اور بدتمیز بچے!" جلیل الحسن نے طنز کیا۔

"اگر تعلقات کی استواری مطلوب ہے تو براہ کرم طنز کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔" وہ قدرے تلخی سے بولی۔

"آل رائٹ۔" وہ زیرِ لب مسکرائے پھر بولے: "مگر ایک بات ضرور پوچھوں گا تم سے!"

"جی پوچھیے۔"

"یہ انقلاب عظیم کیوں اور کیسے؟"

اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر ونڈ اسکرین کے اس پار عروس البلاد کی پُرہجوم سڑکوں پر رنگ برنگی روشنیوں سے نظریں چار کرتے ہوئے بولی: "آپ نے یقیناً یہ بات سنی ہو گی کہ زمانہ بہت بڑا معلم ہے۔" اس نے پل بھر کو خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا: "ویسے بابا نے مجھے آج صبح بڑا خوبصورت بات سنائی۔"

"ذرا ہمیں بھی تو سنا دو۔"

"بابا نے رومی شہنشاہ مارکس آریلیس کا ایک قول مجھے سنایا کہ وہ کہتا تھا خوشی صرف ان لوگوں کو حاصل ہوا کرتی ہے جو اپنے اوپر حکومت کرنا جانتے ہیں۔"

"ہر ڈیس!"

"ہیلو ڈیس!"

"پاپا سے تو ہم وعدہ لے چکے ہیں کہ اگر اب کی بار اس نے گڑبڑ کی تو اس گھر کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"

"بہت جلد پاپا ..... بہت جلد ایسا ہوگا۔ ہم سب مل کر انھیں ایسا نچائیں گے کہ یہ خود گھر چھوڑ کر بھاگیں گی۔" نگین نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"ان شاء اللہ" اعجاز نے کہا۔

"اب مجھے تم سے کہیں زیادہ نفرت محسوس ہونے لگی ہے اس عورت سے ..... پاپا کو ہم سے کتنا دور کر دیا تھا اس نے ہم سے۔"

"اب سیٹ ہو جائیں گے۔"

"ہم نہیں ہونے دیں گے ..... بلکہ اب اس وقت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاید پاپا سونے سے پہلے اوپر آئیں، جاؤ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں بھی ذرا آرام کر کے اپنے کمرے میں جاتی ہوں۔"

"اوکے ..... گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔"

کچھ دیر بعد اُن کی توقع کے عین مطابق جلیس الحسن نے اوپر کا چکر لگایا۔ اگرچہ اعجاز اور نگین دونوں ہی جاگ رہے تھے مگر اُن کے کمروں کے بند دروازوں اور کھڑکیوں سے چھن کر باہر آتے موہوم اجالے، دروازے سے سائے نے انھیں اُن کے خوابیدہ ہونے کا تاثر دیا۔

"خدا جانے نسیم الفت کو گھر میں دیکھ کر ان چاروں کا کیا ردِ عمل ہوگا!" یہ سوچتے ہوئے انھوں نے نیچے کا رُخ کیا اور

عین اسی لمحے تریر میں منزل ہی اُن کی خواب گاہ میں اپنے دونوں بازو پھیلائے بستر کی طرح گھومتی الفت یک بیک شانانہ طرز سے سہری پر چت جا پڑی۔

"ہوم سویٹ ہوم!" اُس نے ایک پُراطمینان سانس کھینچتے ہوئے چھت پر نگاہیں ٹکا دیں۔

"کتنا ترسی ہوں میں ان در و دیوار کو!" اس خیال کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے۔ پھر اس نے خود کلامی کے انداز میں زیر لب کہا "کتنی خوش ہوں میں یہاں واپس آ کر!" اور آنکھیں یوں موند لیں جیسے اطراف میں پھیلے منظر کو ہمیشہ کے لیے آنکھوں میں سمیٹ لینا چاہتی ہو۔

لیکن بھاری قدموں کی آہٹ نے اُسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

وہ اُٹھ بیٹھی۔

"بچے تو سو چکے!" وہ اس کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے بولے۔

الفت کے دل میں ایک شوریدہ سر لہر اٹھی۔

"پھر بھی!" اُس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے۔

دل آمادۂ بغاوت ہونے لگا۔

مگر اُسے پاپا کی بات یاد آئی:

"خوشی انھی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اوپر حکومت کرنا جانتے ہیں۔"

تو گویا

اب الفت ہوا پر اپنے جذبات پر حکومت کرنا تھی۔

جلیس الحسن اُس کے روبرو آ ٹھہرے۔

ملگجی شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس اس وجیہہ اور پُر وقار مرد کو دیکھتے ہوئے الفت نے جی ہی جی میں سوچا:

"کیسی بے وقوف تھی وہ عورت جو اس مرد کو چھوڑ گئی!"

"اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟" وہ مسکرا کر بولے۔

اس نے محجوب ہو کر نگاہیں جھکا لیں۔

وہ اُس کے نزدیک بیٹھ گئے۔

اور اُسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لیتے ہوئے بولے "کیا تم مجھے مِس کر رہی تھیں؟"

"بہت ...!" اُس نے اعتراف میں تامل سے کام نہیں لیا۔

پھر اُس نے اپنی جھکی ہوئی نگاہیں اٹھائیں۔

"کیا آپ نے مِس کیا مجھے؟"

"بہت زیادہ جاناں!"

اُن کی قربت کا احساس اُسے ایک عجیب سی سرشاری دینے لگا۔

اُس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔

اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آج ہی بیاہ کر اس گھر میں آئی ہو۔

"وہ باتیں سن لو گی میری؟" وہ آہستہ سے بولے۔

"جی!"

"میرے بچے آج بھی مجھے اتنے ہی عزیز ہیں جتنے کل تھے۔ میں آج بھی تم سے وہی درخواست کروں گا جو کل کی تھی۔" انھوں نے دو پل کو توقف کیا پھر بولے: "ان سے غلطیاں کل بھی سرزد ہوتی تھیں، آج بھی ہوں گی اور آئندہ بھی۔ انھیں تمہاری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اُن کی سرکشیوں اور کوتاہیوں پر ایک ماں کی حیثیت سے ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کرو گی تو تمہارے رویے میں تلخی نہیں آئے گی اور تم خود کو میرے دل پر حکومت کرتا پاؤ گی جاناں جو تم کل مجھے چھوڑ گئی تھیں۔"

ذرا دیر کو تو اُسے ملال نے آ گھیرا۔

عجیب تھے وہ بھی!

ایک پل مائل بہ کرم

اور اگلے پل مائل بہ جفا۔

کیا بگڑ جاتا ان کا اگر وہ قرب اور وصال کے ان جذباتی لمحوں میں پھر اسی موضوع پر گفتگو نہ کرتے۔

مگر وہ پچھلے راستوں پر اتنے دکھ اور اذیتیں بھگت آئی تھی کہ یہ دکھ پچھلے راستوں پر جھیلے گئے دکھوں اور اذیتوں کے مقابلے میں کہیں کم تر لگ رہا تھا۔

"کیا میں ان لمحوں کا اعتبار کر سکتا ہوں الفت؟" وہ ویسے ہی دھیمے سُروں میں بولے۔

"جی!" اُس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم نے اسکول جوائن کر لیا تھا؟" اُن کے لہجے میں استفہامیہ کیفیت تھی۔

اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بولی "آپ کو کس نے بتایا؟"

"ایک روز میں نے جناح روڈ سے گزرتے ہوئے تمہیں ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کی عمارت سے نکلتے دیکھا تھا۔"

"تو ..... وہ آپ رُکے کیوں نہیں!" وہ شاکی لہجے میں بولی۔

"یقین جو نہیں تھا!"

"یقین!" اُس نے تذبذب کے عالم میں کہا "کس بات کا؟"

"کہ تم عام کم پرست عورتوں سے مختلف ثابت ہوگی اور اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچا لے جاؤ گی!"

شدتِ جذبات سے الفت کے لبوں پر ہلکی سی تھرتھراہٹ طاری ہو گئی۔

انھیں کیسے بتاتی کہ وہ کتنا مشکل راستہ طے کر کے دوبارہ ان کی طرف لوٹی تھی۔

اس کی جذباتی کیفیت کا اندازہ کرنا ان کے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔

اُسے سینے سے لگا دینے کو وہ اُس کے اور نزدیک ہو گئے۔

اوپر نگین اور اعجاز اپنے اپنے کمرے میں جاگ رہے تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

الفت کا دوبارہ گھر لوٹ آنا انھیں بُری طرح کھل رہا تھا۔

"مجھ سے اگر بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا۔" اعجاز نے سوچا۔

"پاپا نہ لاتے انہیں تو اچھا تھا۔" نگین سوچ رہی تھی۔

اعجاز مضطرب ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھا اور اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "ایک تو تم کو پتا نہیں کیا پڑی تھی امریکا جانے کی۔ ہم سب یہاں کتنی تو بہت خوش تھے۔"

"سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو چل رہا تھا خواہ مخواہ پاپا لے آئے انہیں۔ ہم ان کے بغیر کتنے خوش تھے۔" نگین آزردہ ہو کر سوچ رہی تھی۔

اعجاز بستر سے اٹھا اس نے اپنے پیروں میں چپل ڈالے اور آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا۔

اپنے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک سنتے ہی نگین کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اٹھ بیٹھی۔ دستک دوبارہ سنائی دی۔

وہ ننگے پاؤں چلتی دروازے تک پہنچی اور اس نے دروازے سے کان لگا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں۔"

یہ آواز تو وہ لاکھوں کروڑوں صداؤں کے ہجوم میں پہچان سکتی تھی۔

اس نے جھٹ دروازہ کھول دیا اور اعجاز اندر آ گیا۔

"کیا بات ہے جو جی؟" اس نے اعجاز کو خاصی تشویش سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نیند نہیں آ رہی۔"

"ہاں مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔"

اعجاز آگے بڑھا اور کھڑکی کے نزدیک بڑے دیوان پر بیٹھ گیا۔

نگین نے سائیڈ بورڈ پر دھری خشک میوے کی پلیٹ اٹھائی اور اعجاز کے قریب آ بیٹھی۔

"لو کھاؤ۔" اس نے پلیٹ اعجاز کے سامنے چھوٹی میز پر رکھ دی۔

"تم بھی تو لو۔"

"نیند کیوں نہیں آ رہی تمہیں؟" نگین نے پوچھا۔

"پتا نہیں بس مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے اس عورت کا گھر آنا۔"

"فکر مت کرو۔ واپس آنے کا خوب اچھی طرح مزہ چکھا دیں گے انہیں۔"

"ایک تو پاپا نہ جانے کیوں لے آئے؟"

"پاپا تو ہم لوگوں سے پوچھنے کے بعد ہی لائے ہیں۔"

"ہمارے پاس ہاں کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔" اعجاز نے ناگواری سے کہا۔

"بہرحال اب تو وہ آ چکی ہیں۔"

"صبح ہم لوگ ناشتے پر نیچے نہیں جائیں گے۔"

"کیوں؟"

"تاکہ پاپا کو پتہ چلے کہ ہم خوش نہیں ہیں ان کے واپس آنے سے۔ ہم پروٹسٹ کر رہے ہیں۔"

"کیا فرق پڑے گا ہمارے نیچے نہ جانے سے؟ میں تم سے شرط لگا سکتی ہوں کہ ہمارے نیچے نہ جانے پر وہ ہی باتیں ہوں گی یا تو پاپا اور مما آئیں گے اور ہمیں منا کر نیچے لے جائیں گے یا پھر ناشتہ اوپر بھجوا دیں گے۔"

"تو پھر..... کیا کیا جائے؟" اعجاز مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

"میری سمجھ میں تو بس ایک ہی بات آئی ہے۔"

"وہ کیا؟" اعجاز ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

"نئی نئی ترکیبوں پر ترکیبیں سوچتے جاؤ انہیں پریشان کرنے کی یہاں تک کہ وہ پریشان ہو کر گھر چھوڑ جائیں۔ پھر پاپا نے وعدہ تو کر ہی رکھا ہے ہم سے کہ وہ ان پر گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیں گے۔"

"تو اس کا مطلب ہے صبح ناشتے کے لیے نیچے جانا ہو گا؟"

"بالکل جانا ہے..... اب ہم بچوں کی طرح دب کر بس اوپر ہی نہیں رہیں گے بلکہ پورے گھر میں گھومیں پھریں گے۔ گھر ہمارے پاپا کا ہے۔"

"ہاں گھر تو ہمارے پاپا کا ہے۔" اعجاز نے کہا پھر منہ بنا کر بولا۔ "تمہیں یاد ہے کھانے کی میز پر کتنا شور ہوا تھا۔ ذہنی نہیں ہوا!"

"مجھے سب یاد ہے۔"

"اونہہ! آنٹی جیسے ڈیئر وومن۔" اعجاز نے تمسخر کا لفظ سے اپنی نفرت کا ایک بار پھر واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔

"صبح اسکول بھی جانا ہے۔ جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔"

"یار نیند آ ہی نہیں رہی۔"

"کوشش کرو گے تو آ جائے گی۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب کیا ہو گا!"

"کہا تو ہے میں نے تم سے کہ ہم اتنا عاجز کر دیں گے کہ یہ بھاگ جائیں گی۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔"

"لیکن ایک بات سنو تم میری۔"

"بولو۔"

"تم غصہ بہت نہیں کرو گے..... یہ جو تمہارا غصہ ہے نا یہی کبھی کبھی کام بگاڑ دیتا ہے۔ پتا ہے دوسروں کو عاجز کرنے کے لیے آدمی کو اپنے غصے پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ غصہ بہت کرتے ہیں وہ دوسروں کو کم جلاتے ہیں خود کو زیادہ۔" نگین نے پیار سے بھائی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "سمجھے نا تم میری بات؟"

"کچھ کچھ۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"اچھا اب جاؤ۔"

"او کے..... گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔"

اگلی صبح جب زرین جاگی تو نگین نے اس پر جھک کر اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ "اٹھو چھوٹی۔"

"باجی! پاپا آ گئے تھے رات کو؟"

"بہت دیر سے۔"

"کیوں؟"

"تمہاری ماما کو لینے گئے تھے۔"

"آں۔" زرین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "کیا آ گئیں؟"

"ہاں۔"

"اوں۔" زرین نے منہ بسورا۔

"لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب مل کر انہیں تنگ کریں گے تاکہ بس۔"

نگین ہنس دی۔

"میں نے تمہیں ان کے گھر آنے کی خبر اس لیے سنائی ہے تاکہ جب تم نیچے جاؤ تو انہیں دیکھ کر پریشان نہ ہو جاؤ!"

فراز کو یہ خبر اعجاز نے سنائی۔

نیچے جانے سے پہلے نگین نے سربراہ کار کے فرائض انجام دیتے ہوئے چھوٹے بہن بھائیوں کو چند ضروری ہدایات جاری کیں۔

حسب معمول جب وہ ڈائننگ لاؤنج میں داخل ہوئے تو ان کی گردنیں تنی ہوئی تھیں اور وہ چاروں زبردستی مسکرانے کی کوشش میں اپنی شکلیں بگاڑے ہوئے تھے۔

"گڈ مارننگ پاپا۔" ان میں سے ہر ایک نے کہا۔

اور ناشتے کی میز پر الفت کی موجودگی کو کاملاً نظرانداز کرنے کی کوشش کرتے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔

"گڈ مارننگ بچو!" طلعت حسن نے گہری نگاہوں سے ان کے چہروں کے تاثرات اور حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

الفت نے دزدیدہ نگاہوں سے ان کے خودسرانہ انداز دیکھے۔

اُن کی گزشتہ بدسلوکیوں کا خیال اُن کے خلاف دل میں نفرت کی ایک سرد لہر کو جنم دینے کا باعث بنا۔
انسانی فطرت کے عین مطابق وہ اپنی ساری خطائیں اور کوتاہیاں بھول گئی۔
اُسے تو بس یہی خیال آیا کہ
یہ وہ نالائق اور بدتہذیب بچے تھے جن کی وجہ سے اُسے چار ماہ کے نگ بھگ ایک کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔

اُس کی سانسیں بوجھل ہو گئیں۔
اور اُسے یوں لگا جیسے نفرت کی وہ سرد لہر اُس کے سینے کی تمام پہتیں چیرتی ناشتے کی میز پر ہی بہہ نکلے گی۔
صدیوں کا سفر اُس کے دل نے لمحوں میں طے کیا۔
بالآخر وہ جلیس کے بچوں کے خلاف اپنے دل میں اٹھنے والی ہر کو جوں توں دبانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔
"گڈ مارننگ بچو!" اُس نے ایک نئے راستے پر پہلا قدم رکھتے ہوئے کہا۔
وہ چاروں چونکے۔
انھوں نے باپ کی طرف دیکھا۔
پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔
اور یوں انجان بن گئے جیسے ہوا میں کوئی سرگوشی کرتی گزر گئی تھیں۔
جلیس الحسن نے چاہا کہ انھیں تنبیہہ کریں۔
لیکن پھر انھوں نے کسی سمجھدار بھلائی کے مشورے کے بغیر ہی اُلفت اور بچوں کو اپنے معاملات بغیر کسی مداخلت کے باہم نمٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔
اُن کا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط وہ اس بحث میں اُلجھنا نہ چاہتے تھے۔
وہ تو اپنے تئیں فقط اتنا جانتے تھے کہ:
اپنے اور بچوں کے اعتماد کو متزلزل نہ ہونے دینے اور انھیں اپنے خلاف کسی بدگمانی میں مبتلا ہونے دینے کا بہترین اور محفوظ ترین راستہ اُن کے پاس یہی تھا کہ وہ خود کو اُلفت اور بچوں کے باہمی قضیے سے لاتعلق رکھیں اور پھر...... کبھی تو ممکن تھا کہ ...... اُلفت کا یہ روپ عارضی ہو!
ناشتے کے دوران وہ چاروں ایک دوسرے سے اور جلیس الحسن سے تو باتیں کرتے رہے مگر اُلفت کو انھوں نے قطعی نظر انداز کیے رکھا۔
اُس نے زرتاش کو توس پر مکھن اور جام لگا کر دیا تو اُس نے ایک طرف رکھتے ہوئے نگین سے کہا "نگی باجی! پلیز مجھے بٹر اور جام لگا دیں مجھے توس پر"
"بیٹے! آپ کو ماما نے تو لگا کر دیا ہے" جلیس الحسن نہ چاہتے ہوئے بھی مداخلت کرنے پر مجبور ہو گئے۔
"تھینک یو بابا...... نگی باجی زیادہ اچھا لگاتی ہیں"
اعجاز اور نگین ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔
پھر نگین زیرِ لب مسکراتے ہوئے زرتاش کے لیے دوسرے توس پر مکھن اور جام لگانے لگی۔
اور احساسِ توہین سے اُلفت کے کانوں کی لوئیں تک جلنے لگیں۔
اس کا جی چاہا کہ زرتاش سے کہے "کیوں میں نے توس پر بٹر اور جام کے بجائے زہر لگا دیا ہے کیا؟"
یا پھر
ناشتا ادھورا ہی چھوڑ کر اٹھ جائے۔
مگر وہ بابا کی نصیحت کا پلو تھامے صبر و استقلال کے ساتھ بیٹھی رہی۔
بابا نے کہا تھا:
"عورت کے پاس صبر اور خاموشی ایسے ہتھیار ہیں جن کو استعمال میں لا کر وہ اپنے گھر کی سلطنت کی بے تاج ملکہ بن سکتی ہے"
وہ ہارنے کے لیے نہیں فتح حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔
اسکول کے لیے روانہ ہوتے وقت بھی اُن چاروں نے جلیس الحسن کو باری باری خدا حافظ کہا اور ناشتے کی میز پر اُلفت کو جس بُری طرح نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی وہی بے رخی اسکول جاتے وقت بھی برتنے کی کوشش کی۔
مگر اُن کی اس بے اتفاقی کے باوجود اُلفت نے انھیں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر خدا حافظ کہا۔
گو "گڈ مارننگ" کی طرح جواب آنے "خدا حافظ" کا بھی نہیں ملا۔
لیکن پھر بھی وہ کوٹھی کے صدر دروازے سے گاڑی کے نکل جانے تک اپنا ہاتھ ہلاتی رہی۔
جب وہ پلٹی تو اُس کی آنکھیں یک بیک بھیگ گئیں۔
جلیس الحسن نے اپنا بازو اُس کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے کہا "تھینک یو ویری مچ اُلفت!"
پھر وہ ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بوجھل آواز میں بولے "مجھے اُمید ہے کہ تم میری مجبوریوں اور دقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو گی"
مزاحمت کی ایک شوریدہ سر لہر نے اس پرستانہ پاکیزگی کی کیفیت طاری کر دی۔
اُس کے جی میں تو آیا اُن کا گریبان پکڑ کر اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھے کہ یہ کیسی مجبوری ہے اور کیسی دقت ہے کہ آپ اپنے بچوں کو میرے ساتھ اہانت آمیز رویہ اختیار کرنے پر ٹوک بھی نہ پائے۔
مگر وہ آنسو پینے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔
جلیس الحسن کے دفتر جانے کے بعد وہ گھر کی خیر خبر لینے نکلی تو ماجراں کچن کی صفائی میں مصروف تھی۔ ماں سے اُلفت کی صبح سویرے اس وقت ملاقات ہو چکی تھی جب وہ جلیس الحسن کے ساتھ چہل قدمی کے لیے برآمدے کی طرف جا رہی تھی۔
اس وقت تو وہ فقط سلام ہی دعا کر سکی تھی۔ گھر کے ملازموں پر جلیس الحسن کا رعب داب کچھ ایسا تھا کہ وہ اُن کی موجودگی میں اپنی زبان زیادہ نہ کھولتے تھے۔
اب جو ماجراں نے اُلفت کو تنہا اور فراغت میں پایا تو اپنا کام روک کر کھڑی ہو گئی اور اپنے مخصوص لہجے میں خوشامدانہ انداز میں بولی "بسم اللہ بیگم صیب بسم اللہ...... سچ پوچھتی ہوں جی بیت کوں تو بہوں خوشی ہوئی ہے آپ کو دیکھ کر"
"اچھا" اُلفت مسکرا دی "تم کیسی ہو؟"
"شکر ہے مولا کا!" ماجراں دونوں ہاتھ باندھ کر بولی۔
"بچے وچے ٹھیک ٹھاک ہیں؟"
"بالکل"
"کام ٹھیک چل رہا ہے"
"بیگم صیب جی! بس دیکھ لو آپ۔ ہم تو خادم لوگ ہیں جی"
"میاں تو تمہارا سودا سلف لینے چلا گیا ہے شاید"
"ہاں جی"
اُلفت نے کچن کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد کچن سے باہر نکلنے کے لیے دروازے کا رُخ کیا تو ماجراں بولی "بیگم صیب جی! سچی بولتی ہوں بیت کوں تو آپ کے جانے کا بہوتی افسوس ہوا تھا جی"
"اب لو آگئی ہوں"
"شکر ہے مولا کا" ماجراں منہ چھت کی طرف اور ہاتھ دعا کی صورت اٹھا کر بولی پھر اُس نے منہ بنا کر شکایتی انداز میں کہا "لیکن بچے" اُس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے اور دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے اپنی ناک کے بانسے پر تین مرتبہ لکیریں کھینچنے کے بعد چٹاچٹ اپنے رخسار پیٹتے ہوئے بولی "اللہ میری توبہ! اتنے خوش تھے اتنے خوش کہ بس آپ کو بول نہیں سکتی"
اُس کا یہ انکشاف اُلفت کے لیے کوئی اچنبھے والی بات نہ تھی۔
"اور بیگم صیب! روتا تھوں نے صیب جی کے ساتھ باہر گھومن پھرن واسطے جا خوب غلیلیں دکھیں - نہ کھا کرتا...... اللہ میری توبہ!" اُس نے پھر کانوں کو ہاتھ لگائے "بہوتی بدتمیز بچے تھے"
"ماجراں!" اُلفت نے قدرے ناگواری سے ماجراں کو دیکھتے ہوئے تنبیہی تیوروں کے ساتھ کہا "آئندہ تم بچوں کو بُرا نہیں کہو گی"

اجیان ہکا بکا ہو کر اُس کی صورت دیکھنے لگی۔
یہ وہ کیا کہہ رہی تھی!
وہ!
جو اجیان سے بچوں کی نس نس گن لیا کرتی تھی۔
جلیس الحسن اور اُن کی پہلی بیوی کے بارے میں استفسار کرتی رہا کرتی تھی۔
اور اس کے عوض کبھی اُسے پیٹ بھر کر کھانا ملتا، وہ کبھی مٹھی گرم کر کے نوازتی رہتی تھی۔
"سیکھیں!" اُس نے کڑے تیوروں سے کہا۔
"جی بیگم صاحب!" اجیان کان پکڑنے کے بجائے کان کھجانے لگی۔
اور جب الفت کچن سے باہر نکل گئی تو اجیان نے کشمکش کے عالم میں اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا: "بے لوگوں کا کبھی کچھ معلوم نہیں ہو۔"
زیریں منزل کا ایک تفصیلی چکر لگانے کے بعد اُس نے بالائی منزل کا رُخ کیا۔
بچوں کی عدم موجودگی میں اوپر جاتے ہوئے اُس کے دل پر پہلے کی طرح پھر خفت طاری ہونے لگی۔ جیسے اُس نے دل کو جھٹکا۔
"یہ تو میرا اپنا گھر ہے۔ بھلا کوئی ڈرتا ہے؟"
اُس کے قدم اعتماد کے ساتھ اُٹھنے لگے۔
اوپر پہنچنے کے بعد اُس نے اعجاز کے کمرے میں جھانکا۔
خدایا!
کس قدر بکھرا پڑا تھا اُس کا کمرہ۔
یہاں تکیہ
وہاں چادر
ادھر کتابیں
اُدھر کپڑے
کشن قالین پر
چپل مسہری پر
سارا کمرہ یوں تتر بتر پڑا تھا جیسے مکین کمرہ رات بھر چیزوں کو اُلٹنے پلٹنے اور پٹخنے میں مصروف رہا ہو۔
خیر رات بھر تو نہیں۔
صبح اسکول جانے سے پہلے الفت کو ناشتے کی میز پر دیکھ کر اعجاز پر ہیجانی کیفیت البتہ طاری ہوئی تھی اور سارا کمرہ اُلٹ پلٹ گیا تھا۔
الفت کا شوقِ تجسس اُسے کشاں کشاں اعجاز کی مسہری کے سرہانے تک لے گیا۔ مسہری پر بچھی چادر کو پلٹا تو عاصمہ کی فریم شدہ تصویر چھوڑ وہاں رکھی دیکھی۔
اُس نے عاصمہ کی ہنستی مسکراتی تصویر کو شدید نفرت سے گھورتے ہوئے جی ہی جی میں کہا: "اے عورت! تو گئی تھی تو اپنے ان بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہوتی جو میرے لیے سوہانِ روح بنے رہتے ہیں اور اینٹھے ہوئے ہیں!"
پھر اس نے تصویر کو اُس کی جگہ واپس رکھا، مسہری پر بچھی چادر سے اُسے حسبِ سابق ڈھانپا اور مسہری پر پڑی چپل کو ناگواری سے پیچھے پھینکتی کمرے سے باہر نکل آئی۔
اعجاز کے کمرے سے نکلنے کے بعد اُس نے نگین اور زرین کے مشترکہ کمرے کا رُخ کیا۔
اعجاز کے کمرے کی نسبت اُن کا کمرہ بہت صاف ستھرا تھا اور ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ پر رکھی تھی۔
مسہری کے سرہانے سُنہرے فریم میں جڑی آبی رنگوں میں بنی ایک تصویر دھری تھی۔ فریم کے قریب ہی گلاب کا ایک پھول رکھا ہوا تھا۔
گو یہ تصویر مصوّر کی نوآموزی کی زبانِ حال سے گواہی دے رہی تھی تاہم الفت دیکھ کر یہ اندازہ کر سکتی تھی کہ مصوّر نے جلیس الحسن کی تصویر بنانے کی کوشش کی تھی اور جلیس الحسن کے چاہنے والوں نے اُسے سُنہرے فریم میں لگا...

" لڑکے نے اُن سے اپنی محبت کا ثبوت دینے کی کوشش کی تھی۔
تصویر کے انتہائی دائیں کونے میں حسبِ روایت مصوّر کا نام خاصے فنکارانہ انداز میں رقم تھا۔ اگر نہ بھی ہوتا تو الفت بہرحال جانتی تھی کہ اس گھر میں بس ایک ہی مصوّر تھا۔
اور وہ تھا
جلیس الحسن کا چھوٹا بیٹا فراز!
فراز کا کمرہ بھی الفت کو ٹھیک ٹھاک ہی لگا۔
تھوڑی بہت صفائی درکار تھی تو اجیان کچن کی صفائی سے نمٹنے کے بعد حسبِ معمول اوپر آنے والی تھی۔
فراز کے کمرے کے در و دیوار پہلے بھی تصویروں سے مزین رہتے تھے اور اب بھی تھے۔
البتہ تصاویر کی تعداد میں پہلے کی نسبت اضافہ ہو چکا تھا۔ بعض پرانی تصاویر کی جگہ نئی تصاویر نے لے لی تھی۔
جلیس الحسن کی کئی تصویریں کمرے کے در و دیوار پر آراستہ تھیں۔
کمرے میں موجود ڈرائنگ ٹیبل البتہ قدرے انتشار کا شکار نظر آتی تھی۔
میز پر رنگین پنسلیں، مارکرز، آبی رنگ، چھوٹے بڑے برش اور سادہ ڈرائنگ شیٹیں موجود تھیں۔
میز پر کئی مکمل اور نامکمل تصویریں بھی موجود تھیں۔
میز کی درازوں میں بھی بہت سی مکمل اور نامکمل تصویریں رکھی تھیں۔
الفت کرسی پر بیٹھ کر وہ تصویریں دیکھنے لگی۔
زیادہ تر تو کارٹون ہی تھے۔
ان میں سے بیشتر وُوڈی وُوڈ پیکر اور مکی ماؤس کے کارٹون تھے۔
چند لینڈ اسکیپ تھے۔
اور متعدد پورٹریٹ۔
قائداعظم، علامہ اقبال، سر سید احمد خان، شاہ فیصل شہید، ملکہ الزبتھ، ہیلن کیلر اور فلورنس نائٹ انگیل کی شبیہیں۔
اعجاز، نگین اور زرین کی قلمی اور آبی شبیہیں بھی تھیں اور ان کے کارٹون بھی جن کی ہنستی مسکراتی لکیروں سے مصوّر سے ان کی گہری چاہت کی غماز تھیں۔
میز کی نچلی دراز سے کئی چند تصویریں برآمد ہوئیں۔
بڑے سائز کے لفافے میں سے جلیس الحسن اور عاصمہ کی ایک قلمی تصویر برآمد ہوئی جو زبانِ حال سے مصوّر کے اس انہماک کی گواہی دے رہی تھی جس کی بنا پر یہ تصویر مصوّر کی بقیہ تمام تخلیقات کے مقابلے میں بہترین نظر آتی تھی۔
اسی دراز سے الفت کو چند تخلیقات "اسٹیپ مدر" یعنی سوتیلی ماں کی سرخی کے ساتھ ملیں۔
کسی میں سوتیلی ماں کو لنگڑی دکھایا گیا تھا۔
کسی میں بھینگی۔
کہیں وہ جادوگرنی کے روپ میں دکھائی گئی تھی۔
کہیں چڑیل کے روپ میں۔
کسی میں اس کے دانت بڑے بڑے اور نکیلے تھے۔
کسی میں ناک طوطے کی چونچ کی طرح نکیلی اور لمبی۔
ایک تصویر میں دیوہیکل سوتیلی ماں ایک بچی کو اپنے لمبے اور نکیلے مہیب دانتوں کے درمیان دبائے کھڑی تھی۔ ایک لڑکی کو اپنی دائیں مٹھی میں اور ایک لڑکے کو بائیں ہاتھ میں دبوچ رکھا تھا۔ اس کے کنارے اور مٹھیوں سے خون بہہ رہا تھا اور ایک چھوٹا سا لڑکا اس کے سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔
دیوہیکل سوتیلی ماں کے منہ اور مٹھیوں میں دبے ہوئے بچوں کے منہ سے "مدد! مدد!" کے الفاظ نکلتے دکھائے گئے تھے جبکہ اس کو گھورتے ہوئے چھوٹے سے لڑکے کو یہ کہتے دکھایا گیا تھا۔
"ظالم جادوگرنی! میں اپنے بڑے بھائی اور بہنوں کو تجھ سے چھڑانے اور تیرا خاتمہ کرنے آیا ہوں!"

اس جھوٹے سے لڑکے کے تاثرات تلخ تھے انداز میں فراز نے اپنا نام بطور مصور لکھا تھا۔
"سوتیلی ماں" کے عنوان سے موسوم یہ تصویر بطور مصور کی اس گہری نفرت کی غماز تھیں جو وہ سوتیلی ماں کے خلاف اپنے دل میں رکھتا تھا۔
بابت بخوبی سمجھ سکتی تھی کہ فراز نے یہ تصویر جو اپنی سوتیلی ماں کے خلاف نفرت کے اظہار کے لیے بنائی تھیں تو فراز کی سوتیلی ماں وہ خود ہی تو تھی۔
اس نے جیسا چاہا ان تصویروں کو ان کی جگہ پر دھرتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا "نکلی تو ہوں پر جلیس احسان کی بیوی ہونے کے ناتے فراست اور محبت کے راستے پر گامزن شاید بہرا تو ان جگر بھی ان کے دلوں سے اس نفرت کو نکال دیں جو کرر وہ مصنف خلاف اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔"

دوپہر کو الفت نے دوپہر کا کھانا حسب سابق بچوں کی گھر واپسی سے قبل ہی با اپنے کمرے میں کھانے کی روایت برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی۔
بلکہ جب وہ چاروں اپنے اسکول اور کالج سے لوٹنے، کپڑے بدلنے اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد کھانے کے لیے ڈائننگ لاؤنج میں آئے تو وہ بھی ڈائننگ لاؤنج میں چلی آئی۔
"سلام علیکم۔" اس نے اپنے اوپر مکمل جبر کی کیفیت طاری کرتے ہوئے بظاہر بڑی مسانیت اور ملائمت سے کہا۔
سلام کا اسے ان چاروں میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔
بلکہ جب اس نے دزدیدہ نظروں سے ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو یا نشوں نگینوں اور پیار کے چہروں پر ناگواری دیکھی۔
چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
پھر یک بیک اٹھا اپنی جگہ سے اٹھا اور کرسی الٹنے کے بعد تیزی سے ڈائننگ لاؤنج سے واک آؤٹ کر گیا۔
پھر زینے کے زینے سے اس کی غصے میں ڈوبی آواز نیچے پہنچی۔
اس نے خانساماں کو حکم دیا۔
"غلام محمد میرے لیے کھانا اوپر بھیجو۔"
پھر یکے بعد دیگرے وہ تینوں بھی میز پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
نگین نے لاؤنج کے باہر راہداری میں صدا لگائی "غلام محمد ہم سب کے لیے اوپر کھانا لے آؤ!"
کھانے کی میز پر الفت تنہا رہ گئی۔
آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آنے کو تھے کہ خانساماں غلام محمد لپکا ہوا ڈائننگ لاؤنج میں آیا اور اس نے الفت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا جی بیگم صاحب؟"
"غلام محمد! بچوں کو کھانا اوپر پہنچا دو۔" اس نے آنسو پیتے ہوئے بظاہر انتہائی تحمل سے جواب دیا۔
اور خود کھانا کھائے بنا میز سے اٹھ گئی۔
شدت رنج اور احساس توہین سے اس کا رواں رواں لرز رہا تھا۔
سہ پہر کو بابا نے فون کیا اور حال چال دریافت کیا۔
بابا کے بعد امی سے بات ہوئی۔
"بیٹی میں تو صبح سے بے چین تھی تم سے بات کرنے کو مگر یہ کمبخت فون خراب ہوا پڑا تھا۔" امی نے کہا پھر فون پر رازداری سے بولیں "سب ٹھیک تو رہا؟"
"جی امی!"
"جلیس میاں نے زیادہ تیں پانچ تو نہیں کی تمہارے ساتھ؟"
"نہیں امی!" اس نے کہا اور ان کو مزید اطمینان دلانے کے لیے ہنس دی۔
"تھوڑی بہت طعن و تشنیع تو ضرور کی ہوگی یہ تو سارے مردوں کی عادت ہوتی ہے!"
"اچھا! بیٹی کو اس کے میاں کے خلاف ورغلا رہی ہو!" فون پر بابا کی آواز سنائی دی۔
"نہیں امی! کوئی طعن و تشنیع نہیں۔"

"یہ تو خیر دستور کہا ہو گا کہ بس رہ لیں اماں بابا کے گھر۔۔۔۔ آخر کو تھک ہار کر آنا ہی پڑا!"
"بالکل نہیں امی!"
"بیٹی کیا کہہ رہی ہے بچہ ہماری؟" فون پر کہیں بابا کی آواز سنائی دی۔
"کہہ رہی ہے کچھ نہیں کہا جلیس الحسن نے!" امی نے بابا کو بتایا پھر بولیں "مجھے تو حیرت ہو رہی ہے اور یقین نہیں آ رہا!"
"یقین کر لیجیے کیونکہ آپ کا داماد آپ کے تصور جتنا کٹر نہیں ہے!"
"اب ان بڑے آئے خاکسار کہیں کے!"

وہ فون پر بھی امی اور بابا کی نوک جھونک سن کر مسکرا دی۔
"اور جلیس کے بچے؟ ان کے کیا تیور رہے؟"
اس کا جی چاہا۔
امی سے بڑھ کر اس کا ہمدرد اور غمگسار کون ہو سکتا تھا!
جی میں آیا صبح سے دوپہر تک کا جملہ احوال انہیں سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر ڈالے۔
لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا؟
یہ تو طے تھا کہ حالات جیسے بھی تھے اب اسے ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ جیسے تیسے گزارہ بہرحال کرنا تھا۔
امی کو بتا دینے کا ایک نقصان البتہ ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ بھائی اور بہنوں سے ذکر ضرور کرتیں پھر نہ جانے کتنی باتیں بنتیں اور کیا کیا قیاس آرائیاں ہوتیں۔
چنانچہ بچوں کے رویے کی بابت امی کے استفسار پر اس نے کہا "سب بالکل ٹھیک ٹھاک ویسے ہی خوش ہیں امی!"
"چلو خدا کا شکر ہے کہ تم بھی خیر سے اپنے گھر کی ہو گئیں!"
"ہو سکتا ہے شام کو چکر لگاؤں آپ کے پاس!"
"جم جم آؤ بیٹی۔۔۔۔۔ اور یہ تو خبر ہے ناتمہیں کہ کل چوتھی ہے؟"
"تہنیت نے فون نہیں کیا؟"
"دوپہر کو آئے تھے دونوں میں کھڑے کھڑے۔ فون ٹھیک نہ تھا ورنہ تم سے ضرور بات کرتی شاید سسرال سے کرے تمہیں فون!"
"میں خود کر لوں گی!"
"اچھا لو اب اپنے بابا سے پھر بات کر لو!"
"جی اچھا!"
"ہاں بیٹے!" بابا کی شفیق آواز سنائی دی۔
"ہو سکا تو شام کو آؤں گی آپ کے پاس بابا!"
"اچھی بات!"
"ویسے تو سب ٹھیک ہے نا؟"
"بالکل ٹھیک بابا!"
"اچھا تو پھر انشاء اللہ العزیز زبانی باتیں زبانی ہوں گی!"
"اچھی بات ہے بابا!"
شام کو جب جلیس الحسن دفتر سے لوٹے تو وہ پہلے کی طرح کمرے میں بیٹھ کر ان کی راہ تکنے کے بجائے سبزہ زار پر بچھی ایک سائے کی دری پر گردانی کرتے ہوئے ان کا انتظار کر رہی تھی جلیس الحسن ایک خوشگوار حیرت سے دو چار ہوتے اور خود بھی وہیں آ بیٹھے۔
"آئی ایم سوری الفت آج اتنی مصروفیت رہی کہ میں تمہیں فون تک نہ کر سکا!"
"کوئی بات نہیں!"
"سناؤ دن کیسا گزرا؟"
"ٹھیک!" اس نے کمال ضبط سے کہا۔
اسے اپنی آنکھوں میں جلن اور حلق میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔

دل میں یک بیک ڈھیروں درد سا امڈ آیا۔
جی چاہا انھیں سب کچھ بتا دے۔
ان سے کہہ دے کہ :
" آپ کے بچے مجھ سے نفرت کرتے ہیں انھیں میرے ساتھ ایک میز پر کھانا کھانا تک گوارا نہیں۔ بیں چاہئے میں تو وہ مجھے اپنی ماں تسلیم نہیں کر سکتے۔"
پھر اس نے سوچا کہ یہ تو وہی پرانا راگ چھیڑ دینے والی بات ہوگی۔
شکایتوں نے پہلے کیا دیا تھا؟
جو اب دے دیں گی!
لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اب کی بار شکایتوں کے بجائے صبر و ضبط کو آزمایا جائے اور اپنے جذبات کو اپنے تابع رکھا جائے۔
اسے بابا کی بات یاد آئی جو انھوں نے کل صبح ان سے کہی تھی کہ :
" شادی تو ڈو اور ڈائی کا دوسرا نام ہوتی ہے یعنی کر گزرو یا پھر جان ہی سے گزر جاؤ۔"
" ڈو اور ڈو ائی" اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔
اور
اپنے شانوں پر نئی آزمائش کی صلیب اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

الفت نے امی اور بابا سے وعدہ کیا تھا کہ شام کو اُن کے پاس آئے گی۔ کیونکہ شب ہی گھر لے کے جانا تھا۔ اُن کا جانا ضروری تو نہیں تھا مگر وہ امی اور بابا کے اطمینان کی خاطر اُن کے پاس جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ انہیں بیٹی کے بدلنے کے بعد سے بالخصوص خاصی تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔
شام کو وقت سے واپس آنے کچھ دیر سستا لینے اور کچھ وقت بچوں کے پاس گزار، چکنے کے بعد جب جلیس الحسن کے پاس آ بیٹھی تو اُس نے دبی زبان سے کہا " ذرا دیر کو امی کے ہاں سے جائیں گے مجھے۔"
" ہاں ہاں کیوں نہیں۔"
" بچے تو ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ نہ ہوں گے شاید۔" اُس نے رستہ بنایا ہے بچے میں کہا۔
جلیس الحسن نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔
اُن کی نگاہوں میں بےیقینی تھی۔
یہ وہ کہہ رہی تھی :
وہ!
جسے بچوں کا نام تک لینا گوارا نہ تھا۔
" انھیں رہنے دو" وہ الفت سے بولے۔ " تم تیار ہو جاؤ۔"
" میں تو تیار ہوں۔"
" تو چلو" وہ ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔
" چلیے" وہ اُن کے ساتھ ہولی۔
راستے میں پھول گجروں والے ایک لڑکے سے انھوں نے اُس کے لیے سب جاوت گجرے اور کانوں کے بندے خریدے۔

میکے پہنچی تو امی، بابا، بھیا، بھابی سب ہی نے خوشی کا اظہار کیا۔
وہ اُن کی خوشی کی انفرادی نوعیت سے بخوبی آگاہ تھی۔
امی اور بابا تو اس لیے خوش تھے کہ وہ دوبارہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔
بھابی یقیناً اس لیے خوش تھیں کہ کمرہ خالی ہو گیا تھا جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق دونوں بچوں کے لیے آراستہ کر سکتی تھیں۔
بھیا بے چارے تو تھے ہی بھابی کے ہم آواز اور ہم خیال۔
بھابی نے آن کی آن لوازمات خورد و نوش اُن کے سامنے چن دیے۔
امی نے اُسے سرگوشی میں بتایا "کل رات عظمت اور فضیلت دونوں بہت خوش تھیں تمہارے اپنے گھر چلے جانے سے۔"
" تہنیت کی سناسیے کیا کہہ رہی تھی؟"
" وہ بھی بہت خوش تھی۔ سہیل تو تمہارے یہاں لے جانے کو تیار تھے۔"
" ہائے نہیں امی۔ تہنیت کو آپ منع کیجیے گا کہ ایسے نہ آئے۔ میں اُس کی دعوت کروں گی۔ پہلے میں اُسے ویسے بلاؤں اپنے ہاں جیسا کہ اُس کا حق بنتا ہے پھر بے شک وہ سہیل کے ساتھ روز آئے میرے پاس۔"
" کل جب چوتھی میں آؤ گی تم تو یہ بات خود کہہ دینا اُس سے۔"
" اچھی بات ہے۔"
بابا اور بھیا کافی دیر تک جلیس الحسن سے باتیں کرتے رہے۔
بھابی جب اُس کے پاس آکر بیٹھیں تو انھوں نے بڑی رازداری سے کہا " اُف! جان! تمہارا جو سامان یہاں رکھا ہے وہ ؟"
سامان تھا ہی کیا۔
فقط ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ ہی تو لائی تھی وہ اپنے ہمراہ۔
وہ بھابی کا مطلب سمجھ گئی۔
انھیں کمرہ بالکل خالی چاہیے تھا۔
تہنیت تو اپنے سارے پرانے کپڑے، جوتے اور ذاتی استعمال کی دیگر چھوٹی موٹی چیزیں اپنی سہیلیوں اور اپنی چھوٹی عمر زاد بہنوں میں تقسیم کر گئی تھی۔
یا شاید پھر یہ بات تھی کہ
بھابی کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ دوبارہ واپس نہ آجائے۔
" آپ فکر نہ کیجیے بھابی میں اپنا اسباب آج ہی لے جاؤں گی۔" اُس نے بھابی کو اطمینان دلایا۔
" سمیٹ دوں ؟"
" نہیں آپ تکلیف کیوں کریں۔ میں خود سمیٹ لیتی ہوں۔"
" جان! تکلیف کیسی۔ چھوٹی بہنوں کا کام کر کے تو خوشی ہوا کرتی ہے۔"
وہ بھابی کا منہ دیکھتی رہ گئی۔
ضبط کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ ایک ٹھنڈی سانس کو اپنے سینے کے نہاں خانے میں گھونٹ لینے میں کامیاب نہ ہو سکی۔
اُس نے اُٹھ کر اپنا اسباب سمیٹا اور برآمدے میں رکھ دیا۔ کہ جب جانے لگے گی تو گاڑی میں رکھوا لے گی۔
ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ وہ جلیس الحسن کے کہنے سے بنا گھر جانے کو اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُن کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے بولی " بس اب بابا اور بھیا سے اجازت لیں۔"
" بیٹی! کھانا کھا کے جانا۔" امی نے کہا۔
" ہاں میاں! آپ کی ساس ٹھیک کہہ رہی ہیں بس اب کھانا کھا کے جائیے گا۔" بابا نے جلیس الحسن سے کہا۔
لیکن جلیس الحسن کے کچھ کہنے سے قبل ہی الفت نے کہا " نہیں بابا! اب تو ہمیں اجازت دیجیے کھانا ہم لوگ گھر پر بچوں کے ساتھ کھائیں گے۔"

جلیس الحسن نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"اچھا اگر یہ بات ہے تو پھر ہم اصرار نہیں کریں گے۔" بابا نے کہا۔
"شکریہ۔" جلیس الحسن نے بابا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
"میاں! ہم تو آپ لوگوں کی خوشی میں خوش ہیں۔"
"شکریہ بابا۔" الفت بولی۔
بابا آگے بڑھے اور انھوں نے الفت کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے جلیس الحسن کی جانب دیکھا اور بولے: "جلیس میاں! یہ اس گھر کی سب سے پیاری بیٹی ہوا کرتی تھی۔"
"تھی، گویا اب نہیں ہوں؟" الفت مسکرا کر بولی۔
"بیٹا!" بابا نے دھیرے سے اس کے سر کو بوسہ دیتے ہوئے کہا: "اب تم اس گھر کی کم ہو اپنے خدائے مجازی کے گھر کی زیادہ۔"
"اچھا بابا اب اجازت؟"
"جاؤ فی امان اللہ۔" بابا اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔
وہ مڑی اور اپنے سر پر امی کا دستِ شفقت رکھوانے کو ان کے نزدیک جھک گئی۔
"سکھی رہو، آباد رہو۔" امی نے دعا دی۔
"امی جی!" اس نے امی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا: "آپ اطمینان رکھیے میں بہت خوش ہوں اپنے گھر میں۔"
"خدا تمہیں اور بہت سی خوشیاں دے۔" امی نے کہا۔
وہ سب انھیں رخصت کرنے برآمدے تک آئے۔
الفت نے برآمدے میں رکھا بیگ خود اٹھاتے ہوئے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا اور جلیس الحسن سے بولی: "یہ سوٹ کیس گھر لے جانا ہے۔"
جلیس الحسن سوٹ کیس اٹھانے کو جھکے مگر ان سے پہلے مجتبیٰ نے سوٹ کیس اٹھا لیا۔
"پلیز آپ رہنے دیجیے۔" جلیس الحسن بولے۔
مگر مجتبیٰ نے ان کے مزید اصرار پر بھی انھیں سوٹ کیس نہ اٹھانے دیا اور بولے: "جلیس صاحب! بہنوں کے رخصت ہوتے وقت بھائی ان کا سامان ڈھونے میں زیادہ خوشی محسوس کیا کرتے ہیں۔"
"مگر جناب رخصتی تو کل رات عمل میں آ چکی۔" جلیس الحسن بھی موڈ میں آ گئے۔
"غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ پہلی رخصتی پر بھی ہمارے ہاں سے جہیز دو روز بعد ہی گیا تھا آپ کے ہاں!"
مجتبیٰ کی اس بات پر سب ہی بے ساختہ ہنس دیے۔
وہ گھر پہنچے تو کھانا تیار رکھا تھا۔
رات کے کھانے پر چاروں بچے بیٹھے تو آ گئے اور انھوں نے کھانا بھی ٹھیک ہی کھایا مگر الفت کو انھوں نے بعینہ ویسے ہی نظر انداز کرنے کی کوشش کی جیسے کہ صبح ناشتے پر کیا تھا۔
کھانے کے دوران وہ باپ سے باتیں بھی کرتے رہے۔
کھانے کے بعد اوپر جاتے ہوئے انھوں نے جلیس الحسن کو یکے بعد دیگرے "گڈ نائٹ پاپا" بھی کہا۔
مگر الفت کی طرف انھوں نے دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔
"گڈ نائٹ۔" الفت نے ان کی سرد مہری اور بے رخی پر صبر و ضبط کے کڑوے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔
تہنیت کی شادی کے سلسلے میں الفت نے اسکول سے پانچ دن کی رخصت لی تھی۔ دسویں جماعت کے امتحانات اب زیادہ دور نہ تھے اس لیے وہ طالبات کا زیادہ حرج نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔
تہنیت کی رخصتی کے اگلے روز جب ڈرائیور حسبِ معمول چاروں بچوں کو ان کے اسکول اور کالج چھوڑنے جا چکا تو الفت نے دبی زبان سے جلیس الحسن سے کہا: "کیا آپ مجھے میرے اسکول تک پہنچا دیں گے؟"
"کیوں؟" جلیس الحسن کا رنگ متغیر نظر آنے لگا۔
"کیونکہ اب تک تو تہنیت کی شادی کے سلسلے میں لی ہوئی رخصت چل رہی تھی آج مجھے جوائن کرنا ہے۔"

"مگر... گھر کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔" وہ رکھائی سے بولے۔
"جانتی ہوں۔"
"پھر بھی؟ ان کی نادیدگی پہ تم بضد ہو گئیں؟ اور میں بتا دوں تمہیں کہ جب تم اپنے گھر ما درم تھیں اس وقت مجھے سب سے زیادہ صدمہ اس بات کا ہوا تھا کہ تم نے اپنی ملازمت برقرار رکھی اور مجھے تاریکی میں رکھا۔"
الفت کو ان کے لہجے کی درشتی سے دکھ پہنچا اور دسویں جماعت کے امتحانات تک ملازمت جاری رکھنے کا ارادہ اس نے فوری طور پر منسوخ کرتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا: "سرکاری ملازمت کے کچھ قواعد و ضوابط ہوا کرتے ہیں۔ ملازمت سے مستعفی ہونے سے پہلے بھی چند قواعد و ضوابط کا پابند رہنا ہوگا۔ محکمے کو اپنے ملازمت چھوڑنے کی پیشگی اطلاع دینی ہوگی ورنہ مہینے بھر کی تنخواہ کا نوٹس جاری ہوگا اور خود تنخواہ بھی کٹے گی۔"
جلیس الحسن کے چہرے پر فکر و اندیشوں کی جگہ طمانیت نے لے لی۔
"گڈ! تو تم ریزائن کرنے جا رہی ہو؟"
"جی۔"
"نوٹس کتنے دن کا دینا ہوگا؟"
"یقین سے تو میں فی الوقت کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں غالباً پندرہ دن کا۔"
"گویا پندرہ دن تک تم اسکول جانے کی پابند ہوگی؟"
"یہ تو ابھی کہتی ہوں بہرحال اصل صورتحال اسکول جانے پر معلوم ہوگی۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں اتفاقی رخصت کے سالانہ کوٹے میں سے ابھی میں نے صرف پانچ ہی دن کی چھٹی لی ہے۔ یہی تہنیت کی شادی کے سلسلے میں۔ اگر ہیڈ مسٹریس مہربان ہو جائیں تو شاید مجھے کافی سہولت مل جائے گی۔ ورنہ اتنی اجازت تو آپ مجھے دیں گے کہ میں اپنی ملازمت سے حسبِ قاعدہ مستعفی ہو سکوں۔"
"او کے۔" جلیس الحسن نے کہا۔
"ویسے تو میں ڈرائیور کی واپسی کا انتظار کر کے اس کے ساتھ بھی جا سکتی ہوں مگر پہلے ہی دیر ہو چکی ہے مزید دیر ہو جائے گی اس لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتی ہوں۔"
جلیس الحسن اس کے روبرو بہت نزدیک آ کھڑے ہوئے اور اس کے دونوں شانوں پہ ہاتھ دھرتے ہوئے بولے: "کیا بات ہے الفت؟"
"آں... کیا... کیا ہوا؟" اس نے کچھ گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔
انھوں نے اس کے شانوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹائے اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے: "تم اتنی کیوں بدل گئی ہو؟"
"بدل گئی ہوں؟" اس نے سوالیہ لہجے میں ان کے الفاظ دہرائے۔
"ہاں... بہت بدلی ہوئی لگتی ہو تم مجھے۔"
"کس اعتبار سے؟"
"ہر اعتبار سے۔"
الفت نے خاموشی پر اکتفا کیا اور ان سے نظریں چرانے کی کوشش کرنے لگی۔
"تین دن ہو گئے تمہیں گھر لوٹے ہوئے اور ان تین دنوں میں کئی مرتبہ یہ بات محسوس کی ہے کہ تم میرے ساتھ بھی نارمل... میرا مطلب ہے فطری رویہ نہیں اپنا رہی ہو۔" وہ پل بھر کو خاموشی اختیار کرنے کے بعد بولے: "نہیں... نہیں جاناں... میرے ساتھ تمہارا یہ رویہ ہرگز نہیں چلے گا... دیکھو تمہیں اپنے سے بہت قریب دیکھنا چاہتا ہوں... اتنا نزدیک کہ کوئی تیسرا محسوس نہ کر سکوں۔" انھوں نے دوبارہ توقف کیا پھر بولے: "ڈرائیور کی واپسی کا انتظار کیوں کرو۔ میں جو ہوں تمہارا ہمسفر اور ہمہ وقتی شوفر۔"
الفت کی آنکھوں کے کناروں پہ نمی سی اتر آئی۔
کیونکر بتاتی وہ انھیں کہ:
سمندر کی شوریدہ سر لہروں کے سامنے بیٹھی عورت موجوں کی شوریدہ سری اور ریت کی بے اعتباری کو دیکھ دل ہی دل میں کس احتیاط سے گھروندا بنایا کرتی ہے۔

* * * * * * *

گو اسکول لگے کافی دیر ہو چکی تھی مگر صدر دروازے پر تعینات حد درجہ بد مزاج چوکیدار سے جس کے بارے میں "بے کار رسالہ مات کار نشینوں" کو رشک و حسد سے دیکھتے ہوئے انتہائی شاکی رہا کرتی تھیں کہ ساٹھ ساٹھ سے ہونے آٹھ کی جاتیں تو چوکیدار گیٹ کھولنے پہ انھیں ہیڈ مسٹریس سے زیادہ باتیں سنا پڑتا ہے جلیس الحسن کی گاڑی کا ہارن سنتے ہی صدر دروازہ وا کر دیا، وہ الفت کو شکاسے ان گاڑی کی اگلی نشست پر براجمان دیکھ کر سلام بجا لایا۔

جلیس الحسن کی گاڑی اسکول کے احاطے میں داخل ہوئی تو مس راحیلہ، مسز نیاز اور مسز صدیقی جو کینٹین کی لیبارٹری کے باہر برآمدے میں کھڑی خوش گپیوں میں مصروف تھیں بغور کار اور کار نشینوں کو دیکھنے لگیں۔ الفت کو گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر ان کی نگاہوں میں رشک و حیرت کی کیفیت اُمڈ آئی۔

جلیس الحسن نے گاڑی برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب روکی اور جب وہ گاڑی سے اترنے کے لیے دروازہ کھولنے لگی تو انھوں نے پوچھا "واپسی کا کیا پروگرام ہے؟"

"میں برکت سے چلی جاؤں گی۔"

"چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے؟"

"ساڑھے بارہ بجے۔"

"میں ڈرائیور کو ہدایت کر دوں گا کہ وہ تمہیں لینے آ جائے۔"

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"کیوں؟"

"ڈرائیور بچوں کو بھی تو لینے جانا ہوگا۔ وہ کب مجھے چھوڑنے گا اور کب انھیں لینے جائے گا۔ آپ میری واپسی کی فکر نہ کریں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

جلیس الحسن نے اپنی نگاہوں میں کسی گہری سوچ کی کیفیت لیے اُسے دیکھا پھر بولے "ٹھیک جیسے تمہاری مرضی۔"

"خدا حافظ" الفت نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔"

اُس نے برآمدے کا رُخ کیا اور جلیس الحسن نے واپس جانے کو گاڑی موڑ لی۔

جونہی وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے برآمدے میں آئی مسز نیاز نے بہ آواز بلند کہا "بھئی الفت تم کو بہن کی شادی مبارک۔"

"الگ بات ہے تم نے ہمیں بلایا نہیں اپنی بہن کی شادی میں مگر پھر بھی بہت مبارک۔" مسز صدیقی نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔

الفت نے تہنیت کی شادی میں اپنے اسکول کی ساتھیوں میں سے کسی کو مدعو نہیں کیا تھا۔

احتیاطاً، مصلحتاً۔

حالانکہ رعنا آپی کو بلانے کو بہت تھا اس کا دل۔

مگر اس نے مصلحتاً انھیں بھی مدعو نہ کیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ کسی ایک کو بھی مدعو کیے جانے کی خبر دوسروں کو ہوگئی تو جو شکوے ہوں گے وہ الگ، باتیں ہزاروں بنیں گی۔

اور اگر سب کو مدعو کرتی تو خدشہ تھا کہ وہ سر محفل اُٹھ کے اور جلیس الحسن کے تعلقات کو موضوع گفتگو بنا لیتیں گی۔ شادی میں جلیس الحسن نہ آتے تو مس راحیلہ کی بہن کے توسط سے ملنے والی خبر پر گویا مہر تصدیق ثبت ہو جاتی، پھر تو جتنی باتیں بنائی جاتیں کم ہوتیں۔

مس راحیلہ جو تہنیت کی شادی سے پہلے اُس کی اچھی بھلی دوست ہوا کرتی تھیں "مبارکاں! مبارکاں!" کا نعرہ لگاتی اس کی طرف بڑھیں۔

پھر مسز صدیقی، مسز نیاز اور مس راحیلہ تینوں نے اُس کا باجماعت محاصرہ کر لیا۔

"الفت۔ ہم نے تو سُنا تھا کہ......" مسز نیاز کہتے کہتے رک گئیں اور معنی خیز نگاہوں سے مسز صدیقی اور مس راحیلہ کو دیکھنے لگیں۔

"مسز نیاز" الفت نے انتہائی سکون و تحمل کے ساتھ کہا "آپ نے جو سُنا تھا وہ درست تھا مگر آپ نے جو دیکھا ہے۔"

مسز نیاز خفیف سی ہو گئیں اور بغلیں جھانکنے لگیں۔

انھیں اسی خفت میں غلطاں، مسز صدیقی اور مس راحیلہ کے ساتھ کھڑے چھوڑ کر اس نے ہیڈ مسٹریس مسز ربانی کے دفتر کا رُخ کیا۔

تحریری استعفا اس کے بیگ میں موجود تھا۔ اب اس سلسلے میں مسز ربانی سے گفت و شنید کرنی تھی۔

مسز ربانی کو اس نے اپنا استعفا پیش کیا تو وہ ٹھٹک سی گئیں۔ دانستہ اور حیرت زدہ لہجے میں بولیں "آپ نوکری کیوں چھوڑ رہی ہیں؟"

"میڈم! میرے گھر کو میری زیادہ ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے عورت کی ضرورت کس گھر کو نہیں ہوتی مگر جب تک آپ چھٹی سے کام چلا سکتی ہوں چلا لیجیے۔"

"نہیں میڈم! میرا خیال ہے کہ اس جائز امیدوار کی حق تلفی ہوگی جو میرے استعفا دینے کے بعد خالی اسامی پر ملازم رکھی جا سکے گی۔"

"چودہ سال کی ملازمت ہے آپ کی۔"

"کیا مگر اب جبکہ مجھے ملازمت کی نہ تو ضرورت رہی ہے اور نہ ہی اپنے پیشہ ورانہ فرائض اپنی گھریلو ذمے داریوں کے سبب اس قدر انہماک اور تن دہی کے ساتھ انجام دینے کی اہل پاتی ہوں خود کو جیسا کہ حق بنتا ہے تو بہتر یہی ہے کہ میں اپنی سیٹ جمع کر دینے کے بجائے کسی حق دار کے حق میں دستبردار ہو جاؤں۔"

"گویا آپ فیصلہ کر چکی ہیں ملازمت چھوڑنے کا؟"

"جی ہاں۔"

"دیکھیے بعد کو مسز نجمہ فاروقی کی طرح مت آئیے گا۔ بے چاری اس کو مجھ سے غلطی ہوئی عجلت میں فیصلہ کر لیا تھا اب ریزگنیشن واپس لینا چاہتی ہوں۔ وہ تو خوش قسمت تھیں کہ محکمے کے افسران ان دنوں ایک کانفرنس کے انعقاد میں مصروف تھے اور ان کی درخواست ابھی افسران تک پہنچ نہیں پائی تھی پھر بھی نچلی سطح سے ہی ان کے استعفے کو واپس لینے میں انھیں اور ان کے میاں کو جو بھاگ دوڑ کرنا پڑی سو پڑی مجھے خاصی تکلیف ہوئی۔ ان لوگوں سے کہنا سننا پڑا جن سے کبھی عام حالات میں تو بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ آپ کو اندازہ نہیں افسران تو پھر بھی سُن لیتے ہیں شائستگی سے پیش آتے ہیں مگر کلرک بکل اسٹاف، معاذ اللہ وقتی پاسنے ہی چھوٹے میاں سبحان اللہ بن بیٹھتے ہیں...... آپ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔"

الفت دھیرے سے مسکرا دی "میڈم! میں نے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے۔"

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"جی فرمائیے۔"

"میں نے کچھ اُڑتے اُڑتے سنا تھا کہ......" مسز ربانی نے توقف کیا پھر محتاط لہجے میں بولیں "آپ کے اور آپ کے ہسبینڈ کے تعلقات خدانخواستہ کشیدہ ہیں۔"

الفت نے کامل نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

"آپ کو تو اچھی طرح پتا ہے کہ" مسز ربانی اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکیں اور انھوں نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا "میں اسٹاف سے زیادہ فری نہیں ہوں پھر بھی خبریں اِدھر اُدھر سے پہنچ ہی جاتی ہیں۔"

"جی میڈم" الفت نے دھیرے سے کہا "ایک وقتی بحران آیا تھا گزر گیا۔"

"گزر گیا؟"

"جی۔"

"گڈ" مسز ربانی بولیں پھر انھوں نے اپنے معمول کے لہجے کے برخلاف بڑی ملائمت سے کہا "کشیدگی ہر میاں بیوی میں ہوتی رہتی ہے مگر وہ جو کہا ہے کسی نے کیا کہ...... بڑا مزہ ہے اس ملاپ میں جو ہو لڑائی ہو کر...... یا اس سے ملتی جلتی ہی کوئی بات تو کبھی یہ والی بات بھول جانا چاہیے......" پھر وہ دھیرے سے مسکرا کر بولیں "ہمارے صاحب تو کہا کرتے ہیں جو میاں بیوی لڑتے جھگڑتے نہیں ان کی بخشش نہیں ہوگی کہ تم نے منافقت کی زندگی بسر کی۔"

الفت مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"ایک دفعہ پھر سوچ لیں بلکہ اس ریزگنیشن کو ابھی دو چار روز اپنے پاس ہی رکھیں" مسز ربانی نے اصل موضوع کی

بات لوٹتے ہوئے لب

"میڈم، ملازمت سے استعفیٰ دینا میری ازدواجی زندگی کا اولین اور بنیادی تقاضا بن گیا ہے۔"

"آئی سی۔" مسز بانی نے اُسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ "شاید آپ کے ہسبینڈ آپ کا ملازمت کرنا پسند نہیں کرتے؟"

"جی یہی سمجھیے۔"

"تب تو آپ کو زیادہ محتاط ہو کر فیصلہ کرنا چاہیے...... خدانخواستہ کل کلاں کو آپ کا اپنے ہسبینڈ سے کسی وجہ سے، بات پر... ایڈجسٹمنٹ نہ ہو سکی تو آپ کے پاس اپنے مستقبل کے لیے کوئی راستہ تو محفوظ ہونا چاہیے۔ ایک ملازمت پیشہ عورت کے لیے اس کی ملازمت بڑا تحفظ ہوا کرتی ہے اور دیکھیے ملازمت چھوڑ دینا بہت آسان ہے مگر حاصل کرنا بہت مشکل۔"

"آپ کے مخلصانہ مشوروں کا بہت شکریہ میڈم مگر مجھے استعفیٰ دینا ہے۔"

"او کے...... مجھے آپ کا ریزگنیشن آگے بڑھا دینے میں کوئی اعتراض نہیں۔ ایک خالی اسامی کے لیے [illegible] امیدوار منتظر بیٹھے ہیں۔"

"جی...... تو میں سرکاری خزانے سے جونک بن کر کیوں چپکی رہوں۔ دوسروں کے لیے جگہ کیوں نہ خالی کر دوں!"

مسز بانی نے تشکی نگاہوں سے اُسے دیکھا پھر اس کے استعفیٰ کی درخواست پر فوری ریمارکس لکھتے ہوئے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور اس کے توسط سے آفس سپرنٹنڈنٹ کو اپنے دفتر میں طلب کرنے کی ہدایت کی۔

"وکیل فاروقی صاحب، مس الفت کا ریزگنیشن فارورڈ کرنا ہے۔"

وکیل صاحب چونکے۔

"اچھا..... مس الفت ریزائن کر رہی ہیں؟"

"مس الفت نہیں وکیل صاحب، مسز الفت کہیں۔" الفت نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ تصحیح کی۔

"جی ہاں۔" مسز بانی بھی اپنی غلطی کی بالواسطہ تصحیح پر جھینپ سی گئیں۔

"میڈم! یہ تو ہم لوگوں کی دیرینہ روایت ہے کہ ٹیچرز [illegible] اس اسکول میں جو یہاں آنے کے بعد مسز نہیں مگر [illegible] آپ کے [illegible] صاحبوں کے لیے وہ [illegible] ہیں؟" وکیل صاحب مسکرا کر بولے۔

"میڈم! آج چلی جائے گی میری یہ درخواست یہاں سے؟" الفت نے پوچھا۔

"کیوں بھئی اب ایسی بھی کیا جلدی! کیا بہت بیزار ہو گئی ہیں آپ ہم سے؟"

"نو میڈم! یہ بات نہیں۔" وہ وکیل فاروقی صاحب کی موجودگی کے خیال سے زیادہ خفیف ہو گئی۔

"میڈم میں آج ہی بھجوا دیتا ہوں۔" وکیل صاحب نے مسز بانی کے منصب اور ہیبت کا لحاظ رکھتے ہوئے بات کہی تو مسز بانی سے مگر درحقیقت الفت کو اطمینان دلانے کے لیے۔

"اوکے۔" مسز بانی نے کہا۔

وکیل فاروقی کے جانے کے بعد الفت نے مسز بانی سے معذرت طلب انداز میں کہا۔ "میڈم مجھے پوری شدت سے اس امر کا احساس ہے کہ میٹرک کے امتحان میں اب زیادہ دن نہیں اور میرا اس موقع پر جانا غلط ہے مگر مجھے امید ہے کہ آپ اسے میری انتہائی مجبوری سمجھیں گی۔ ملازمت سے استعفیٰ دینا میری ذاتی مجبوری ہے لیکن اگر میرے ہسبینڈ معترض نہ ہوئے تو میرا وعدہ ہے کہ متبادل ٹیچر کا بندوبست ہونے تک میں میٹرک کی طالبات کو پڑھانے کے لیے آتی رہوں گی بشرطیکہ آپ بھی اس کی اجازت دیں۔"

مسز بانی کچھ دیر تک ملی جلی حیرانی سے اُسے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ "پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے سلسلے میں آپ کا یہ احساس قابل تعریف ہے۔ کیا آپ اپنے ریزگنیشن کو میٹرک کے امتحانات تک التوا میں نہیں ڈال سکتیں؟"

"میڈم! کبھی کبھی جب ہمیں دو میں سے ایک راستے کا انتخاب کرنا ہو تو منتخب راہ پر پہلا قدم ہمیں اپنے دل پر رکھنا پڑ جاتا ہے کیونکہ اسی میں ہماری نجات ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں اس وقت میری پہلی ترجیح میرا گھر ہے۔"

مسز بانی نے ایک گہری سانس لی پھر بولیں۔ "میں آپ کی مشکل کا کسی حد تک اندازہ کر سکتی ہوں۔ شاید آپ اور آپ کے ہسبینڈ کے درمیان کشیدگی کا اصل سبب آپ کی ملازمت رہی ہے۔"

الفت نے مسز بانی کے اس قیاس کی تصدیق و تردید میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

"مس الفت! اگرچہ میں اسٹاف کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی پسند نہیں کرتی مگر آپ سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی کہ آپ آج کل ہیں کہاں؟ میرا مطلب ہے اپنے میکے ہیں.....؟"

"اپنے گھر۔"

"گڈ!" مسز بانی نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "خوش ہیں؟"

"جی۔ اور اس خوشی کو برقرار رکھنے کے لیے ہی ایک ایسے موقع پر ریزائن کر رہی ہوں جب میٹرک کی طالبات کو بالخصوص میری ضرورت ہے اور میں خود کو شرمندہ محسوس کر رہی ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ آپ انگلش گرامر لے رہی تھیں نا؟"

"جی۔"

"ٹھیک ہے یہ میں لے لوں گی۔"

"مگر آپ کے پاس تو پہلے ہی نائنتھ کلاس کا پیریڈ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ایک پیریڈ اور لے لوں گی۔"

"اول تو میں کوشش کروں گی کہ میرے ہسبینڈ راضی ہو جائیں کہ میں میٹرک کے امتحانات تک اعزازی طور پر میٹرک کو پڑھا سکوں ویسے بھی میٹرک میں میرا پیریڈ چوتھا اور شروع کے بعد ہی ہوتا ہے۔ ایک پیریڈ کے لیے آ جایا کروں گی۔"

"نہیں نہیں مس الفت آپ اس فکر کو ذہن سے بالکل نکال دیجیے اب تو..... میں یہ پیریڈ خود لوں گی۔ عورت ہونے کی حیثیت سے میں آپ کے مسئلے کا بخوبی اندازہ کر سکتی ہوں۔"

"آپ کو مشکل ہو گی کیونکہ آپ کو اور بھی بہت سے امور انجام دینے پڑتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں...... آپ کا ازدواجی اطمینان میری مشکل سے زیادہ اہم ہے۔"

"تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ۔" الفت نے تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

مسز بانی جنہیں الفت نے ہمیشہ ایک سخت گیر معلمہ کے روپ میں دیکھا تھا آج اس نئے روپ میں اُسے قدرے ناقابلِ یقین مگر بہت بھلی، مہربان اور مشفق لگ رہی تھیں۔

اگر یہ بات سچ ہے کہ
عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے
تو یہ بھی غلط نہیں کہ
عورت ہی عورت کا درد محسوس کر سکتی ہے!
وقت کے ہاتھوں کتنے عجیب و غریب تجربات ہو رہے تھے اُسے!
شاید
سب سے بڑا تجربہ
اور سب سے اہم بات جو اُسے وقت نے سکھا دی تھی وہ یہ تھی کہ ع "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" کے مصداق انسانوں کے چہرے اور ان کے ظاہری رویے بھی کھلا دھوکا دیتے رہتے ہیں!
بظاہر درشت اور تلخ نظر آنے والے لوگ بباطن انتہائی مشفق اور ہمدرد ثابت ہو سکتے ہیں اور بظاہر دوست نظر آنے والے لوگ اپنے مشفق اور دلکش چہروں کے نقاب کے اندر سے بھی تیر برسا سکتے ہیں۔
کسی نے سچ کہا ہے۔
وقت بہت بڑا معلم ہے۔

* * * * * *

اسی دن وقفے تک الفت کے استعفیٰ پیش کر دینے کی خبر سارے تدریسی اور غیر تدریسی اسٹاف میں مشتہر ہو چکی تھی۔

رعنا جمیل پہلے اور دوسرے پیریڈز میں دیگر کلاسوں میں مصروف تھیں اس لیے ان سے بات نہ ہو سکی۔ تیسرے پیریڈ میں جب وہ ہشتم الف میں پڑھا رہی تھی رعنا جمیل کمرۂ جماعت کے دروازے پر آ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے الفت کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے طالبات کے لحاظ سے خاصے تکلفانہ طرز تخاطب سے کہا۔ "الفت! میں آپ کو دو منٹ کے لیے ڈسٹرب کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی!" الفت کمرۂ جماعت سے باہر نکل آئی۔

طالبات کی پُراشتیاق نگاہوں اور پُرتجسس سماعت سے ذرا دور وہ دونوں برآمدے کی سیڑھیوں کے

وہ اس "وکٹری" کی بات کر رہی تھیں جو اُس نے شعلے اگلتی زبانوں کو اُن کے بھسم ہو جانے پر مجبور کر کے حاصل کی تھی۔

اس روز دوپہر کا کھانا جلیس الحسن نے گھر پر ہی کھایا۔ اور بچے بھی انھیں گھر میں موجود دیکھ کر نیچے اُتر آئے۔

* * * * * * *

شام کو بھیا اور بھابی تہنیت اور شکریے کے اظہار میں اپنی طرف سے دی جانے والی ضیافت میں شرکت کا بلاوا دینے آئے۔

جلیس الحسن دفتر سے آچکے تھے۔ وہ اپنے برادرِ نسبتی یعنی بھیا کو دیکھ کر وہ ویسے ہی خوش ہوئے جیسے کہ عموماً شادی شدہ مرد اپنے سالا صاحب کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے ہیں۔

"پرسوں شام تہنیت کی دعوت میں آپ سب کا بلاوا ہے۔" بھابی نے جلیس الحسن سے کہا، پھر بولیں، "بچوں کو ضرور ہمراہ لائیے گا۔"

"مروّجہ فیشن کے مطابق ہلکی پھلکی موسیقی کا پروگرام بھی ہے۔ ایک صاحب تو وہی ہوں گے جنھوں نے فضیلت کے ہاں آپ کی دعوت میں غزلیں سنائی تھیں۔ ایک دو اور شوقیہ فنکار ہوں گے۔" بھیا بولے۔

"الفی بچوں کو ضرور ساتھ لانا، خوش ہو جائیں گے۔" بھابی جان نے الفت کو بطورِ خاص مخاطب کر کے کہا۔

"جی اچھا۔"

"آج کل میں عظمت بھی آنے والی ہے تمہارے ہاں۔" بھابی نے بتایا۔

"اور ان کی وجہ نزول بھی وہی ہوگی جو کہ ہمارے بے وقت نازل ہونے کا سبب بنی ہے۔" بھیا نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ، یہ آپ ہی کا گھر ہے، جب چاہیں بصد شوق تشریف لائیں۔" جلیس الحسن بولے۔

"اچھا اب اجازت۔" بھیا نے اُٹھنے کو پر تولے۔

"ارے ابھی بیٹھیں...... آئے ہوئے دو منٹ ہوئے نہیں کہ جانے کو اُٹھ کھڑے ہوئے آپ۔" جلیس الحسن نے بھیا کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"دراصل کئی جگہوں پہ جانا ہے اور وقت کم ہے۔"

"ہاں اب اجازت دیجیے۔"

"کچھ دیر تو بیٹھیے۔" جلیس الحسن نے اصرار کیا۔

"انشاء اللہ پھر آئیں گے اور بیٹھیں گے۔"

"بچوں کو ضرور لائیے گا۔" اب کی بار بھابی کی نظریں جلیس الحسن پر تھیں۔

"جی بہتر۔" انھوں نے رسمی انداز میں کہا۔

بھیا اور بھابی کو رخصت کر چکنے کے بعد جلیس الحسن اُس سے بولے، "کبھی الفت ہمیں بھی تو تہنیت کی دعوت کرنی چاہیے۔"

الفت نے انھیں متشکر نگاہوں سے دیکھا۔

جو بات وہ اُن سے کہنے کا ارادہ کر رہی تھی وہ انھوں نے از خود کہہ کر اُس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

"جی کرنا تو چاہیے۔"

"کب؟ کہاں؟" انھوں نے اِک ساتھ دو سوال کر دیے۔

"جب آپ چاہیں اور جہاں چاہیں۔"

"کب کا جہاں تک تعلق ہے تو میں کہوں گا کہ تہنیت کی دعوت تم اپنی پہلی فرصت میں اپنے نام کرا لو۔ رہا سوال یہ کہ دعوت کہاں کی جائے تو کسی بھی نامور فائیو اسٹار ہوٹل میں بکنگ کرا لیں گے۔"

"گھر میں انتظام نہ کر لیا جائے؟"

"ہاں گھر پر بھی کیا جا سکتا ہے مگر......" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"مگر کیا؟"

وہ کچھ متذبذب نظر آنے لگے۔

الفت کے لیے نہ اُن کا تذبذب نیا تھا نہ اس کا سبب۔

فی الوقت اُس نے اس موضوع کو التوا میں ڈالنا ہی مناسب جانا اور رات کے کھانے کی تیاری کا جائزہ لینے کے لیے کچن کا رُخ کیا۔

اوپر کوٹھی کی بالائی منزل پہ

فراز اور ذوہین ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے اپنا ٹی وی پروگرام پورے انہماک اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

جبکہ نگین اور اعجاز ٹیرس کے جنگلے کے سہارے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تینوں نے اپنی سوتیلی ماں کے بھائی اور بھابی کو اپنے گھر آتے اور کچھ دیر بعد واپس جاتے دیکھا تھا اور اس وقت غم و غصے کی کیفیت سے دوچار تھے۔

"میرا تو جی چاہتا ہے شوٹ کر دوں۔" اعجاز نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں کی مٹھی سے پوری شدت سے ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔"

"تم تو جیسے بڑی عقلمند ہونا...... اوسم سلی گرل۔" اعجاز نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں، میں تمہاری بڑی بہن ہوں اور تم مجھے سلی گرل کہہ رہے ہو۔"

"صرف ایک سال بڑی۔"

"ہوں تو بڑی۔"

"بڑی بھی اور بڑی بے وقوف بھی۔"

"یہ آخر تمہیں مجھ پر اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے؟" نگین نے اُس کا بازو پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم نے نہیں کہا تھا آنے دو ان کو ایسا تنگ کریں گے کہ دو دن میں میدان چھوڑ کر بھاگیں گی۔"

"ہاں کہا تھا۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اُن کے تو مہمان آنے لگے ہیں دوبارہ سے۔ ابھی دیکھا تھا تم نے اُن کے موٹو بھائی صاحب کو۔ کیسے توند نکال نکال کر چل رہے تھے۔ بندوق ہوتی میرے پاس تو یہاں سے ایسا نشانہ لیتا کہ مٹکا پھوڑ دیتا۔"

"بس ہو جائے۔ ایک تو تم غصے میں بے وقوفی کی باتیں بہت کرنے لگتے ہو۔" نگین نے اُسے پچکارا۔

"یا یا کچھ کرو۔" اعجاز آہنی جنگلے کے چوبی فریم پہ یکے بعد دیگرے دو مکے جماتے ہوئے بولا۔

"کوئی ترکیب کرو کہ بنگلے میں کوئی جھگڑا فساد کرو۔ پاپا وعدہ کر چکے ہیں کہ اب کی بار اگر اُس سے جھگڑا کیا تو گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے اُس پر۔"

"وہ کوئی موقع تو دیں۔ میں نے تو سوچا تھا اگر انھوں نے گڑبڑ کی تو ہم سب مل کر مزہ چکھا دیں گے۔ مگر وہ تو چپ ہیں۔"

"تو تم خود کوئی ترکیب سوچو۔"

"تم زیادہ پریشان مت ہو۔" نگین نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

اگلی صبح جب جلیس الحسن اُس کے کہے بنا ہی اسکول چھوڑ آنے کو مستعد پائے گئے تو الفت کو شبِ عروسی کا کہا ہوا ایک جملہ یاد آ گیا:

"آپ ان بچوں کے معاملے میں مجھ سے تعاون کیجیے میں ہر معاملے میں آپ سے تعاون کروں گا۔"

تو کیا یہ ایفائے عہد کی ایک کڑی تھی!

اُسے تاسف ہوا کہ استعفا پیش کرنے سے قبل اگر اُس نے انھیں یہ بتایا ہوتا کہ میٹرک کے امتحانات میں بمشکل دو ڈھائی ماہ باقی تھے اور وہ اسکول میں میٹرک کی طالبات کو انگریزی قواعد پڑھانے پر مامور تھی جس میں بیشتر اسکولوں کے طلبا و طالبات عموماً کمزور ہی ہوتے ہیں اُن سے میٹرک کی طالبات کے امتحانات کی تیاری کے لیے گھر بیٹھ جانے تک اسکول کی ملازمت جاری رکھنے کی مہلت طلب کی ہوتی تو شاید وہ اُسے مایوس نہ کرتے۔

مگر خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

استعفا وہ پیش کر چکی تھی۔ غالباً وکیل فاروقی صاحب نے کل ہی اُسے ضروری کارروائی کے بعد محکمے کو ارسال بھی کر دیا ہوگا۔

اور الفت نے کل رات سوچا تھا کہ اب جتنے دن اسکول میں گزار نے ہیں، وہ اپنے فری پیریڈز میں میٹرک کی دوسری ٹیچرز کے پیریڈز لے کر جلد از جلد میٹرک کی طالبات کا مقررہ نصاب ختم کروانے کی کوشش کرے گی، تاکہ اُس کے ملازمت چھوڑنے کے بعد لڑکیوں کو نصاب ختم نہ ہونے کی پریشانی میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔ بقیہ بعد میں نصاب کا اعادہ وہ خود بھی کر سکتی تھیں اور مسز تابانی نے بھی اُسے اطمینان دلایا تھا کہ اُس کا ہر پیریڈ وہ لے لیا کریں گی۔

بہرحال جو اُس کے اختیار میں تھا، وہ کر جانا چاہتی تھی۔

گزشتہ روز کی طرح اس روز بھی چھٹی کے وقت جلالین حسن اُسے لینے کے لیے موجود تھے۔ تاہم کل کی طرح وہ دوپہر کے کھانے کے لیے گھر پر نہیں رکے بلکہ اپنی کسی اشد ضرورت سے رخصت ہو گئے۔ عشاء آ کے گھر پر چھوڑ کر فوراً ہی واپس چلے گئے۔

بچے جو کل گھر میں باپ کی موجودگی کی بنا پر منظر دوپہر کے کھانے کے لیے نیچے ڈائننگ روم میں آ گئے تھے، آج اوپر ہی رہے اور الفت نے ملازم کو اُن کا کھانا اوپر پہنچا دینے کی ہدایت کی۔

اُس نے نیچے تنہا ہی کھانا کھا لیا۔

کھانے کے بعد جب اوپر سے برتن نیچے آ چکے اور کچن سے برتنوں کی دُھلائی اور اُن کے باہم ٹکرانے کی مترنم صدائیں آنے لگیں تو الفت نے دبے پاؤں بالائی منزل کا رُخ کیا۔

پہلے اُس نے اعجاز کے اس کمرے میں ہونے کا یقین کیا، پھر نگین کے کمرے کے نیم وا دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" نگین نے پوچھا۔

اور جواب میں الفت نے کمرے میں جھانکا۔

نگین جو بستر پر نیم دراز تھی، اُسے دیکھتے ہی سیدھی ہو بیٹھی اور اس کی نگاہوں میں حیرت، نفرت اور خوف کی ملی جلی کیفیات ابھرنے لگیں۔

نرمین نے جو بستر پر لیٹی کہانی کی ایک کتاب اپنی آنکھوں کے بے حد نزدیک کیے پڑھ رہی تھی، کتاب کی آڑ سے دیکھا اور اُس پر نظر پڑتے ہی تندی سے خود وہ بھی اٹھ بیٹھی اور نگین کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

الفت کو ان دونوں سے ایک روح فرسا نفاست کا احساس ہوا۔

لیکن اُس نے اپنی کیفیت پر بہت جلد قابو پاتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا۔ "نگین بیٹے! میں اندر آ سکتی ہوں؟"

"کیا بات ہے؟" نگین نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

"کچھ بات کرنی ہے مجھے آپ سے۔" وہ اندر داخل ہو گئی۔

"کیا بات؟"

"بیٹا! پہلے مجھے اندر آنے کی اجازت تو دو۔" اُس نے نفرت اور رقابت کو مصلحت کی مار دیتے ہوئے کہا۔

"اندر تو آپ آ چکی ہیں؟"

"پاس اندر تو آ چکی ہوں، اپنے قریب آنے کی اجازت دو۔" الفت نے اُس کی اجازت کے بنا ہی قدم بڑھا دیے۔

"اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ ہم سے چاپلوسی اور خوشامد سے کام لے سکتی ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے۔"

الفت سہری کے کنارے پر جا بیٹھی۔

"بیٹا، ماں بچوں کی منت تو کر سکتی ہیں مگر اُن سے چاپلوسی سے کام نہیں لیتیں۔"

"آپ ہماری ماں تو نہیں ہیں۔" نگین نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

اور الفت کو رعنا جمیل کی بات یاد آ گئی۔

"دوسرے کے بچے کبھی اپنے بچے نہیں بن سکتے۔"

اُس کے ہونٹوں سے ایک گھٹی گھٹی سی سرد آہ نکلی۔

اُس نے اُجاڑ نگاہوں سے نگین کو دیکھا پھر بولی۔ "ٹھیک ہے، تمہاری ماں نہیں ہوں مگر تمہاری بڑی تو ہوں۔"

"پاپا کے سوا ہمارا کوئی بڑا نہیں ہے۔" وہ انتہائی بے رخی سے بولی۔

"رو کے... بڑا کسی مت سمجھو... گھر کی نوکرانی ہی سمجھ لو... اور نوکرانی سے بھی تو بات کرتی ہو۔"

"میں نے کہا نا آپ کی چاپلوسی اور خوشامد ہم پر اثر نہیں کر سکتی۔"

اُلفت نے سر جھکا لیا۔

کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔

پھر اُس نے رنجیدگی سے کہا۔ "تم لوگ مجھ سے اتنے خفا کیوں ہو؟"

نگین کچھ نہیں بولی۔

"بولو بیٹے... کیوں اتنے خفا ہو مجھ سے؟"

نگین نے بدستور چپ سادھے رکھی۔

"کیا میں اتنی بُری ہوں کہ تم لوگ میرے ساتھ ایک میز پر کھانا کھانا گوارا نہیں کرتے؟"

الفت کی مصالحت کوشی اُس کا اپنا دل چیرے ڈال رہی تھی۔

اتنی بری طرح تو اُس نے زندگی میں کبھی کسی کے سامنے اپنا سر نگوں نہیں کیا تھا۔

"آپ کے اس طرح مجھ سے دُور دُور رہنے سے گھر کے نوکروں کو باتیں بنانے کا موقع ملتا ہے۔"

"تو ہم کیا کریں؟"

"آپ یہ کریں بیٹے کہ چھوٹے بہن بھائیوں کو سمجھائیں کہ وہ بے شک مجھ سے بات نہ کریں، مجھے اچھا نہ سمجھیں مگر میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا تو کھا لیا کریں۔"

"کھانا ہم اوپر کھائیں یا نیچے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا ہے... پڑتا ہے۔"

"ہمارے آرام کا وقت ہے، آپ ہمیں آرام کرنے دیں۔" نگین نے منہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے تم آرام کرو... بس ایک بات بتا دو مجھے۔" الفت نے توقف کیا پھر بولی۔ "کل آپ دعوت میں میرے اور اپنے پاپا کے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟"

"جی نہیں۔" نگین نے بلا تامل انکار کیا۔

"تھوڑی دیر کے لیے۔"

"ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔" نگین نے فیصلہ کن انداز میں کہا پھر بولی۔ "میں نے کہا نا آپ زیادہ چاپلوسی سے کام لینے کی کوشش نہ کریں۔"

نگین جیسی سینکڑوں بلکہ ہزاروں لڑکیوں کو الفت اپنی چودہ سالہ ملازمت کے دوران پڑھا چکی تھی۔ اُس کی ہم سن اپنی شاگرد لڑکیوں کو اُس نے ہمیشہ اپنے آگے سرِ تسلیم خم کیے پایا تھا۔ وہ عزت و تکریم کی عادی تھی!

نگین کو منہ در منہ مقابلہ کرتے اور بدتمیزی سے جواب دیتے دیکھ کر اُس کا خون کھولے جا رہا تھا۔ احساسِ توہین سے اُس کا رُواں رُواں تپ رہا تھا۔ وہ ایسی بدتہذیبی کی عادی کب تھی!

مگر مصلحت کوشی نے اُسے نگین کی اس بدخلقی کو چپ چاپ برداشت کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اُس نے زندگی کو دیکھ لیا تھا اور بالآخر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اب وہ صبر و رضا سے کام لے کر دوسروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دینے کا تجربہ کرنا چاہتی تھی اور خود ہتھیار نہ ڈالنا چاہتی تھی۔

اسی لیے نگین کے ناروا طرزِ عمل کے باوجود وہ حوصلہ نہیں ہاری۔

"بیٹا! تمہاری شرکت سے میرے خاندان والوں میں میری عزت بڑھ جائے گی۔" اُس نے بڑے تحمل سے کہا۔

نگین نے سر کو بائیں رُخ پر تھوڑا سا جھٹکا دیتے ہوئے زہریلی نگاہوں سے اُسے دیکھا اور اپنے اور اُس کی عمر اور رشتے کا سارا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے بولی۔ "برائے مہربانی آپ میرے کمرے سے چلی جائیے ورنہ مجھے اپنے بھائی کو بلانا پڑے گا۔"

لحظہ بھر کو الفت کا سینہ پتھر کا سا ہو گیا اور اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ گئیں۔ چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

اُس کا جی چاہا چلا کر کہے۔ "بدبخت لڑکی بلا لے... بلا لے اپنے بھائی کو۔ دیکھتی ہوں کہ وہ تیرا احمق بھائی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ میں جتنی نرمی سے کام لے رہی ہوں تو اُتنی قدر ماش کے آٹے کی طرح اکڑتی جا رہی ہے۔"

لیکن اُس نے ہیجان پر ضبط کے پہرے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "اچھا بیٹا! چلی جاتی ہوں۔"

دل اور زبان کے اس اختلاف اور زبان کی منافقت پر اسے حقیقت بھی ہوئی۔
مگر پھر اس نے سوچا:
یہی زندگی ہے!
ہم بحیثیت بشر انسان دوہری زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے دل میں کچھ ہوتا ہے زبان پر کچھ۔
اور
شاید کامیاب زندگی منافقانہ زندگی ہی کا دوسرا نام ہے!
پھر اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا: "کیا آپ بچوں کو پیار سے یہ بات سمجھا سکتے ہیں؟"
"کیا؟"
"کہ وہ مہمانوں کے سامنے مجھ سے بیزار نظر نہ آئیں چند گھنٹوں کو خاموشی سے مجھے برداشت کر لیں ورنہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔"
کہنے کو وہ یہ بات بچوں سے خود بھی کہہ سکتی تھی مگر اس نے اپنے سابقہ تجربے کے پیش نظر ان سے براہ راست بات کرنا مناسب نہیں جانا تھا۔
کیا عجب کہ براہ راست بات کرنے کا وہ کچھ الٹا ہی ردعمل ظاہر کرتے۔
جلیس محسن اس کی بات سن کر اس کا منہ تکتے رہ گئے۔
ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ چند ماہ قبل اس نے جن بچوں کو یکسر مسترد کر دیا تھا ان کی بابت وہ اس قدر حلیم الطبعی کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے۔
اگرچہ وہ الفت اور بچوں کے باہمی معاملات میں کچھ عرصے تک قطعاً مداخلت نہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے لیکن انھوں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا: "تم فکر نہ کرو میں سمجھا دوں گا۔"
جلیس محسن بچوں سے زیادہ بحث و تمحیص میں نہیں الجھے۔ انھوں نے فقط ایک ترپ چال چلی!
"جانی بیٹے۔ اگر آپ فرسٹ آئے اپنے امتحان تو کالج جانے کے لیے بالکل نئی کار کی چابی میری طرف سے تحفہ ہوگی۔"
"ریئلی پاپا!" اس نے بے یقینی سے کہا۔
"اور یس!" جلیس محسن نے اپنا بازو بیٹے کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے کہا: "اور ہاں بیٹا جی ایک بات اور، پرسوں نئی تقریب میں نئی امی اور آپ بڑے بہاتوں کا اور فراز اور زرین ننھے مہمانوں کا استقبال کریں گے۔ آپ لوگ میزبان ہوں گے۔ خیال رہے کہ مہمانوں کو شکایت کا کوئی موقع نہ ملے...... او کے؟"
"او کے پاپا!" اعجاز اور نگی کو با دل ناخواستہ کہنا پڑا۔
اور اسی با دل ناخواستگی کے ساتھ انھوں نے دو دن بعد مہمانوں کا استقبال کیا۔
بحیثیت مجموعی تقریب بہت پُرمسرت اور کامیاب رہی۔

پانچواں پیریڈ تھا اور الفت جیم ہی میں تھی۔ اس نے طالبات کو "ملے وزٹ ٹو دی زو" کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھنے کا کام تفویض کر رکھا تھا۔ بیشتر طالبات سر جھکائے کام میں مصروف تھیں اور چند ادھر ادھر تاکا جھانکی کرتے ہوئے دوسروں کی کارکردگی پر حسب استطاعت ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
ڈیسکوں اور کرسیوں کی دو دو یہ قطاروں کے درمیان آہستہ خرامی سے کمرۂ جماعت کا چکر لگاتے ہوئے بظاہر الفت کی نظریں طالبات پر تھیں مگر اس کا ذہن کہیں اور تھا۔
ان گنت سوچوں اور فکروں میں گرفتار!
جلیس محسن کی مفاہمانہ اور بچوں کی متنفر نگاہوں کے بیچ الجھا ہوا!
دفعتاً مسز ربانی کے چپراسی احمد نے کمرۂ جماعت میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "مس! آپ کو میڈم بلا رہی ہیں۔"
احمد کی بلند آہنگی نے طالبات کو اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔
"خیریت؟" الفت نے پوچھا۔
"جی میرے کو کچھ خبر نہیں۔ میڈم نے کہا مس الفت کو بلاؤ بس آپ کو بلانے آگیا۔" احمد نے خاصی سنجیدگی سے کہا اور جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس بھی چلا گیا۔
الفت نے میز پر سے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے طالبات کو اسی خاموشی سے کام کرنے کی ہدایت کی اور کمرۂ جماعت سے مسز ربانی کے دفتر کی طرف چل دی۔
جونہی وہ مسز ربانی کے دفتر کے دروازے پر پڑی چق اٹھا کر اندر داخل ہوئی مسز ربانی نے اس پر نظر پڑتے ہی کہا: "آیئے آیئے!"
"جی میڈم!" وہ ان کے روبرو پہنچنے کے بعد بولی۔
"بیٹھیے!"
الفت کرسی کھینچ کر ان کے روبرو بیٹھ گئی۔
"سمجھ میں نہیں آرہا مس الفت...... اور آئی ایم سوری مسز جلیس!" مسز ربانی اپنے سہو پر معذرت کرتے ہوئے بولیں: "کہ میں آپ کو مبارکباد دوں یا اظہار افسوس کروں!"
الفت استفہامیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھنے لگی۔
"آپ کے استعفے کی منظوری آگئی ہے!"
اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل پوری قوت سے مٹھی میں دبوچ لیا ہو۔
"یہ لیجیے یہ رہا آپ کا ایکسیپٹنس لیٹر!"
اس نے ایک نظر پروانۂ منظوری پر ڈالی اور اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔
"تھینک یو میڈم!" اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔
"میں آپ کی فیلنگز کو بخوبی سمجھ سکتی ہوں مسز جلیس!" مسز ربانی نے کہا: "اپنی پہلی فرصت میں آپ اپنے واجبات کی وصولی کے سلسلے میں ضروری کارروائی کے لیے وکیل فاروقی صاحب سے رابطہ قائم کر لیجیے گا!"
"جی بہتر!" اس نے دھیرے سے کہا پھر بولی: "میڈم! اپنی چودہ سالہ ملازمت کے گیارہ برس میں نے اس اسکول میں گزارے ہیں...... یہاں میرا بہت اچھا وقت گزرا۔ آپ نے ہر معاملے میں تعاون فرمایا میں آپ کی مشکور رہوں!"

"آئی وِش یُو آل دی بیسٹ اِن فیوچر" مسز بانی بولیں۔
"تھینک یُو...... تھینک یُو ویری مچ" الفت نے بوجھل آواز میں کہا۔
"ہر جانے والے کی طرح آپ بھی حسبِ روایت ایک دن ہم لوگوں کے نام کریں گی۔ اس سلسلے میں ہم آپ سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کر لیں گے۔"
"بہتر...... مجھے اجازت۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
مسز بانی بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
جونہی وہ مسز بانی کے کمرے سے نکلی اُن کے دروازے کے باہر تعینات چپراسی احمد نے اُس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر تشویش کے ساتھ پوچھا: "خیریت تو ہے مس؟"
"ہاں میرے استعفے کی منظوری آگئی ہے۔"
"اچھا...... تو کیا آپ چلی جائیں گی؟"
"ہاں۔"
اُس کا جی بھر آیا!
اپنے اطراف پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے اُس کا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔
یہاں اُس نے اپنی زندگی کے سنہری سال گزارے تھے!
پانچواں پیریڈ ابھی جاری تھا۔
وہ جماعت نہم بی میں واپس چلی آئی اور بے دم سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ طالبات خاصی تشویش کے ساتھ اُس کا سنجیدہ چہرہ دیکھنے لگیں۔
"آپ سے اِک بات کہنا چاہتی ہوں آج بیٹے" اُس نے طالبات کی جانب دیکھتے ہوئے۔
وہ سب کی سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
"کل سے آپ کی کلاس کوئی اور ٹیچر لیا کریں گی۔"
"کیوں مس؟" طالبات نے چونک کر پوچھا۔
"کیونکہ میں اسکول چھوڑ رہی ہوں۔"
"کیوں مس؟"
"میں نے استعفیٰ دے دیا ہے اور میں اسکول چھوڑ کر جا رہی ہوں!"
"مس پلیز نہ جائیں" ایک لڑکی نے کہا۔
"پلیز مس...... پلیز مس مت جائیں" باقی لڑکیوں نے ہم آواز ہو کر تائید کی۔
"آئی ایم سوری میں نہیں رک سکتی۔" اُس نے دل پر جبر کر کے کہا۔
"مس آپ اتنا اچھا پڑھاتی ہیں۔ آپ مت جائیں" لڑکیاں باقاعدہ گڑگڑانے لگیں۔
"میڈم آپ کے لیے کسی اچھی ٹیچر کا بندوبست کر دیں گی" الفت نے انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔
طالبات کے روشن چہرے بجھ سے گئے تھے۔
اور کمرۂ جماعت میں سناٹا چھا گیا تھا۔
ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے الفت نے چاروں اور دیکھا اور پھر اُس کی نظریں چھت سے آویزاں پنکھے پر جا لگیں۔
کتنے یادگار دن گزارے تھے اُس نے ان کمروں کی چھتوں تلے!
طالبات اس سے محبت نہیں کرتی تھیں بلکہ پوجتی تھیں۔
ہر صبح ان کمروں میں اُسے پھولوں کی صورت اپنی عقیدتوں کے نذرانے پیش کیا کرتی تھیں۔
اُس کی راہوں میں اپنی آنکھیں بچھایا کرتی تھیں۔
ایک عجیب پُراسرار سا رشتہ تھا اُس کے اور اُس کے شاگردوں کے بیچ!
جس کی کشش انھیں اسکول سے جانے کے بعد بھی گاہے گاہے اُس کے پاس کھینچ کر لاتی رہتی تھی۔

گھنٹی بجتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اچھا بچیو خدا حافظ!" اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔
"خدا حافظ مس!"
لڑکیوں کے چہروں پر رنج و ملال کی پرچھائیاں تھیں اور آنکھوں میں آبی لرزشیں۔
"مس آپ ہم لوگوں کو بہت یاد آیا کریں گی!" جماعت کی مانیٹر نے کہا۔
"بیٹا یاد تو مجھے بھی بہت آیا کریں گی آپ لوگ۔"
اُس کا چھٹا پیریڈ خالی تھا سو وہ اسٹاف روم میں جا بیٹھی۔
جلیس الحسن کے گھر واپس آنے کے بعد اس نے دوبارہ اسٹاف روم میں بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔
"الفت! سنا ہے تمہارے استعفے کی منظوری آگئی ہے؟" اسٹاف روم میں بیٹھی مسز تسلیم جی نے پوچھا۔
"جی ہاں!"
"اب کیا ارادے ہیں؟"
"ارادے کیا بس اب گھر بیٹھنا ہے!"
"گھر بیٹھی بور نہ ہو جایا کرو گی کیونکہ یہ تو ہم دیکھ آئے ہیں تمہارے گھر جا کر تمہارے پاس دل بہلانے کو تو کچھ بھی نہیں ہے!"
مسز زبیری بولیں۔
"ہاں یہ تو ہے!"
"ملنے کے لیے تو آیا کرو گی نا ہم سے؟"
"کیوں نہیں!"
کچھ دیر بعد طالبات کے پرے کے پرے اُس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔
"مس آپ جا کیوں رہی ہیں؟" اُن میں سے ہر ایک کا سوال تھا۔
"پلیز مس نہ جائیں!" ہر ایک التجا کر رہی تھی۔
ساتویں پیریڈ کی گھنٹی بجتے ہی وہ اپنا آخری پیریڈ لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
یہ اسکول میں اس کے آخری دن کا آخری پیریڈ تھا!
جس مصروفیت میں چودہ سال تک دن کا بڑا حصہ گزرتا رہا ہو اُسے خیرباد کہہ دینا عجیب سا احساس تھا۔
"باجی جی سنا ہے آپ کا استعفیٰ آگیا ہے؟" آیا نے اداسی میں پوچھا۔
"ہاں آپا جی میرے استعفے کی منظوری آگئی ہے!"
"پھر اب آپ کی جگہ کس نے آنا ہے؟"
"دیکھیں کون آتا ہے!"
"باجی جی میں تے بڑی دعاواں کرنی ہوں آپ کے واسطے...... آپ سمجھو گئے ہو ناں میرا مطلب!" اُس نے توقف کیا پھر بولی: "بچیاں سے بڑی پیاراں آتی ہیں جی گھر میں!"
الفت محجوب ہو گئی۔
آخری پیریڈ جماعت ہفتم میں تھا۔ جماعت ہفتم کی طالبات اس کے اسکول سے جانے کی خبر سن کر جماعت نہم کی طالبات کی طرح دلگیر نہ ہوئیں۔
انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ آج پڑھیں گی نہیں اس سے باتیں کریں گی۔
نوعمر لڑکیاں چھوٹے چھوٹے استفسارات کرتی رہیں۔
"مس آپ کہیں جا رہی ہیں؟"
"اب کیا کریں گی؟"
"کبھی کبھی ملنے کے لیے تو آیا کریں گی نا؟"
"ہمیں یاد کریں گی؟"
وغیرہ وغیرہ۔

دال چاول کھانا آتا رہا تھا۔

چنانچہ الفت نے سب سے پہلے تو اُسے صفائی ستھرائی کا عادی بنانے کی کوشش کی۔ کھانا پکانا تو بہرحال وہ سیکھ چکا تھا۔

کھانا پکانے سے قطع نظر الفت نے جلیس الحسن کو پابند کیا کہ وہ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر وقت بے وقت کھانے کے بجائے گھر پہ کھایا کریں۔

اس پابندی کے دو بڑے فائدے ہوئے۔

اوّل الفت کو دن رات کی اس فکر سے نجات مل گئی کہ جانے جلیس الحسن نے دفتر میں دوپہر کا کھانا کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔

دوم چاول پکنے دوپہر کے کھانے پہ باپ کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی شرافت اور تمیز کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

ان دو بڑے فائدوں سے قطع نظر ایک بڑی تسکین الفت کو یہ میسر آئی کہ روز جلیس الحسن کی زبان سے اُسے اپنی تعریفیں سننے کو ملنے لگیں۔

کبھی وہ کھانے کے دوران ہی تعریفیں کرنے لگتے۔

"واہ بھئی کیا لذیذ کھانا پکایا ہے۔"

اور نکتوں کی تائید بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

اور کبھی وہ کھانے کے بعد بچوں کی عدم موجودگی میں سراہتے۔

تنہائی میں وہ قدرے رومانی طرزِ تحسین اختیار کرتے۔

"بھئی واہ! کیا لذت ہے تمہارے ہاتھوں میں کہ چومنے کو جی چاہتا ہے۔"

اور سچ مچ ہاتھ چوم بھی لیتے۔

ایک روز کہنے لگے۔

"جب سے تم نے کھانا پکانا شروع کیا ہے میں بہت کھانے لگا ہوں۔ وزن بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ توند بھی کچھ نکلتی ہوئی لگتی ہے۔"

"جی نہیں آپ بالکل فٹ ہیں۔ پہلے کی طرح۔"

"کیسا بچے ہی گھڑی دیکھنے لگتا ہوں کہ بس اب اُٹھ لینے ہی میں خیر ہے ورنہ بیگم خفا ہوں گی۔"

"اور میں ایک بجتے ہی آپ کی راہ دیکھنے لگتی ہوں۔"

"ویسے بائی دی وے ٹھیک ہی تو جانا ہے کہ تم نے دوپہر کا کھانا بھی گھر پہ کھانے کا پابند کر دیا ورنہ اس امر کا پابند تو مجھے ناصرہ بھی نہ کر سکی تھی۔"

الفت دم بخود رہ گئی۔

آج کتنے دنوں بعد پھر ناصرہ کا نام آیا تھا اُن کی زبان پر!

اُسے اپنی نادانی پہ تاسف ہوا۔

گھر آنے کے بعد اُس نے پہلی فرصت میں پہلا کام یہی کیا تھا کہ جلیس الحسن کی الماری میں رکھے اُن کے اکٹھا کیے ہوئے البم کی کو واکر کے دیکھا تھا اور ناصرہ کی تصویریں ان سے غائب پا کر مطمئن ہو گئی تھی۔

اپنی دانست میں اُس نے اپنے دل کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ جلیس الحسن نے اپنے دل سے ناصرہ کو نکال دیا تھا۔

مگر نہیں

یہ اُس کی بھول تھی۔

اُس کا نام دنوں بعد آج پھر اُن کی زبان پر آ گیا تھا۔

اُس کے دل میں غصے سے آتش فشاں کی طرح گنبد بلند ہونے لگی۔

مگر پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس دل خانہ خراب کی کسی پرت کو کسی بھی مقام پہ کروٹ بدلنے نہیں دے گی!

فروری میں الفت کی ساتھیوں نے اُس کے اعزاز میں باقاعدہ "فیئرویل پارٹی" کا اہتمام کیا۔

اور کل مارچ میں فراز اور نرمین کے امتحانات شروع ہو گئے۔

وہ آخر مارچ میں اعجاز کے۔

نگین کے امتحانات جون میں متوقع تھے۔

گھر پہ ٹیوٹر تو پڑھانے آتے ہی تھے۔

اعجاز نے امتحانات کی تیاری میں دن رات ایک کر دیا۔

نگین اکثر ہنس کر کہتی "اچھا تو پاپا سے گاڑی کی چابی لینے کی تیاری ہو رہی ہے؟"

"تم کیوں جلتی ہو؟" وہ چڑ کر کہتا۔

"واہ میں کیوں جلتی بھلا... میں تو تمہارے ساتھ کالج جایا کروں گی... بلکہ تم لوگوں کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ اتنے سویرے کالج جانا پڑتا ہے۔ تمہاری گاڑی ہوگی تو ہم دونوں کالج والے بندے ساتھ چلا کریں گے۔ فراز اور ناجون کو ڈرائیور لے جایا کرے گا۔" ایک روز نگین نے کہا۔

"کوئی نہیں... کوئی نہیں میں تمہیں نہیں لے جایا کروں گا۔"

"کیوں؟"

"میرے دوست کم ہوا کریں گے میرے ساتھ جانے والے!"

"ہاں فراز بھلا اپنی پارٹی کے بغیر کہاں نکلتے ہیں۔"

"کیا! کیا کہا تم نے مجھے فراز؟" اعجاز نے بھڑک کر کہا۔

"اوہ! آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تھا مسکین پارٹی!"

"نگی! میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"شرم کرو میں تمہاری بڑی بہن ہوں۔"

"صرف ایک سال بڑی!"

دونوں میں اسی طرح نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ اور اعجاز نگین کے ایک سال بڑا ہونے کا لحاظ کر کے اکثر پاپا سے فاتح دکھایا کرتا تھا۔

اعجاز کے امتحانات ختم ہوتے ہی جلیس الحسن نے سمندر کنارے ایک پکنک کا اعلان کر ڈالا۔

ماضی میں وہ چاروں سمندر کنارے تفریح کے تصور ہی سے خوش ہو جایا کرتے تھے۔

ساحلِ سمندر اُن کی ماں کا پسندیدہ تفریحی مقام ہوا کرتا تھا۔

چھٹی والے دن اُن کا گھرانا ساحلِ سمندر کا رُخ کیا کرتا تھا۔

ممی اور پاپا پہلو بہ پہلو بیٹھے چپکے چپکے سرگوشیاں کیے جاتے اور ان چاروں کی مسکراہٹوں سے محظوظ ہوتے جاتے۔ پانچھے اوپر چڑھا کے سمندر کی شوریدہ سر لہروں کے مقابل جا کھڑے ہوتے یا پھر پاؤں میں پانی لگائے ساحل کی نرم اور نم ریت پر اپنے نقوش ثبت کرتے چلے جاتے۔

اور وہ چاروں ساحل پہ چہلیں کرتے اور قہقہے بکھیرتے پھرتے۔

کتنے اچھے دن ہوا کرتے تھے وہ!

جب اُن کی ماں اُن کے ساتھ تھی۔

سمندر کنارے جانا انہیں ماں کے جانے کے بعد بھی اچھا لگا کرتا تھا کیونکہ وہاں جا کر ماضی کی بہت سی یادیں زندہ ہو جایا کرتی تھیں۔

مگر اس دفعہ انہیں سمندر کے کنارے تفریح کے خیال سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔

بلکہ سچ تو یہ تھا کہ کچھ کوفت ہی کا احساس ہوا۔

کیونکہ اس بار اُن کی سوتیلی ماں بھی اُن کے ہمراہ جانے والی تھی۔

جانے سے انکار نہ کر سکتے تھے کہ پاپا پکنک پر لے جا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ پہلے کبھی کہیں جانے سے اگر انکار کیا ہوتا تو اب بھی ہمت پاتے۔

جانے کو تو وہ سب ایک ہی گاڑی میں جا سکتے تھے مگر جلیس محسن نے لوازمات پکنک کی کثرت اور ایک خدمت گار کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے دو نوں گاڑیاں لے جانے کا فیصلہ کیا تاکہ بچے علیحدہ گاڑی میں جا سکیں اور وہ الفت کے ہمراہ۔

کیونکہ بچوں سے ان کی محبت ستم نگراں کے دل میں الفت کے لیے بھی نرم گوشے تھے جس کا بدلا ہوا روپ انھیں ان دنوں اکثر سوچ میں ڈال دیا کرتا تھا۔

شادی کے بعد پہلی بار وہ اسے سیر و تفریح پر لے کر نکل رہے تھے۔ راستے میں اس سے ہنستے بولتے ہوئے جانا چاہتے تھے۔ بچوں کی موجودگی الفت سے ان کی بے تکلفی میں یقیناً حارج ہوتی۔

پکنک کے لیے مقررہ دن جب جملہ لوازمات پکنک دو نوں گاڑیوں میں لادے جا چکے اور پکنک پر جانے والے نفوس کے گاڑیوں میں بیٹھنے کی باری آئی تو نگین کی نظر کا اشارہ پاتے ہی زرین جلیس محسن کی گاڑی کی اگلی نشست پر اس طرح پھیل کر بیٹھ گئی کہ الفت کے بیٹھنے کو جگہ ہی نہ رہی۔

جلیس محسن نے کن انکھیوں سے الفت کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اعجاز سے کہا۔

"جانی میاں! میرا خیال ہے آپ تو دوسری گاڑی میں ہلا گلا کرتے ہوئے جانا پسند کریں گے؟"

"پاپا میں بھی۔" فرزانہ نے کہا۔

"اور ... بیٹے آپ ...؟"

"پاپا میں بھی انہی لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟" نگین نے اجازت طلب انداز میں کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی بیٹے۔"

"تھینک یو پاپا!"

ان تینوں کے دوسری گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد جلیس محسن الفت کی جانب آئے جو زرین کے اگلی نشست پر براجمان ہو جانے پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنی باطنی کیفیت کو جلیس محسن پر ظاہر ہونے دینے کے لیے خود اپنے آپ سے ایک سرد جنگ لڑ رہی تھی۔

"چلیے جناب! اب آپ بھی بیٹھ جائیں۔"

جلیس محسن کا خیال تھا وہ حسب سابق زرین کے آگے بیٹھ جانے کا بُرا مناتے ہوئے پچھلی نشست پر بیٹھنے کو ترجیح دے گی۔

لیکن انھیں اس وقت ایک خوشگوار استعجاب ہوا۔ جب الفت نے گاڑی کے اگلے دروازے کی چوکھٹ تھام کر جھکتے ہوئے زرین سے کہا۔ "بیٹا! تھوڑی سی جگہ مجھے بھی دو گی؟"

زرین نے منہ بناتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! ممّا کے لیے جگہ بناؤ۔" جلیس محسن نے مداخلت کی۔

زرین جبراً و قہراً سمٹ گئی۔

مگر الفت کے بیٹھنے کو جگہ نہ نکل سکی۔

"بیٹا! تھوڑا سا اور سرکو۔" جلیس محسن جھک کر بولے۔

"جگہ نہیں ہے پاپا!" زرین منمنائی۔

"کوشش تو کرو، آخر آپ عمر کے لیے بھی تو جگہ نکالا ہی کرتی تھیں۔"

"اماں عمر جیسی ہوتی تو یہ نگین سمجھے ہی اپنا!" الفت نے دانت پیستے ہوئے تنا ہی جی میں سوچا۔

"پاپا آپ میں چھوٹی بھی تو تھی۔"

زرین کی حاضر جوابی نے جلیس محسن کو لاجواب کر دیا۔

"کم آن بیٹے! ان کے لیے بھی تھوڑی سی تنبیہ ضرور کرتی۔"

"رہنے دیجیے میں پیچھے بیٹھ جاتی ہوں۔" الفت نے بظاہر بڑے تحمل سے کہا۔

الفت نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور پیچھے بیٹھ گئی۔

جلیس محسن زرین کی نادانی پر جھنجلاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

"خدا" وہ دوسری گاڑی کی اگلی نشست پر براجمان اعجاز نے اپنی آنکھوں پر چڑھے چشمے کے رنگین شیشوں کے پیچھے

سے یہ سارا منظر بغور گاڑی کے سائیڈ مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھوٹی ارو مظلوم ...!" نگین نے گاڑی میں ڈرائیور اور ملازم لڑکے کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے زرین کی کارکردگی پر انگریزی میں تبصرہ کیا "بچاری اعجاز سے تائید چاہی۔ "آؤٹ شٹ جا جی۔"

"اور نہیں" اعجاز نے بھرپور تائید کی۔

اس صورت حال پر ان دونوں کے مابین بقیہ گفتگو بھی ملازمین کی موجودگی کا لحاظ رکھتے ہوئے انگریزی ہی میں ہوئی جس کی اردو صورت کچھ یوں تھی:

"بدصورت عورت! اس کا خیال ہے کہ وہ مما کی جگہ لینے جا رہی ہے۔" اعجاز نے حقارت سے کہا۔

"آج کل تو بہت شریف بن کر دکھا رہی ہے پاپا کو۔"

"ہاں یقیناً بہت ہی زیادہ۔"

"بڑی چالاک عورت ہے پاپا کو مٹھی میں لینے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"تم دیکھتے جاؤ بہت جلد اس کی اصلیت کھل جائے گی۔"

پھر دونوں گاڑیاں آگے پیچھے عازم سفر ہو گئیں۔

راستے بھر الفت پچھلی نشست پر بیٹھی زرین کو جی ہی جی میں بُرا بھلا کہتی رہی مگر اس نے انتہائی ضبط و برداشت سے کام لیتے ہوئے اپنی باطنی کیفیت کو چہرے سے ہویدا نہ ہونے دیا۔

جلیس محسن بار بار اپنے سامنے آویزاں آئینے میں اُس کا عکس دیکھتے اور ہر بار اُس کا ہلکا تبسم لیے لبوں پر مسکراہٹ میں چھپا چہرہ حیران کیے دیتا۔

کیا یہ وہی عورت تھی جو زرین کے گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھتے ہی مرچ کی طرح بھبھوکا ہو جایا کرتی تھی!

راستے بھر وہ زرین اور الفت دونوں سے باتیں کرتے رہے۔ الفت بڑی خوش دلی اور شائستگی سے شریک گفتگو رہی۔ بار ہا اُس نے زرین سے ہمکلام ہونے کی کوشش کی۔ جلیس محسن کے لیے یہ اندازہ کرنا چنداں محال نہ تھا کہ وہ زرین سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک آدھ دفعہ تو اس نے پچھلی نشست سے ہاتھ بڑھا کر زرین کا سر تھپتھپانے اور شانہ چھونے کی کوشش بھی کی۔

مگر الفت کے برعکس زرین کا رویہ انھیں قدرے جارحانہ محسوس ہوا۔ جتنی دفعہ بھی الفت نے اس سے ہمکلام ہونے کی کوشش کی وہ ان سنی کر گئی۔ اور جب الفت نے اس کا سر تھپتھپانے کی کوشش کی تو اس نے بڑی صفائی سے اپنا سر پرے کر لیا۔ اور جب اُس نے اُس کا کندھا چھونے کی کوشش کی تو وہ کسمسا کے آگے سرک گئی۔

تاہم زرین کے اس جارحانہ رویے کے باوجود جلیس محسن کو الفت کی پیشانی پر ایک شکن دیکھنے کو نہیں ملی۔

اُس روز وہ سب دن چڑھے سے شام ڈھلے تک سمندر کنارے سیر و تفریح میں مصروف رہے۔ خدمت گار لڑکا لپک لپک کر انھیں گرما گرم چیزیں پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔

بچوں نے سمندر کے کنارے چہل قدمی بھی کی اور پکنک بھی۔

ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بچے اور جلیس محسن سمندر کی شوریدہ سر لہروں کے ساتھ آگے بڑھتے انھیں اپنے قدموں میں لوٹنے پر مجبور کرتے رہے۔

فرزانہ اور زرین نے ساحل پر سیپیاں اور گھونگھے چنے۔

سمندر کی گیلی ریت پر گھروندے بنائے اور انھیں سیپیوں اور گھونگھوں سے آراستہ کیا۔

نگین اور اعجاز ان دونوں کو یاد کرتے رہے جب اُن کی ماں اُن کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ اور وہ ہر دوسرے تیسرے ہفتے یہاں آیا کرتے تھے۔

ان چاروں نے لوڈو کی بازی بھی جمائی۔

جلیس محسن نے الفت کے ہمراہ ان کے کھیل میں دلچسپی لینے کی کوشش کی تو الفت کو انھوں نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ کوئی کسر چھوڑا تھا نہ حد کہ اپنے طور پر الفت نے ان سے بے تکلف ہونے اور دوستانہ ماحول استوار کرنے کی ممکن کوشش کی۔

سر شام جب جلیس محسن الفت کے ساتھ چہل قدمی کرنے دُور تک نکل گئے تو نگین نے لبجہ حسرت انھیں جاتے

ہوئے اعجاز سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے جاجی! ایک مرتبہ مم اور پاپا کتنی دور نکل گئے تھے؟"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ فراز تو رونے لگا تھا یہ سمجھ کر کہ شاید مم اور پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

"اور اس کی دیکھا دیکھی چھوٹی بھی منہ بسورنے لگی تھی۔"

"پھر ہم دونوں فراز اور چھوٹی کے ہمراہ مم اور پاپا کے پیچھے پیچھے دوڑتے چلے گئے تھے۔"

"کتنے اچھے تھے وہ دن!" نگین نے حسرت سے کہا۔

"ہاں بہت اچھے۔"

"کاش! مم زندہ ہوتیں۔"

"کاش!" اعجاز نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "تاکہ یہ بدصورت عورت ہمارے گھر نہ آئی ہوتی۔"

"ذرا دیکھو تو کس قدر اترا اترا کر چل رہی ہیں پاپا کے ساتھ۔"

"میں اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا...... آئی ہیٹ ہر۔"

"مجھے تو اب ڈر سا لگنے لگا ہے۔"

"کیوں؟ ڈر کیسا؟"

"خدا جانے ان سے ہمارا پیچھا کبھی چھوٹے گا کہ نہیں۔"

"کیوں نہیں ضرور چھوٹے گا۔"

"پاپا کو تو قابو میں کر لیا ہے انھوں نے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پاپا ایک ہیں، ہم چار ہیں اور ہم چاروں میں سے تو ایک بھی اس عورت کو لفٹ کرانے نہیں جا رہا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"تو پھر فکر نہ یہ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے!"

"جاجی! ایک بات پوچھوں؟" نگین نے اپنی انگلی سے نم ریت پر آڑی ترچھی لکیریں بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں پوچھو۔"

"سچ سچ بتاؤ گے؟"

"اگر سچ بتانے کی بات ہوئی تو۔"

"تمہیں مم یاد آتی ہیں؟" نگین کی آواز بوجھل تھی۔

اعجاز کی آنکھوں میں سرخی سی اُمڈ آئی۔ ان کے جانے کے بعد نگین نے پہلی بار اس سے اس موضوع پر بات کی تھی۔

"بولو! یاد آتی ہیں مم تمہیں؟"

"تمہیں یاد آتی ہیں؟" اعجاز نے اُلٹا سوال داغ دیا۔

آن کی آن نگین کی آنکھوں میں سمندر کی لہروں کا عکس نظر آنے لگا۔

"تمہیں یاد آتی ہیں مم؟" اعجاز نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" نگین نے بھیگی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تو پھر مجھ سے کیوں پوچھا تم نے؟"

"یہ جاننے کے لیے بھائی کہ مم صرف مجھی کو یاد آتی ہیں یا تم کو بھی۔"

"تمہیں یاد ہے ایک بار پاپا نے کہا تھا ہمیں مم کو بھلانے کی کوشش کرنی چاہیے؟"

"ہاں یاد ہے مجھے۔"

"اس وقت میں نے سمجھا تھا کہ پاپا ٹھیک کہتے ہیں لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"اب لگتا ہے میں مم کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔"

"ہاں! چھوٹی یاد کرتی ہے مم کو؟"

"بہت۔"

"فراز کا کچھ معلوم ہے؟"

"وہ منہ سے تو نہیں بولتا مگر چپکے چپکے مم کی تصویریں بنایا کرتا ہے۔ اور پھر اس ڈر سے کہ کوئی دیکھ نہ لے پھاڑ دیتا ہے۔"

دیر تک وہ دونوں دل گرفتہ اور ملول بیٹھے رہے۔

لمبی چہل قدمی کے بعد جب جلیس الحسن الفت کے ہمراہ واپس لوٹتے دکھائی دیے تو اعجاز نے کہا۔ "اس کی وجہ سے تو مم اور یاد آتی ہیں!"

جلیس الحسن نے چہل قدمی سے واپس لوٹتے ہی واپسی کے لیے تیاری کی ہدایت کی۔

سمندر کے پانیوں میں ڈوبتے سورج کا چہرہ نگین اور اعجاز کو اپنی طرح دل شکستہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس روز فراز اور زرمین کے سالانہ امتحانات کے نتائج کا اعلان کیا جانے والا تھا۔

عاصمہ بیگم جب تک ساتھ تھیں بچوں کی پروگریس کا احوال لینے گئے ہیے، دوسرے تیسرے ہفتے اُن کے ٹیچرز سے ملنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ اسکول میں ہونے والی ہر اس تقریب میں جس میں بچوں کے والدین اور سرپرستوں کو مدعو کیا گیا ہو وہ پورے جوش و خروش سے شریک ہوا کرتی تھیں۔

یوں بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لینا، اُن کی پروگریس پر نظر رکھنا اور اُن کے اساتذہ سے رابطہ رکھنا گویا عاصمہ بیگم کی ذمے داری بن ہوئی تھی۔

جلیس الحسن کسی اور موقع پر عاصمہ کے ساتھ بچوں کے اسکول جاتے یا نہ جاتے اُن کے سالانہ امتحانات کے نتائج سننے کے لیے اُن کے اسکول جانا اپنی سالانہ ذمے داری سمجھتے تھے۔

گزشتہ برس عاصمہ بیگم زندہ تھیں تو انھوں نے یہ ذمے داری تنہا ہی نبھائی تھی۔

اس مرتبہ بھی انھیں اس روایت کو ہر صورت برقرار رکھنا تھا۔

نگین تو صبح ہی اُن کے ہمراہ چلی گئی تھیں اور جاتے ہوئے فراز اور زرمین کے علاوہ نگین نے بھی جلیس الحسن کو یہ بات جتائی تھی کہ نتیجے کا اعلان دس بجے کیا جائے گا لہٰذا وہ ساڑھے نو اور پونے دس کے درمیان اسکول پہنچ جائیں۔

الفت بھی اس بات سے آگاہ تھی۔

جب جلیس الحسن بچوں کے اسکول جانے کو تیار ہونے لگے تو الفت نے خود کہا "میں بھی چلوں آپ کے ساتھ؟"

جلیس الحسن کو ایک خوشگوار حیرت نے آلیا!

انھیں یاد تھا کہ الفت سے شادی کے بعد ابتدائی چند ماہ کے دوران انھوں نے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں جب کبھی اُسے کوئی ذمے داری تفویض کرنے کی کوشش کی تو اس نے اگر مگر کا اظہار کیا تھا یا ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

اور اب وہ رضاکارانہ طور پر خود اپنی خدمات پیش کر رہی تھی۔

"تمہاری مرضی ہے۔" انھوں نے اُسے آزمانے کو کہا۔

"میں تو چلنا چاہتی ہوں آپ کے ساتھ۔"

"تو بصد شوق چلو۔"

راستے میں اُس نے اُن سے پوچھا "بچوں کے نتائج کے بارے میں آپ کی توقعات کیا ہیں؟"

"فراز کو ابتدائی تین اور زرمین کو شروع کے پانچ بچوں میں شامل ہونا چاہیے۔"

"اس کا مطلب ہے پڑھنے میں اچھے ہیں یہ دونوں۔"

"عاصمہ کے زمانے میں اور زیادہ اچھے ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ ٹیوٹر کے علاوہ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ خود بھی پڑھایا کرتی تھی بچوں کو۔"

پھر عاصمہ کا ذکر!

الفت کو سانسیں بوجھل معلوم ہونے لگیں۔

"تم تو خود تجربہ رہی ہو۔" جلیس الحسن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تو معلوم ہوگا کہ بچوں کی تعلیم میں جب تک والدین دلچسپی نہ لیں بات نہیں بنتی۔ خاص طور پر جب تک تمہاری توجہ درکار تھی۔ میں نہ پہلے وقت دے پاتا تھا بچوں کی پڑھائی کو نہ اب دے پاتا ہوں۔ بس اسکول یا پھر ٹیوٹر ہی پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔"

الفت سوچ میں پڑ گئی۔

یہ تو ٹھیک ہی تھا کہ بچوں کی پڑھائی پر جب تک والدین توجہ نہ دیں مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ سب سے زیادہ ہونے کے ناتے وہ اس حقیقت سے کما حقہٗ واقف تھی۔

"فراز اور زرمین کو تو میں بھی پڑھا سکتی ہوں۔" اُس نے کہا۔

جلیس الحسن کو اپنی سماعت بے بھرم محسوس ہوئی۔

"کیا واقعی؟" انھوں نے کہا۔

"اتنی پڑھی لکھی تو خیر میں ہوں کہ دسویں جماعت تک کے طلبہ کو پڑھا سکتی ہوں۔ البتہ اس سے آگے ذرا راستہ دشوار ہے۔"

"اگر تم فراز اور زرمین کی بھی کبھی مدد کر دیا کرو اُن کی پڑھائی میں تو تمہارا شکر گزار رہوں گا۔"

"مجھے کوئی عار نہیں مگر......"

"مگر کیا؟"

"خدا جانے وہ مجھ سے پڑھنا پسند کریں گے بھی یا نہیں؟"

جلیس الحسن خاموش ہو گئے۔

یہ مسئلہ تو واقعی تھا۔

جلیس الحسن اسکول پہنچے تو بچوں کو اپنا منتظر پایا۔ مگر الفت کو دیکھ کر اُن کے منہ بن گئے۔

ٹھیک دس بجے گھنٹی بجی تو اسکول کے تمام طلبہ اسمبلی گراؤنڈ میں صفیں بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اساتذہ طلبہ کے روبرو قطار میں کھڑے تھے۔ اور والدین اُن کی صفوں کے پیچھے موجود تھے تاکہ اوّل، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کے والدین اور سرپرست انھیں پرنسپل سے امتیازی کامیابی حاصل کرنے پر سند اور انعام حاصل کرتے دیکھ سکیں۔

الفت جلیس الحسن کے ہمراہ کھڑی تھی اور نگین اُن سے ذرا دور، اپنی سہیلیوں کے ساتھ جو اس کی طرح اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے نتائج سننے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔

الفت کے لیے یہ ایک نیا تجربۂ زندگی تھا۔

جہاں وہ کل خود کھڑی ہوا کرتی تھی وہاں آج اس کی سابقہ برادری کے دوست احباب کھڑے تھے۔

اور جہاں وہ دوسروں کو کھڑا دیکھا کرتی تھی وہاں آج خود کھڑی تھی۔

بساطِ حیات پر انسان مُہرے ہی تو ہیں۔

الفت کے قریب کھڑی ایک خاتون نے پوچھا۔ "آپ کس کا رزلٹ سننے آئی ہیں؟"

"جی اپنے بچوں کا۔" جلیس الحسن نے اُسے کہتے سُنا۔

نتائج کے اعلانات شروع ہوئے تو طلبہ سے زیادہ اُن کے والدین کا اضطراب دیدنی تھا۔

دیگر والدین کی طرح جلیس الحسن بھی اعلانات پر کان لگائے کھڑے تھے۔

الفت کی نگاہیں بھی سامنے اسٹیج پر لگی تھیں جہاں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ یکے بعد دیگرے پرنسپل سے اپنی امتیازی کامیابی کی سند اور انعام وصول کرنے آتے چلے جا رہے تھے۔

اوّل، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کے نتائج کا اعلان اسمبلی میں کیا جا رہا تھا باقی طلبہ کو اُن کے رپورٹ کارڈ اُن کے کمرۂ جماعت میں دیے جانے کا اعلان پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔

زرمین کی جماعت میں اوّل اور سوم پوزیشنیں لڑکوں نے حاصل کی تھیں اور دوم ایک لڑکی رہی تھی۔

فراز کی جماعت کے نتیجے کا اعلان ہوا تو جلیس الحسن کی توقع کے مطابق وہ اپنی جماعت کے ذہین ترین بچوں میں شامل تھا۔

فراز حسن...... سیکنڈ۔

یہ اعلان سُن کر جلیس الحسن مسکرا دیے۔

اور پُرجوش انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے جب انھوں نے الفت کی جانب دیکھا تو اُسے بھی جوش و خروش سے تالیاں بجاتے اور مسکراتے پایا۔

نگین اُن سے ذرا دور تالیاں بجاتے ہوئے انکھیوں سے الفت کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی "یہ تو بڑی تیز نکلی۔ کیا خوب اداکاری ہے!"

اور جلیس الحسن الفت کو ایسے بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔

شاید انھیں اُس کا یہ بدلا ہوا رُوپ تھا جسے دیکھ کر وہ حیرانی اور بے یقینی سے دوچار نہ ہوتے اگر وہ اُس کا وہ پہلا روپ نہ دیکھ چکے ہوتے۔

نتائج کے اعلانات ختم ہونے کے بعد جب فراز اپنا رپورٹ کارڈ، سند اور انعام لیے جلیس الحسن کے پاس آیا تو انھوں نے اُسے پیار کیا۔

نگین بھی لپکی اور اُس نے اُسے پیار کر کے شاباش دی۔

الفت اُس کی طرف بڑھی تو اُس نے جھجک کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر الفت نے بڑی سرعت سے اُس کو پیار کر لیا۔

جلیس الحسن اور خود الفت کے لیے بھی فراز کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا محال تھا کہ اُس نے الفت کے اس اقدام کو خاصی ناگواری سے دیکھا تھا۔

زرمین اپنی جماعت میں ساتویں نمبر پر رہی تھی۔

اس شام جب جلیس الحسن گھر واپس لوٹے تو الفت نے فراز اور زرمین کے پاس ہونے کی خوشی میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا۔

دونوں کے لیے میز پر رنگین کاغذوں میں ملفوف تحائف بھی موجود تھے جن پر ننھے ننھے تہنیت نامے چسپاں تھے۔ جلیس الحسن نے ان تہنیت ناموں کو کھول کر دیکھا اور انھیں پھر ایک خوشگوار حیرانی اور ایک موہوم سی بے یقینی نے آ لیا۔

تہنیت نامے پر درج تھا:

فراز بیٹے کے لیے۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ

ممّا کی طرف سے!

اور دوسرے پر لکھا تھا

گڑیا کے لیے

ڈھیروں پیار کے ساتھ

ماں کی طرف سے!

جلیس الحسن نے متذبذب نگاہوں سے الفت کی جانب دیکھا اور بولے "یقین نہیں آتا۔"

"کس بات کا؟"

"کہ تم وہی پرانی والی الفت ہو!"

وہ ایک سرد آہ کو سینے میں گھونٹ کر رہ گئی۔

انھیں کیا خبر تھی کہ

وہ ان دنوں ایک کٹھن کہانی پڑھتے ایک ایسے رستے پر چل رہی تھی جس پر ہر قدم کا اُٹھنا موت کے برابر تھا

لمحہ لمحہ دل سہا جاتا تھا!

ہر قدم پر ایک ڈر سا رہتا تھا!

گر جانے اور پھسل جانے کا خوف۔

انھیں کیا معلوم تھا کہ

اس نئے راستے پر اُسے اپنے ہر قدم تلے خود اپنا ہی دل کراہتا محسوس ہوتا تھا۔

اُلفت نے سوچا۔
پھر اس مسئلے کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔
اپنی خوشی کی خاطر تو بڑے بڑے جھک جایا کرتے ہیں۔
کیا عجب کہ وہ بھی جھک جاتیں!
وقتی طور پر سہی........ بادلِ ناخواستہ سہی مگر مصلحتاً سہی۔
جیسے کہ وہ خود جھک گئی تھیں۔
لیکن وہ جانتی تھی کہ اگر اُس نے جلیس الحسن کی عدم موجودگی میں نگین سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ ٹال جائے گی۔
چنانچہ اُس نے نگین اور زرتی کے جنم دن کا پروگرام طے کرنے کے لیے جلیس الحسن کی موجودگی میں بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اگلے ہی دن کھانے کی میز پر یہ ذکر چھیڑ دیا۔

"ہاں نگی بیٹا اس دفعہ ہم آپ کا اور زرتی کا برتھ ڈے ویسے ہی منائیں گے جیسے پہلے منایا کرتے تھے؟"
"کیا ضرورت ہے پاپا؟" نگین بولی۔
"ضرورت یہ ہے کہ عرصہ ہوا آپ کی دوستوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس بہانے ہم اُن سے ملاقات ہی کر لیں گے۔"
"نہیں پاپا، میں کسی دوست کو بلانا نہیں چاہتی۔" [illegible] نے کہا۔
"کیوں؟"
"بس ایسے ہی۔"
"کوئی تو وجہ ہو؟"
نگین چپ رہی۔
"بولو بیٹا؟" جلیس الحسن نے کہا۔
"پاپا.... وہ لوگ اُلٹی سیدھی باتیں پوچھیں گی۔"
"کیسی باتیں؟"
"اُلٹے سیدھے سوال کریں گی وہ۔"
"کیسے سوال بیٹا؟"
نگین مضطربانہ اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔
"بولو بیٹا؟" جلیس الحسن کے لہجے میں اصرار کی کیفیت عود آئی۔
"اوہ.. پاپا.. میں آپ کو نہیں بتا سکتی کہ وہ کیسی کیسی باتیں کر سکتی ہیں؟" نگین نے نگاہ جھکا کر کہا پھر فیصلہ کن انداز میں بولی
"نہیں پاپا! میں اپنی کسی دوست کو اپنے گھر بلانا نہیں چاہتی..... کیونکہ میں اُن کے سوالوں کا سامنا نہیں کر سکوں گی؟"
اُلفت کے لیے نگین کا یہ روپ قطعاً انجانا تھا۔
اُس نے تو اُسے ایک بے باک اور خود سر لڑکی کے روپ میں دیکھا تھا۔
الجھا الجھا اور مضطرب سا یہ روپ وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔
اُس کے دلکش چہرے پر اُداسی اور دکھ کے سائے لرزاں تھے۔
اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خفت، [illegible] تھی۔
یوں لگتا تھا جیسے وہ خوف زدہ سی ہو۔
اُلفت نے گہری نگاہوں سے اُس کا جائزہ لیا۔ اور اُسے یوں لگا جیسے نگین بھی خود اُسی کی طرح دکھوں اور کچھ معلوم اور کچھ نامعلوم سے شکوک [illegible] میں محصور تھی۔
وہ نہ جانے کن خدشات کے تحت اپنی دوستوں کو گھر بلا کر اُن کے سوالوں کا سامنا کرنے سے خائف نظر آ رہی تھی۔
اُلفت کو یوں لگا جیسے نگین کے چہرے پر لرزاں دکھ اور اُداسی کے سایوں میں وہ خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو۔

اُس نے میز کے نیچے دائیں سے جلیس الحسن کا پاؤں دبایا اور اُن سے اشاروں کی زبان میں کہا "بس باقی مجھ پر چھوڑ دیجیے۔"
چنانچہ جلیس الحسن نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔

جون میں نگین کے سالانہ امتحانات ہونے والے تھے۔ چنانچہ ان دنوں رات گئے تک جاگنا اُس کا معمول بنا ہوا تھا۔
اُلفت رات کے کھانے کے بعد عموماً اُس کو ایک کپ چائے بنا کر اُس کے کمرے میں بھجوا دیا کرتی تھی۔
لیکن اُس رات وہ ایاز اور فرزانہ کے کمروں کی بتیاں گل ہو جانے کے بعد خود چائے کی ٹرے لے کر نگین کے کمرے اوپر جا پہنچی۔
کمرے کے نیم وا دروازے کی جھری سے اُس نے اندر جھانکا۔
زرتی سو چکی تھی۔
نگین دروازے کی جانب پشت کیے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اپنی پڑھائی میں منہمک تھی۔
اُس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔
"آ جاؤ بھئی!" نگین نے پلٹ کر دیکھے بنا کہا۔
غالباً اُسے یقین تھا کہ حسبِ معمول ملازم اُسے چائے پہنچانے آیا ہوگا۔
مگر اُلفت کو دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر ناگواری بکھر گئی۔ جس سے اُلفت کو قدرتی طور پر ملال ہوا۔
"ہر گھر کی کہانی مختلف ہوتی ہے۔" اُس نے سوچا۔ "عام خیال کے مطابق سوتیلی ماں ظالم و جابر ہوا کرتی ہے۔ اپنے سوتیلے بچوں سے بے رحمی برتتی ہے۔ اُن سے نفرت کرتی ہے لیکن جس گھر کی کہانی میں میں سوتیلی ماں کا کردار ادا کر رہی ہوں وہاں سوتیلے بچوں نے بے اتفاقی اور نفرت کی انتہا کر دی ہے۔" دل ہی دل میں ایک سرد آہ اُس کے سینے میں [illegible] کر رہ گئی۔ اگرچہ وہ [illegible] دلچسپی نہ ہونے اور اعتبار [illegible] رکھنے کے ضمن میں انتہائی [illegible] ہونے کے باوجود اُسے [illegible] عام [illegible] آ گیا۔ "[illegible] بے خبر ہونے تک؟"
"بیٹا! چائے لائی ہوں تمہارے لیے۔" اُلفت نے اپنی آمد کا جواز پیش کیا۔
"سلیم روزانہ پہنچا دیتا ہے آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" نگین نے خشکی اور ناگواری سے کہا۔
"چائے پینے سے تھوڑا سا تازہ دم تو محسوس کرتی ہوگی تم؟ ہے نا؟" اُلفت نے بے تکلفی کی فضا ہموار کرنے کی کوشش کی۔
نگین کچھ نہیں بولی۔
اُس نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ یہ گویا اس امر کا خاموش اظہار تھا کہ وہ اُس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔
بلکہ شاید اپنے کمرے میں اُس کی موجودگی کو بھی برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔
مگر اُلفت بھی پسپا ہونے کے موڈ میں نہ تھی۔
"جن دنوں میرے امتحان ہوتے تھے تب ہر گھنٹے پون گھنٹے بعد ایک کپ چائے ضرور پیا کرتی تھی!"
"تو میں کیا کروں؟" نگین کی خاموشی نے اس کا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔
اُلفت دوسری کرسی کھینچ کر اُس کے نزدیک بیٹھ گئی۔
نگین نے چونک کر منہ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اُسے دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں استفہامیہ کیفیت عود کر آئی جیسے پوچھتی ہو:
"بیٹھ کیوں گئیں؟"
"بیٹا! یہ تو بتاؤ تم اپنی دوستوں کو کیوں نہیں بلانا چاہتیں؟" اُلفت نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔
نگین نے پہلے کی نسبت زیادہ چونک کر اُس کی جانب دیکھا جیسے اُسے اُس سے اس قسم کے استفسار کی توقع

"پتا ہے جانی! کل رات انھوں نے مجھ سے ایسی باتیں کیں جو اُن سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں کی تھیں...... پاپا نے بھی نہیں۔"

"ہائے! ایسی کون سی باتیں تھیں؟"

تمکین نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے اپنے بالوں کو سمیٹا پھر گمبھیر لہجے میں بولی: "تم تو جانتے ہو بھائی کہ ممی کے جانے کے بعد ہم چاروں نے اپنے دوستوں کو اپنے گھر بلانا اور خود بھی اُن کے گھر جانا کیوں چھوڑ دیا تھا اور جب آپ چھوٹے ہوتے ہیں......"

تمکین کے لہجے کا درد اعجاز کے چہرے پر دکھ بن کر پھیل گیا۔

"اس لیے تاکہ......" تمکین سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی: "ہم کسی کو یہ بتانا نہیں چاہتے تھے کہ ممی ہم سے دور چلی گئی ہیں لیکن...... پھر...... پتا نہیں کیسے سارے دوستوں کو پتا چل گیا کہ ہماری ممی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں اور انھوں نے الٹی سیدھی باتیں بنانا شروع کر دیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دوبار تم نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے جن دوستوں کو پتا چل گیا ہے انھوں نے ممی کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں بنانا شروع کر دی ہیں۔ فرزانہ اور زینت کے دوستوں نے کئی سوالات کیے اور ہم چاروں میں سے کوئی بھی نہ تو ممی کے بارے میں اُن کی الٹی سیدھی باتوں پر انھیں ڈانٹ سکا نہ اُن کے عجیب و غریب سوالات کے جواب دے سکا...... پاپا کو ہم یہ بھی نہ بتا سکے کہ ہمارے دوست ہمیں کس طرح تنگ کرتے ہیں، کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم خود ہی اندر ہی اندر گھٹتے رہے اور ہم نے چپ چاپ اپنے دوستوں سے دوستیاں توڑ لیں اور اب عالم یہ ہے کہ ہمارے جو گنے چنے دوست رہ بھی گئے ہیں انھیں بھی نہ تو ہم اپنے گھر بلانے کی جرأت رکھتے ہیں نہ خود اُن کے گھر جاتے ہیں، کیونکہ ہم ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کون کس وقت کیا پوچھ لے؟"

"تم یہ سب کیوں دہرا رہی ہو؟" اعجاز نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ کل رات سے پہلے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ممی کے بارے میں لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں اور ان کے عجیب غریب سوالات کا جواب کیونکر دیا جا سکتا ہے۔ جب بھی سوچتی تھی کہ اس سلسلے میں میں کبھی بھی کسی سوال کا سامنا نہ کر سکوں گی۔ مجھے اس خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ اگر کبھی مجھ سے کسی نے ممی کے بارے میں پوچھ لیا تو میں کیا جواب دوں گی...... ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ گھر میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ہماری اس الجھن کو سمجھتا ہو...... لیکن کل رات......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں بولو! رک کیوں گئیں؟ کل رات؟" اعجاز نے بے تابی سے پوچھا۔

"کل رات پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ کوئی ہے ہمارے گھر میں جو ہماری اس الجھن کو سمجھتا ہے۔"

"کون؟"

"وہی!"

"وہی کون؟"

"جن سے تم جھگڑا کر کے گئے تھے، تم مجھے بتا چکے تھے۔" تمکین نے اعجاز سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"لیکن......" اعجاز تذبذب میں نظر آنے لگا۔

"لیکن کیا؟"

"اُسے کیسے پتا چلا؟" اعجاز نے الجھن کی بابت پتا دینے والی قدرے غیر یقینی نظر بہن پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتی!"

"ہم چاروں میں سے کسی کے بتائے بغیر کیسے پتا چل سکتا تھا اُسے؟" اعجاز نے گہری نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے بتایا ہوگا؟" تمکین بُرا مان گئی۔

"نہیں نہیں! تمہیں کب کہہ رہا ہوں مگر کسی نے تو بتایا ہوگا...... ہو سکتا ہے پاپا نے بتا دیا ہو!" اعجاز نے خیال آرائی کی۔

"مگر جہاں تک مجھے یقین ہے ہم میں سے کسی نے پاپا سے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔"

"تو پھر کیسے پتا چلا اُسے؟"

"میرا خیال ہے صرف عقل سے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ رات مجھے اُن کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کافی عقل مند عورت ہیں۔"

"ارے! کوئی جادو تو نہیں پڑھ کر پھونک دیا اُس نے تم پر!" اعجاز نے تیکھے تیوروں کے ساتھ کہا۔

"نہیں! جادو پھونکنے کی بات نہیں...... وہ واقعی عقل مند ہیں۔"

"اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ وہ کہیں سے تعویذ لائی ہوگی اور وہ اُس نے تمہیں چائے میں گھول کر پلا دیا ہوگا۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اُس وقت تک میں نے چائے نہیں پی تھی۔"

"سر پر گھما دیا ہوگا تعویذ تمہارے۔"

"جی نہیں۔" تمکین زچ ہو کر بولی: "سر پر تو انھوں نے بس اُس وقت ہاتھ رکھا تھا جب وہ بہت پیار کر کے جانے لگی تھیں۔"

"اوہ! تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہارے اوپر جادو کر دیا گیا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو...... جاہل عورتوں کی طرح۔"

"تم بے وقوفی کہہ رہی ہو اور مجھے تم پر بُری طرح غصہ آ رہا ہے۔" اعجاز واقعی غصے میں نظر آنے لگا تھا۔

"خواہ مخواہ غصہ آ رہا ہے۔"

"خواہ مخواہ!" اعجاز پاؤں پٹخ کر بولا: "تم جسے عقل مند کہہ رہی ہو وہ فراڈ ہے...... چالاک اور مکار ہے۔"

تمکین اُسے غصے میں آتے دیکھ کر نرم پڑ گئی۔

"سکون سے...... اطمینان سے...... پہلے میری پوری بات تو سُن لو۔"

"کیا سُن لوں؟" وہ جھنجھلا کر بولا۔

تمکین کچھ دیر چپ رہی کہ اُس کے خیال میں اعجاز کو اُس کے ہیجان سے سنبھلنے کے لیے کچھ وقفہ دینا ضروری تھا۔ پھر اُس نے رسانیت سے کہا: "میں مانتی ہوں کہ وہ چالاک ہیں مگر جانی انھوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جو اُن سے پہلے کسی نے نہیں بتائی تھی...... پتا ہے کیا بتایا انھوں نے؟" تمکین نے خواہ مخواہ چاہت سے بھائی کو دیکھا۔

وہ زبان سے کچھ نہیں بولا مگر اُس کی آنکھوں نے پوچھا "کیا؟"

"انھوں نے مجھے بتایا کہ اس دنیا کا دستور ہے کہ جو اِس سے ڈرتے ہیں انھیں یہ اور ڈراتی ہے اور جو اس کے آگے سینہ تان کر مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اُن سے یہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتی ہے، لہٰذا دنیا سے ڈرنا نہیں اس کا مقابلہ کرنا چاہیے اور...... جو ٹریجڈی ہمارے ساتھ ہوئی ہے وہ ہم سے پہلے بھی بہت سوں کے ساتھ ہو چکی ہے۔ آخر انھوں نے بھی تو دنیا کا سامنا کیا ہی تو پھر ہم کیوں ڈریں!" تمکین نے اُسے بتایا۔

"بس اتنی سی بات پر تم اُن کا کلمہ پڑھنے لگیں!" اعجاز زہر خند لہجے میں بولا۔

"نہیں اور بھی بہت کچھ کہا انھوں نے...... اور تم یقین کرو جانی کہ میں رات سے خود کو بدلا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے اب میں واقعی دنیا کو فیس کر سکتی ہوں۔ اپنی دوستوں کا سامنا کر سکتی ہوں اور جو زیادہ کرید کرنے کی کوشش کرے اُس سے کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی کوشش مت کرو۔ مائنڈ یور اون بزنس۔" وہ بھی جیسے بول پڑی۔ "پتا ہے اتنی ہمت کیوں آگئی ہے مجھ میں؟"

"بس اب اپنی بکواس بند کرو۔"

تمکین ہنس دی۔

اعجاز کا بڑھتا ہوا پارہ اُسے اعجاز کے ساتھ اِس موضوع پر مزید کوئی بات نہ کرنے کا مشورہ دے رہا تھا سو وہ چپ ہو رہی۔

مگر اُس نے جی ہی جی میں کہا۔

"اتنی ہمت اس لیے آگئی ہے مجھ میں کہ انھوں نے کہا ہے میری سالگرہ میں آنے والی دوستوں کو وہ خود مطمئن کریں گی، اُن کے ہر سوال کا جواب دیں گی...... اور ہاں یہ بھی تو کہا ہے انھوں نے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں اب تم تنہا نہیں ہو۔ تمہارا دکھ بانٹنے کو میں یہاں موجود ہوں۔"

الفت بیگم کو کیا، عجاز کو بھی تگین کو یوں کھو رہا تھا۔ آج نگین پر جیسے ہی بی پی تحت غضب آرہا تھا۔ جو اپنے دلکش لباس میں ملبوس خاصی مسرور نظر آرہی تھی۔

نزین کا حال بھی نگین سے چنداں مختلف نہ تھا۔ بعینہ نگین جیسے لباس میں ملبوس وہ اپنی ہم سن سہیلیوں کے جھرمٹ میں کسی خوش رنگ تتلی کی مانند ادھر سے اُدھر پھرتی پھر رہی تھی۔

فراز اگر بہت خوش نہ تھا تو اعجاز کی طرح افسردہ اور الگ تھلگ بھی نہ بیٹھا تھا۔

ضیافت کی دعوت میں میزبانی کا تجربہ اس تقریب میں الفت کے بہت کام آیا۔

ویسے تو اس نے ایک ایک مہمان کا بنفس نفیس خیال رکھنے کی کوشش کی لیکن تقریب کے آغاز سے اختتام تک بچوں کے دوستوں بالخصوص نگین کی سہیلیوں پر خصوصی التفات رکھا۔

نزین کی سہیلیوں سے پیار چمکار سے بات کی۔

نگین کی سہیلیوں سے چلتے پھرتے چہکتے چہکتے باتیں کرتی رہی۔

ان سے عمر و مرتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ہنسی مذاق بھی کیا۔

کسی کے لباس کی تراش خراش کی تعریف کی۔

کسی کی آرائش گیسو کی۔

کسی سے کہا ”تم ہنستی ہوئی بہت خوبصورت لگتی ہو۔“

کسی کی مسکراہٹ کو موتی بکھرنے سے تعبیر کیا۔

کسی سے پوچھا ”تم نے اپنی قمیص پر کڑھائی کہاں سے کروائی، بہت نفیس ہے۔“

کسی کی جیولری کو سراہا۔

کسی کو ڈیئر کہا کسی کو ڈارلنگ۔

کسی کو بیٹی کسی کو جان۔

اُن میں سے ہر ایک کا فرداً فرداً تعارف حاصل کیا۔

اُن کے مشاغل اور مصروفیات کی بابت استفسار کیا۔

چلتے پھرتے ٹی وی کے فنکاروں اور نئے پرانے ٹی وی پروگراموں پر خیال آرائیاں بھی ہوئیں۔

اُن کے سامنے نگین کی خوبیوں اور اُس کی تعریفوں کے اونچے اونچے پُل بھی باندھے۔

اور اُن کی موجودگی کا قدم اٹھاتے ہوئے نگین سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی کی۔

اُس نے اُن کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

الغرض اُس نے نگین کی نوجوان سہیلیوں پر اپنی توجہ کی ایسی بوچھاڑ رکھی اور انھیں اپنی ہی باتوں اور خوش اخلاقیوں میں اس طرح الجھائے رکھا کہ انھیں نگین سے کوئی الٹی سیدھی بات کرنے یا سوال پوچھنے کی مہلت ہی نہ دی بلکہ باتوں ہی باتوں میں بالواسطہ طور پر یہ بھی جتا دیا کہ دوسروں کے ذاتی معاملات میں مداخلت یا ایسی باتوں کے بارے میں استفسار جو دوست رہتا نہ جانیں کچھ مستحسن بات نہیں ہوتی۔

نگین کی دوستوں کے ساتھ ساتھ اُس نے جلیس احسن کے دوستوں اور اُن کی بیگمات اور اپنے میکے والوں کی آؤ بھگت میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔

شام چھ بجے شروع ہوئی تقریب رات ایک بجے کے لگ بھگ اختتام پذیر ہوئی۔ نگین اور نزین کی بعض دوستوں کو اُن کے گھر بھی پہنچوانا پڑا۔

تقریب کے اختتام تک الفت کی پنڈلیاں اور ایڑیاں بُری طرح دُکھنے لگی تھیں۔ درد کے مارے سر پھٹا جا رہا تھا۔ مگر بُری طرح تھک جانے کے باوجود اُس کی پیشانی پر ایک ہلکی سی شکن بھی نہ تھی۔

وہ خوش تھی کہ سب کچھ بہت اچھی طرح انجام پا یا تھا۔

خوش تو نگین بھی کچھ کم نہ تھی کہ اُس کی دوستوں نے تقریب کے جملہ انتظامات کو سراہا تھا، اُس سے کوئی الٹا سیدھا سوال نہ کیا تھا، ممی کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تھا۔

ان سب کی متعلقہ اسے نہیں تھی کر:

”تمہاری نئی ممی بہت اچھی ہیں۔“

لالہ رُخ نے جو اُس کی سہیلیوں میں سب سے زیادہ شوخ اور منہ پھٹ تھی کہا تھا ”یار نگین! ذرا تم اپنے پاپا سے پوچھ کر بتانا کہ اس قسم کی ممیاں کہاں ملتی ہیں۔ میں بھی اپنے ڈیڈی سے ایک دو منگواؤں گی۔“

نگین کی دوستوں کا جتھا کا جتھا لالہ رُخ کی اس بات پر زعفران زار ہو گیا تھا۔

کھانے کے دوران جب الفت نگین کی ایک سہیلی کی پلیٹ میں دلچسپی اور تکلف سے کام نہ لینے کا اصرار کر رہی تھی تو نگین کی دوست ربیکا نے کہا تھا ”نگین ڈارلنگ! تم نے اپنی اتنی سوئیٹ سی ممی کو ہم سب سے کیوں چھپا رکھا تھا اب تک؟“

”تاکہ نظر نہ لگ جائے۔“ سبیلا حبیب الدین نے برجستہ کہا۔

رخصت ہوتے سمے اُن سب نے فرداً فرداً الفت سے کہا ”آنٹی! آپ ہمارے ہاں آئیے گا۔“

”ضرور آؤں گی بیٹا۔“ الفت مسکرا مسکرا کر کہتی رہی۔

اُن میں سے بعض نے نگین سے کہا ”نگین! تم کسی روز اپنی ممی کو ہمارے گھر لے کر آؤ نا۔“

”اچھی بات ہے آؤں گی۔“ نگین کو کہنا پڑا۔

جلیس احسن کو ایک بڑی تقریب کے بخیر و خوبی انجام پذیر ہونے کی جو خوشی تھی سو تھی، اس سے زیادہ خوشی انھیں اس بات کی تھی کہ دورانِ تقریب نگین اور نزین نے الفت سے خاصی مفاہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ فراز بھی ٹھیک ٹھاک ہی رہا تھا۔

ایک ایک مہمان کو رخصت کرنے اور بچوں کو شب بخیر کہنے کے بعد جب وہ اور الفت کمرے میں آئے تو انھوں نے الفت کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا ”شکریہ۔“

”کس بات کا؟“ اُس نے سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرے بچوں کی خوشی میں خوش ہونے کا۔“

”آپ شاید بھول رہے ہیں کہ“ الفت نے شکوہ کُن لہجے میں کہا ”وہ صرف آپ کے نہیں میرے بھی بچے ہیں۔“

”تھینک یو…… تھینک یو ویری مچ ڈارلنگ۔“ وہ جذبات کی شدت سے بوجھل آواز میں بولے۔

لیکن ”حسن لاج“ کی بالائی منزل پر رات کے پچھلے پہر تک نگین سے تکرار میں مصروف تھا بلکہ نگین ہی کیا وہ تو نزین اور فراز سے بھی خفا تھا۔

”میں سب دیکھ رہا تھا کیسے دانت نکال نکال کر ہنس رہی تھیں تم اپنی دوستوں کے ساتھ اُس کے سامنے۔“ اُس نے نگین سے غصے میں کہا۔

”تو کیا تمہاری طرح منہ تھیوڑ کر بیٹھی رہتی؟“

”باتیں بھی کی جا رہی تھیں!“

”مجبوری تھی۔“

”اونہہ! مجبوری! ایسی کیا مجبوری آ پڑی تھی؟“

”اب اپنی دوستوں کے سامنے تو میں اُن سے منہ پھلا کر بیٹھنے سے رہی تھی۔ وہ اتنی محبت سے بات کر رہی تھیں کہ اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی جواب دینے پر مجبور ہو جاتے۔“

”ہاہ!“ وہ ہنکارا دے کر کے طنزاً ہنسا ”محبت سے بات کر رہی تھیں!“ اُس نے جلے بھنے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”فار گاڈز سیک جاجی!“ وہ اُس کے لہجے کی چبھن کی تاب نہ لا سکی۔

”اس غلط فہمی میں تم کب سے مبتلا ہو گئیں کہ وہ عورت تم سے محبت سے بھی بات کر سکتی ہے؟“

”جاجی! تم میری بات سمجھنے کے بجائے خفا میں دیوانے ہوئے جا رہے ہو۔“

”ہاں…… ہاں…… میں تو دیوانہ ہوں…… پاگل ہوں…… بے وقوف ہوں…… اُلو ہوں سب کچھ ہوں۔ عقلمند تو بس تم ہی ہو۔“ وہ پوری قوت سے کرسی کو لات مار کر اسے دُور اچھالتے ہوئے بولا۔

"تو پھر میں چاہوں گا کہ الفت گھر جائے تو بہتر ہے، ابھی بھی حال ہو رہا ہے۔" بھابی نے کہا تھا۔
پھر اگلے ہی روز تو اس کا یہ حال نہ ہوا تھا۔
بلکہ وہ تو اپنے گھر میں بولائی بولائی رہتی تھی۔
مجبور دامیان میں ایک زبردست بحران نے آن آ لیا تھا۔

اور تب اُسے اپنے گھر کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔
مگر آج اُسے اپنے گھر سے ویسا ہی پیار ہو چکا تھا جس کا تذکرہ ٹھیک ایک برس پہلے عظمت آپا اور بھابی جان اس کے ساتھ کرتی تھیں۔

واقعی اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔
اپنے گھر سے محبت کا اثر اس کی رگوں میں سرایت کر چکا تھا۔
گھر پیارا گھر، کیا کیمیتی فقرہ ہے۔
الفت کو اپنے گھر سے ایسی محبت ہو چکی تھی کہ اب کئی کئی دن امی کے ہاں جانے کا خیال نہ آتا تھا۔
یوں تو ان ہی پر بات ہوتی رہتی۔ پھر جلیس الحسن خود ہی کہتے "کیا بات ہے بھئی امی کے گھر کو بالکل ہی بھلا دیا ہے کیا؟ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"
وہ امی کے ہاں جتنی دیر بھی رہتی اس کا دھیان گھر ہی میں پڑا رہتا۔
عظمت آپا نے سچ ہی کہا تھا کہ
"عجیب رشتہ ہوتا ہے عورت اور اس کے گھر کے بیچ کہ شادی کے بعد کہیں اور جی ہی نہیں لگتا کہیں چلے جاؤ کتنی ہی دور کیوں نہ نکل جاؤ قدم اپنے گھر ہی کی طرف مڑتے ہیں؟"
اس روز صبح آنکھ کھلتے ہی اسے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اس گھر میں آئے اُسے ایک برس ہو چکا تھا۔ اس ایک برس میں اس نے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھے تھے۔
کتنی کٹھنائیوں سے گزری تھی!
شروع شروع اسے اس گھر میں اپنے قدموں تلے زمین سا گرتا رہے ابھی ریت کی طرح بے بھرم سا کرتی تھی مگر اب ہے یقین کی وہ کیفیت نہ تھی۔

شاید اسی لیے وہ خوش ہونے کے بجائے بڑی استقامت سے یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی نسبت سے اس دن کی اہمیت کو کون یاد رکھتا ہے؟
جونہی وہ بستر سے اٹھی اس کی نظر سائیڈ بورڈ پر دھرے ایک دلکش تہنیت نامے پر پڑی جس کے قریب ہی ایک ننھی ڈبیا دھری تھا۔
"کھیپی انیورسری" تہنیت نامہ اپنی بے زبانی کے باوجود کہہ رہا تھا۔
بلاشبہ یہ تہنیت نامہ جلیس الحسن کی جانب سے تھا۔
مگر وہ تب تک حیران ہو رہی تھی کہ اسے انھوں نے اس کے سرہانے آراستہ کس وقت کیا تھا کیونکہ ان کے سونے تک تو وہ جاگ رہی تھی۔

اُس نے تہنیت نامہ اٹھا کر کھولا۔
اندر لکھا تھا:
جانِ من!
شادی کی پہلی سالگرہ مبارک ہو،
نیک تمناؤں کے ساتھ
تمہارا اپنا
جلیس
اس تہنیت نامے کے ساتھ دھری نقرئی ڈبیا کھولی تو اندر پلاٹینم لاکٹ اور انگوٹھی پر مشتمل ہیروں کا ایک—

...سا بیوٹی فل سیٹ تھا۔
اور ایک ذرا سا جملہ ہے یاد رکھا تھا انھوں نے یہ دن!
جبکہ اس نے تو کوئی اہتمام نہ کیا تھا۔
اس لیے نہیں کہ وہ اہتمام کرنا نہیں چاہتی تھی۔
بلکہ اسے خدشہ تھا کہ انھیں اس دن کی اہمیت یاد نہ رہی ہوگی، اگر وہ کوئی اہتمام کرے گی تو انھیں ناحق خفت ہوگی۔
مگر انھوں نے تو اس کی کوشش ماندہ کر دیا تھا!
اور اب وہ ہراساں تھی کہ کیا کرے۔
ابھی وہ کوئی تدبیر نہ کر پائی تھی کہ وہ جاگ گئے۔ وہ انھوں نے مسکرا کر کہا: "شادی کی پہلی سالگرہ مبارک۔"
"آپ کو بھی۔"
"تحفہ پسند آیا؟" انھوں نے اس کے ہاتھ میں ڈبیا دیکھتے ہوئے کہا۔
"بہت!"
انھوں نے بستر سے اٹھ کر اُسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔
"آئی لو یو ڈارلنگ۔" وہ دھیرے سے بولے۔
"آئی لو یو ٹو۔" اس نے اپنا معمول کے جیسے "تاثر" دیا۔
"آج شام تم میری طرف سے ریگل کے ریسٹورنٹ میں مدعو ہو۔" وہ بولے۔
"اور بچے؟" اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔
"صرف ہم دونوں۔ بس ہم اور کوئی نہیں۔"
وہ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے انھیں تکتی رہی۔ پھر ان کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر بولی "جیسے آپ کی مرضی۔"
لیکن سہ پہر شام تک ہی امی، ابا، بھیا اور بھابی لدے پھندے پہنچے!
پھر عظمت آپا اور ان کے دو لائق بچوں کے آ گئے!!
اُن کے بعد تہنیت اور نبیل!!!
اور پھر فضیلت اور اُس کے دولہا!!!!
بیٹھے بٹھائے ایک چھوٹا سا جشن ہو گیا جس میں نگہت، نرجس اور فرزانہ بھی شامل ہو گئے۔
شام ڈھلے بیگم اور مختیار جہاں بھی اس جشن میں آ شامل ہو گئے۔
ان سب کے جاتے جاتے رات ہو گئی اور ریگل کے ریسٹورنٹ والا پروگرام ملتوی ہو گیا۔ جب مہمانوں نے رخصت کے لیے اور بچوں کو سب بچھونے کے بعد جب جلیس الحسن اپنے کمرے میں آئے تو بولے۔
"ایسا رومینٹک پروگرام بنایا تھا دھرا کا دھرا رہ گیا۔"
الفت مسکرا دی۔
"پہلوں سے پہلے یہاں آنا بھی تو آ سکتی تھی بھلا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"بہر حال ہماری خوشی میں سب شامل ہو گئے۔"
"مجھے یقین نہ تھا کہ سب لوگ اس دن کو اتنی محبت سے یاد رکھیں گے۔" الفت جذبات سے بوجھل آواز میں بولی۔
"ہاں مجھے بھی گمان نہ تھا۔"
"مجھے آپ سے معذرت کرنی ہے۔"
"کیسی معذرت؟"
"کہ میں آپ کو کوئی چھوٹا سا گفٹ بھی نہ دے سکی۔"
"میرے لیے اس سے بڑا گفٹ کیا ہو سکتا ہے الفت کہ تم نے مجھے خوشی دی ہے اطمینان دیا ہے۔"
الفت کو یوں لگا جیسے اُس کا وجود کسی ہلکی پھوار میں بھیگتا چلا جا رہا ہو۔
"اور یہ آپ کا دیا ہوا تحفہ سب کو پسند آیا۔" اس نے اپنے کانوں کی لو پر جھلکتے تابس کو چھوتے ہوئے کہا۔
"شادی کی پہلی سالگرہ پر عاصمہ کو بھی میں نے سیٹ ہی دیا تھا مگر سونے کا۔"

الفت دم بخود رہ گئی۔
لیکن ایک لمحوں میں انھوں نے عاصمہ کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔
کاش! ان کی زبان اس نام سے نا آشنا ہوتی۔

الفت سے نگین کی استواری میں مراسم بتدریج اُس کی مستقل ضرورت بلکہ شاید مجبوری بن گئی۔
ماں کے جانے کے بعد نگین کی شخصیت میں سب سے بڑی تبدیلی تو یہ رونما ہوئی تھی کہ وہ باپ جیسے خود کر ب
بڑا اور ساعجاز کی بجائے فراز اور زرین کی گویا بزرگ سروانے لگی تھی۔ نہ جانے کس جو در دواز دن سے اُس کے دل میں بہن
بھائی کے لیے ممتا کا درد امڈ آیا تھا وہ خود کو ان کی بہن سمجھنے کے بجائے اُن کی ماں سمجھنے لگی تھی۔
دوسری یہ کہ ماں کے جانے کے بعد اُسے لوگوں کی نگاہوں اور ان کی زبانوں سے خوف سا لگنے لگا تھا۔ نہ جانے کون کس وقت کیا کہہ بیٹھے۔ اُس نے خود کو ایک خول میں محصور کر لیا تھا اور اپنی دوستوں سے بھی دور ہو گئی تھی۔
الفت نے اس کا اعتماد بحال کیا۔
لوگوں کی نگاہوں اور زبانوں کا خوف اُس کے دل سے زائل کیا۔
اور اُسے احساس دلایا کہ بہن بھائیوں سے محبت کے معاملے میں اُس کا رویہ معقول ہونا چاہیے۔ اگر وہ ان کی بزرگ بننے کی کوشش کرے گی تو زندگی کی بہت سی ایسی خوشیوں سے محروم رہ جائے گی جن پر اس کا حق ہے۔
منقطع روابط بحال ہو گئے تھے۔
جلیس الحسن کے احباب اور بچوں کے دوستوں نے "حسن لاج" میں پھر ویسے ہی آنا جانا شروع کر دیا تھا جیسے کہ وہ عاصمہ بیگم کے زمانے میں آیا جایا کرتے تھے۔ الفت اُن کی ایسی پذیرائی کرتی کہ وہ اس کا کلمہ پڑھتے واپس لوٹتے۔
نگین کی سہیلیوں کے ساتھ تو اُس نے ایسا دوستانہ رویہ روا رکھا تھا کہ وہ تو نگین کے سامنے اس کی تعریفیں کرتے تھکتی نہیں۔
کبھی ایک سہیلی اپنی ممی کو اُس سے ملوانے کے لیے چلی آتی کبھی دوسری۔
آئے دن نگین کو اپنی سہیلیوں کی جانب سے دعوت نامے ملنے لگے۔
کبھی کسی سہیلی کے اپنے جنم دن کی تقریب میں شرکت کا بلاوا تو کبھی ...... کسی کی بہن کی منگنی یا شادی کی دعوت۔
کوئی اپنے بھائی کے ولیمے میں بلا رہی ہے تو کوئی بھتیجے کے عقیقے میں۔
کبھی کسی پکنک میں شرکت کی پُر زور دعوت تو کبھی لالہ رخ جیسی امیر کبیر باپ کی بیٹی کی جانب سے مضافات میں واقع فارم پر چلنے کا اصرار۔
الغرض نگین کی دوستوں میں الفت کی خاصی شہرت ہو گئی اور الفت سے مزید بے تکلفی اختیار کرنا نگین کی خواہش اور مجبوری بن گئی۔
چونکہ فراز اور زرین دونوں ہی نگین کے زیر اثر زیادہ تھے اس لیے الفت کے ساتھ نگین کے بدلے ہوئے طرز عمل کا انھوں نے براہ راست اثر قبول کیا۔
فراز نے الفت سے تمام تر دوری ختم کر دی اور نگین کے ایما پر الفت کے ساتھ تمیز سے پیش آنے لگا تھا۔
زرین نے الفت کی نقالی کر کے بہن بھائیوں کو محظوظ کرنا ترک کر دیا تھا اور فراز کی طرح وہ بھی الفت کے ساتھ تمیز داری کا مظاہرہ کرنے لگی تھی۔
گھر میں بتدریج ایک سہانا اور خوشگوار تبدیلی ظہور پذیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

نگین کے امتحانات ختم ہو چکے تھے۔

اعجاز کو تو مشغولیت سے فرصت پا کر گھر بیٹھے ڈھائی ماہ سے زائد عرصہ ہونے کو آیا تھا معتبر ذرائع کے مطابق ابھی اس کا نتیجہ آنے میں کم از کم ڈیڑھ ماہ اور درکار تھا۔
فراز اور زرین کی موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو گئیں تو جلیس الحسن نے ایک رات الفت سے کہا۔
"تمہارا ایک قرض ہے مجھ پر بچوں کی چھٹیاں ہیں موقع غنیمت ہے تمہارا قرض اتار دیا جائے۔"
"کیسا قرض؟" الفت نے حیرانی سے پوچھا۔
"ہنی مون؟"
"اوہ! ...حد کر دی دیکھیے" الفت نے محجوب ہو کر کہا۔ "اب برسوں بعد آپ کو ہنی مون کا خیال کیوں آیا؟"
"کیونکہ اب ہنی مون منانے کا موڈ ہو رہا ہے۔" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔
الفت گلنار ہو گئی۔
"کام کر کر کے تھک گیا ہوں اور پچھلے دو ڈھائی برس کے دوران اتنا اپ سیٹ رہا ہوں کہ اب ایک ڈیڑھ ماہ آرام اور تفریح کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے اپنا سر الفت کے زانو پر رکھتے ہوئے کہا۔
"تفریح کے لیے جائیں گے کہاں؟" الفت نے اُن کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے پوچھا۔
"تم کہاں جانا چاہو گی؟" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولے۔
"جہاں آپ لے جائیں۔"
"یورپ چلو گی؟"
اُسے ایک خوشگوار حیرانی نے آلیا۔
وہ تو زیادہ سے زیادہ مری اور سوات تک ہی جانے کا سوچ سکتی تھی کیونکہ وہ ایک ایسے ہی متوسط گھرانے سے جلیس الحسن کی منکوحہ بن کر "حسن لاج" میں آئی تھی جہاں رہنے والی دوشیزائیں شادی کے بعد ہنی مون کے لیے زیادہ سے زیادہ سوات، مری، کاغان یا کشمیر ہی جانے کا تصور کر سکتی ہیں۔ یورپ اس کے گمان سے بہت باہر تھا۔
"بولو یورپ چلنا ہے؟"
"بہت دور نہ ہوگا اور ...... ؟"
"ہاں اور کیا؟"
"بہت مہنگا بھی ... ہم ہزاروں لگے بہت اخراجات ہو جائیں گے۔"
وہ یوں مسکرا دیے جیسے اُس نے کوئی احمقانہ بچگانہ سی بات کہہ دی ہو۔
"جانِ من! نہ دوری کو خاطر میں لاؤ نہ اخراجات کو...... انشاء اللہ جب یہاں سے نکلیں گے شب کو یورپ میں ہوں گے۔ رہی اخراجات کی بات تو بیٹا پیسہ کمانا کس کے لیے ہے؟ اپنے بیوی بچوں ہی کے لیے تو!" انھوں نے تو قف کیا پھر بولے۔ "تمہاری جگہ اگر عاصمہ ہوتی تو فوراً کہتی کل کے چلتے آج ہی چلیے۔ ہر دوسرے برس وہ یورپ کی سیر کی فرمائش کیا کرتی تھی اور میں اُسے لیے جایا کرتا تھا۔"
عاصمہ کے ذکر پر الفت ہمیشہ کی طرح دم بخود رہ گئی تھی۔
کسی بھی سبب سے سہی اُس نے عاصمہ کے بچوں کو تو قبول کر لیا تھا مگر جلیس الحسن کی زبان سے کسی بھی حوالے سے عاصمہ کا نام سُن کر اُس کے رگ و پے میں آگ سی دوڑ جایا کرتی تھی۔
گو اُس نے حالات سے مفاہمت تو کر لی تھی مگر اُس کے دل میں یہ خدشہ ہنوز کنڈلی مارے بیٹھا تھا کہ عاصمہ اس گھر میں کبھی بھی واپس آ سکتی تھی کیونکہ اس گھر میں اُس کے بچے تھے جن سے اُس کا ناتا بدستور برقرار تھا۔
"بچوں کے پاسپورٹ تو موجود ہیں تمہارا نیا پاسپورٹ بنوانا ہے اور ویزا کی درخواست ایک آدھ روز میں جمع کروا دیتا ہوں ...... آج کل میں فرصت ملتے ہی تمہاری تصویریں کھنچوا لیں پاسپورٹ کے لیے ...... ٹھیک ہے؟"
مگر وہ تو خدا جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی۔
"کس سوچ میں پڑی ہوئی ہو؟"
"آں ...... جی ...... جی کچھ نہیں۔"
"یورپ ان دنوں اپنے جوبن پر ہو گا۔ وہاں کے حساب سے بہترین موسم ملے گا لیکن یہاں کے حساب سے تو ...

تھیں گزشتہ رات صرف فون ہی پر بات ہو سکی تھی ان بہنوں سے گھر پر۔

لیکن آج کل صبح تین بجے کے لگ بھگ جب وہ جلیس الحسن اور بچوں کے ہمراہ یورپ روانگی کے لیے ایئرپورٹ پہنچی تو آنٹیوں بہنیں مع اپنے شوہروں کے، بھتیجا، بھائی اور پاپا انھیں رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔

وہ خوش تو تھی

مگر خوشی کا مظاہرہ زیادہ کر رہی تھی۔

بہنیں اور بھاوج اُسے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔

اُس نے جلیس کی قرض اتارنے والی بات اُن سب کو دانستہ سنائی۔

ڈیپارچر لاؤنج کے باہر پاپا نے اُس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا "بیٹی بہت خوش ہوں میں تمہیں خوش دیکھ کر۔"

پاپا کی یہ بات جہاز تک بھی اُس کے ساتھ در آئی۔

جب چاق و چوبند فضائی میزبان خواتین مسافروں کو صبح کا ناشتہ کروا چکیں تو ..... نگین اور اعجاز موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگے اور فراز اور نورین ٹی وی اسکرین پر فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئے جلیس الحسن اُس سے کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر رات بھر کی جگائی کا حساب بے باق کرنے کو انھوں نے آنکھیں موند لیں اور الفت کو جہاز کی بند کھڑکی سے باہر بادلوں کے سمندر کو دیکھتے ہوئے بے اختیار بابا کی بات یاد آ گئی۔

"بیٹی بہت خوش ہوں میں تمہیں خوش دیکھ کر۔"

اُس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

"اوہ بابا! آپ سب لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ میں بہت خوش ہوں۔" اُس نے جی ہی جی میں کہا "مگر سچ یہ ہے کہ میں اتنی خوش ہرگز نہیں ہوں جتنی کہ آپ سب کو دکھائی دینے کی کوشش کرتی ہوں ..... یہ زندگی جو میں ان دنوں گزار رہی ہوں مفاہمت اور سمجھوتے کی زندگی ہے۔ بہت سی کڑوی حقیقتوں کا مزہ چکھنے کے بعد میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے ..... مگر یہی منافقانہ زندگی بسر کر رہی ہوں میں ان دنوں ..... جلیس کے بچے آج بھی مجھے برے لگتے ہیں مگر اپنی باطنی کیفیت کو ضبط اور منافقت کی بھاری سِل تلے دبا کر میں بظاہر ان سے محبت کا مظاہرہ کرتی ہوں ..... میرا دل انھیں مغلظات سے سنگسار کر رہا ہوتا ہے مگر زبان سے میں پھول جھاڑنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہوں۔ میرے دل میں اُن کے لیے لاوا پک رہا ہوتا ہے مگر اپنی آنکھوں سے میں انھیں محبت پلانے کی کوشش کیا کرتی ہوں ..... اُن کے خلاف اپنے دل میں پلتی نفرت کو دبا کر میں انھیں یوں محبت سے دیکھنے کی اداکاری کرتی ہوں جیسے میرے بے جان جہاں وہی تو ہیں ..... بابا! جلیس کی زبان سے اُن کی پہلی بیوی کا نام سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ میں دم بخود رہ جاتی ہوں سب کچھ میں صبر اور خاموشی سے برداشت کرنے کی کوشش کرتی ہوں ..... آپ نے کہا تھا نا بابا کہ عورت کے پاس صبر اور خاموشی دو ایسے ہتھیار ہیں جن کو استعمال میں لا کر وہ اپنے گھر کی سلطنت کی بے تاج ملکہ بن سکتی ہے۔ اور ہاں ..... آپ نے ..... آپ نے عظیم الشان سلطنت روما کے حکمران آگسٹس کی بیوی لیویا کے حوالے سے کہا تھا کہ سچی خوشی ان لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اوپر حکومت کرنا جانتے ہوں اور جنھوں نے خود غرضی کو دل سے نکال دیا ہو ..... بابا خود غرضی کو تو میں اپنے دل سے نہیں نکال پائی ہوں کہ آخر کو انسان ہوں البتہ خود پر حکومت کرنے کی کوشش ضرور کر رہی ہوں لیکن کبھی کبھی ..... مجھے ڈر سا لگتا ہے ..... کہ کہیں کوئی ایسا واقعہ نہ ہو جائے کہ آتش فشاں پھٹ جائے اور میری لگائی ہوئی بہت سی گرہیں مٹھیوں سے چھوٹ جائیں ..... اوہ بابا! کاش میں آپ کو بتا سکتی کہ میں اندر سے کتنی خوف زدہ ہوں! کسی گرد [illegible] کا خوف مجھے ہمہ وقت [illegible] مسائل کے ساتھ منافقت کی زندگی گزار رہی ہوں مجھے ایک نامعلوم سا احساس جرم سے دوچار کیے دیتا ہے ..... کیا ساری زندگی مجھے اسی احساس جرم سے دوچار رہ کر گزارنی ہوگی ..... کیا ساری زندگی مجھے کانچ کے پُل پر چلتے رہنا ہوگا؟"

آنسوؤں کی زد کو اپنے ہم سفروں اور فضائی میزبانوں سے پنہاں رکھنے کی خاطر اُس نے سختی سے آنکھوں کو بند کیا مبادا آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ ہو!

جلیس الحسن کا کہا ہوا حرف بحرف سچ ثابت ہوا۔

[illegible] وہ وطن کی فضاؤں کے دوش پر محو سفر ہوئے تھے اور [illegible] دور پردیس میں پہنچ گئے تھے!

تقریباً ڈیڑھ ماہ کا عرصہ جلیس الحسن اُسے اور چاروں بچوں کو یورپ کے خوش نما ممالک کی سیر کراتے رہے۔ انھوں نے پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ بچوں کو اور الفت کو بے دریغ خریداری کروائی۔ الفت نے اپنے لیے تو کم ہی خریداری کی البتہ بہنوں، بہنوئیوں، بھتیجا، بھائی، بھابی، بھانجیوں اور بھتیجوں کے لیے سوغاتیں زیادہ خریدیں۔ رعنا جمیل کے بیٹے کے لیے بھی اُس نے چھوٹی موٹی دو تین سوغاتیں لیں۔

رعنا کے اپنے بیٹے کے لیے ایک بابا سوٹ خریدتے ہوئے اُس کے دل میں وہ فطری خواہش تڑپ کر مچلنے لگی جو ہر شادی شدہ عورت کی ہوا کرتی ہے۔

"خدا جانے کب وہ تابناک سورج میری زندگی کے آسمان پر طلوع ہوگا!" اُس نے بصد حسرت سوچا۔

کہنے کو تو جلیس الحسن نے اس دور دراز سفر کو "ہنی مون" قرار دیا تھا۔ مگر اسے دو بچوں کی [illegible] محسوس ہوئیں۔

اُس نے پردیس میں ملنے والے ہم وطن اور ہم زبان بھائی بندوں کو بھولے سے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ [illegible] ہوئی تھی بلکہ اُس نے تو نگین کی عمر کا حساب لگاتے ہوئے ہر پوچھنے والے سے [illegible] جلیس الحسن کا [illegible] ہوا ابھی کہا کہ اُس کی شادی کو اٹھارہ برس بیت چکے ہیں۔

ڈیڑھ ماہ کے دوران بے شمار مواقع ایسے آئے جب اُسے بچوں کا ساتھ بہت ناگوار لگا کبھی کبھی تو وہ [illegible] رعنا جمیل کے انتہائی بے موقع ٹپک پڑتے تھے مگر الفت نے اپنے جذبات کو مکمل طور پر قابو میں رکھا اور [illegible] سے اپنی صبر آزما ریاضت کو [illegible] لگانا چاہتی تھی!

بچوں نے خاصا پُرلطف وقت گزارا۔ اعجاز اگرچہ الفت سے دور ہی دور رہا مگر اُس نے بھرپور حظ اٹھانے کی کوشش کی۔

ڈیڑھ ماہ یورپ کی سحر انگیز فضاؤں میں گزارنے کے بعد جب وہ سب واپس وطن پہنچے تو ایک خوش خبری کو اپنا منتظر پایا۔

اعجاز میٹرک کے امتحان میں درجہ اول میں کامیاب قرار دیا جا چکا تھا۔

"پاپا آپ کو اپنا وعدہ تو یاد ہے نا؟" اعجاز نے باپ سے کہا "کب دلا رہے ہیں آپ مجھے نئی گاڑی؟"

"جب آپ گاڑی ڈرائیو کرنے کے اہل قرار پا جائیں گے۔"

"پاپا!" اعجاز نے حیرانی سے کہا "کیا مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی؟"

"گاڑی ڈرائیو کر سکنے اور لائسنس یافتہ ڈرائیور ہونے میں بڑا فرق ہے۔"

اعجاز نے چونک کر استفہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"آئی ایم سوری بیٹے کہ میں نے آپ سے ایک ایسا وعدہ کیا جس سے میں روگردانی تو نہیں کرنا چاہتا مگر آپ کے بھلے کی خاطر اس وعدے کو نبھانے کے لیے کچھ مہلت چاہتا ہوں۔ وعدہ اپنی جگہ برقرار ہے جس دن آپ کو لائسنس مل جائے گا آپ کو گاڑی بھی مل جائے گی۔"

اعجاز پر ایک ہیجانی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

اگرچہ اُس نے لاکھ چاہا کہ باپ کے سامنے کوئی بے ادبی اس سے سرزد نہ ہو جائے مگر اپنے فطری مزاج کے سبب وہ لاکھ کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

"پاپا آپ کو منع کر دیا ہوگا کہ آپ مجھے گاڑی نہ دلوائیں۔"

جلیس الحسن بیٹے کی بات سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے اور انھوں نے کہا "بیٹے! مجھے کون منع کر سکتا ہے بھلا!"

"میں جانتا ہوں ..... میں اچھی طرح جانتا ہوں پاپا کہ آپ کو کون منع کر سکتا ہے!"

جلیس الحسن اپنی عمر سے کہیں لمبا نظر آنے والے نوجوان بیٹے کے روبرو آ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اُس کے شانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے محبت سے کہا "بیٹا کسی کے خلاف اپنے دل میں بے بنیاد غلط فہمیوں کو جگہ دینا اچھی

وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی!
جب عالمی شہرت رکھنے والے انگریز گائناکولوجسٹ نے اُسے اپنی نیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا تھا:
"مجھے افسوس ہے مسز حسن!"
تو اُس کی آنکھوں میں دریا سمٹ آیا تھا۔
"میں بے اولاد جوڑوں کے کرب سے بخوبی آشنا ہوں۔" اُس مسیحا نے کہا۔
"آپ لوگ تو میڈیکل کی سائنس میں سب سے فوقیت رکھتے ہیں ڈاکٹر!" وہ اُسے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
وہ مدبرانہ مسکرا دیا۔
"مگر خدا کی مرضی کے آگے ہم بھی بے بس ہیں۔" اُس نے کہا۔
وہ بہت نڈھال تھی۔
جلیس حسن اپنی قیام گاہ پہ واپس پہنچنے کے بعد اُسے دلاسا دیتے رہے۔
"الفت! ہم بے اولاد تو نہیں ہیں۔" انھوں نے الفت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "ویسے بھی اگر تم سچ پوچھو تو ان جوان بچوں کی موجودگی میں پھر ایک ننھے بچے کا باپ بننا اچھا نہیں لگے گا۔"
وہ ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔
اُسے یقین نہ آیا کہ وہ اتنے مہربان ہوتے ہوئے بھی ایسی بے رحمی سے اُس کے جذبات کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔
ٹھیک ہے انھیں مزید اولاد کی طلب نہ تھی کیونکہ وہ بے اولاد نہ تھے۔
چار بچوں کے باپ تھے۔
انھیں بھلا ایک بچے کا باپ بن جانے یا نہ بن سکنے سے بھلا کیا فرق پڑتا۔
مگر اسے تو اولاد کی طلب تھی۔
وہ تو اپنے ادھورے وجود کو پورا دیکھنا چاہتی تھی۔
جلیس حسن تو بڑے آرام سے کہہ دیا کرتے تھے۔ "ہم بے اولاد کب ہیں؟"
وہ بے شک بے اولاد نہ تھے لیکن وہ تو تھی!
دوسری عورت کے بطن سے جنم لینے والے بچوں کی ماں کا لیبل اپنے وجود پر چسپاں کر لینے اور خود اپنی کوکھ سے جنم دینے والے بچے کی ماں بننے میں بڑا فرق ہے۔
یہ دو مختلف حقائق ہیں۔
دو یکسر جدا تجربے۔
موخر الذکر تجربے کی لذت ہی جدا ہے۔
تخلیق کا کرب جھیلے بنا عورت مکمل نہیں ہوتی۔
ادھوری رہتی ہے۔
ادھوری رہ جانے کا دکھ الفت کو مارے ڈالتا تھا۔
بہنیں، بھاوج اور دیگر عزیز و اقارب خیال آرائیاں کرتے۔
"ایک اولاد ہی تو نہیں دی الفت کو خدا نے ورنہ اور کس چیز کی کمی ہے۔ مال کتنا کوئی نہ ہوئی کسے یہ برداشت کرنا تو پڑتی ہے اور دیکھو... اگر ایمان داری سے دیکھا جائے تو ایسی کوئی بہت کسر بھی نہیں۔ سوتیلے ہیں تو کیا، کیسے سعادت مند بچے ہیں۔ رکھے ہیں خدا نے الفت کو، اور سے کیسی ایسی سعادت مندی تو اپنی سگی اولاد بھی نہیں رکھتی، تکتے منہ سوکھتا ہے ان کا!"

کاش وہ انھیں بتا سکتی کہ کس پل صراط سے گزرنے کے بعد وہ اس مقام تک پہنچی تھی۔ بہت سی دیگر کڑوی حقیقتوں کی طرح اسے اس حقیقت کا زہر بھی پینا پڑا تھا کہ وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔
کھلی کھڑکی سے باہر لندن کا ابر آلود آسمان اُسے خود اپنی ہی طرح سوگوار لگا۔
"اے خدا! کہاں ہے تو؟" اُس نے آسمان کی وسعتوں میں اپنی نگاہیں دوڑاتے ہوئے سوچا۔ "ساری ناانصافیاں میرے ساتھ ہی کیوں؟ سارے دکھ میری ہی جھولی میں کس لیے؟"

بہنوں میں سب سے چھوٹی بہن تہنیت بھی دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔
بس ایک وہی تھی جو گویا عذاب زدہ تھی۔
اور وہ محرومی ان راستوں میں پوشیدہ تھی جو اُس کے مقدر کی لکیروں میں شامل تھی۔
بہت پہلے اُس نے کہیں سنا یا پڑھا تھا کہ کسی عورت کے بطن سے جنم لینے والے بچے وہ سنہری ڈوری ہیں جو اُس کے مرد سے اُس کے تعلقات کو مستحکم کرتی ہیں، وہ اس کے گھر کی زمین پر اُس کے قدم زیادہ مضبوطی سے جما دیتی ہیں۔
انگلستان سے بھی مایوس ہو کر وطن واپس لوٹنے کے بعد سے وہ اکثر ہول کر سوچنے لگی تھی — "کیا جلیس سے میرا تعلق غیر مستحکم اور اُس کے گھر کی زمین سے میرے قدم اکھڑے اکھڑے رہیں گے؟"
"کیا اُس کے گھر کی زمین پر اُس کے قدم مضبوطی سے نہ جم سکیں گے؟"
"کیا میں ایک خیمہ بے طناب رہوں گی؟"

اعجاز کا کامل اعتماد کے ساتھ اکھڑا اکھڑا رویہ اُسے مزید ہراساں کرنے لگتا تھا!
گو وہ منہ پھٹ پر تو آمادہ نظر نہ آتا
لیکن الفت کو اس کی خاموشی سے بھی ڈر لگتا۔
وہ جانتی تھی کہ ہر خاموشی کے پیچھے ایک تلاطم پنہاں ہوتا ہے۔

اعجاز کو جلیس حسن نے اُس کی فرمائش سے نئی شیراڈ خرید کر دی تھی جو کالج کے آنے جانے میں تو اُس کے کام آ ہی رہی تھی، انجینئرنگ یونیورسٹی میں اُس کے داخلے کے بعد کہیں زیادہ سہولت فراہم کر رہی تھی۔
اعجاز کی ڈرائیونگ کے سلسلے میں جلیس حسن کی بے لاگ رائے یہ تھی کہ وہ اپنے موڈ کے مطابق گاڑی چلاتا ہے۔
کبھی کبھی وہ ہنس کر کہا کرتے تھے:
"جناب یہاں کی گاڑی اگر ہموار اور کشادہ سڑک پر نظر آئے تو سمجھ لیجیے کہ گاڑی میں اُن کی پسند کا کوئی نغمہ گونج رہا ہے۔ اور وہ اسی کی دھن پر گاڑی چلا رہے ہیں اور اگر ان کی گاڑی بندوق کی گولی کی طرح ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی ہو تو اس کا مطلب ہے شاہزادے خفگی میں ہیں۔"
خدا جانے اُس روز کس موڈ میں تھا اعجاز کہ شام کے وقت اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے ڈیفنس سے ناظم آباد جاتے ہوئے اس کی گاڑی مخالف سمت سے آنے والی ٹرک سے اس بری طرح ٹکرائی کہ ... کے نزدیک ... ایک کہرام مچ گیا۔ ٹریفک جام ہو گیا اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور راستے ایک عجیب سا منظر پیش کرنے لگے۔
یہاں سے وہاں تک آگے پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں جن کے ہارن بری طرح بجائے جا رہے تھے۔ ... گاڑیوں کے ہجوم کے باعث ... بسوں میں سوار ... کر رہی تھیں۔

حادثے کا شکار ہونے والی گاڑی میں نوجوان اعجاز شدید زخمی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ ونڈ اسکرین چکنا چور ہو چکا تھا۔ گاڑی کا ... بری طرح پچک جانے کے باعث گاڑی کی صورت خاصی ہیبت ناک نظر آ رہی تھی۔
شہر کا سب سے بڑا اسپتال قریب ہی تھا۔ اعجاز کو بمشکل تمام گاڑی سے نکالنے کے بعد مذکورہ اسپتال پہنچا دیا گیا۔
گاڑی میں خوش قسمتی سے اعجاز کی ایک ڈائری بھی تھی جس کے صفحہ اول پر اُس کا نام پتا ہی نہیں فون نمبر بھی درج تھا جس سے متعلقہ اہلکاروں کو اس حادثے کی اطلاع متعلقین کو دینے میں دقت نہ ہوئی۔
ٹیلیفون کال ... نے ریسیور ... گھر میں کہرام مچ گیا۔
حادثے کی اطلاع دینے والے نے ... حادثے کی خبر دینے کے بعد کہا تھا! "زخمی کی حالت نازک ہے۔ آپ لوگ فوراً اسپتال کے شعبہ حادثات میں پہنچیں۔"
جلیس حسن کو خبر ملی تو وہ جہاں کے تہاں رہ گئے۔ اعجاز اُن کا بڑا بیٹا تھا۔ اس سے تو وہ نہ جانے کتنی امیدیں

اور نہ جانے کب کب کی بھولی بسری باتیں یاد آرہی تھیں جلیس الحسن کو۔
گھنٹوں بیٹے کے پاس بیٹھے اُسے دیکھتے رہتے۔
کیسا کڑیل نوجوان تھا اور کیا حالت کردی تھی اس منحوس حادثے نے اُس کی!
گاڑی میں پھنسا تو گاڑی اُس کے دم سے بچ جایا کرتی تھی۔ جلیس الحسن تو اُسے نظر لگ جانے کے خوف سے آنکھ بھر کر دیکھتے بھی نہ تھے۔
نہ جانے اُس کی نظر اُتاری تھی؟
نگین اور زرین کو کھانے پینے کا ہوش تھا نہ یونیورسٹی اور سکول جانے کا۔ باپ کی طرح وہ دونوں بھی کئی کئی گھنٹے بھائی کو دیکھتی جاتیں۔
الفت اُنھیں تسلی دیتی "زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں، بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گے بھائی۔"
"اسے ہوش کیوں نہیں آتا؟ انھیں کہاں کہ دیکھا کیوں نہیں کہ ہم سب اُس کے لیے کتنے پریشان ہیں؟" نگین نے بے آنسو روکنے مشکل تھے۔
"بیٹا! آجائے گا ہوش...... ڈاکٹر کہتے ہیں شدید نوعیت کا شاک کبھی کبھی انسان کے لیے بے ہوشی میں چلے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ دماغ پر خدانخواستہ کوئی چوٹ نہیں تھی۔ ورنہ شاید پریشانی بڑھ جاتی۔"
"اس سے کہیے نا کہ اُٹھے اور مجھ سے لڑے، میں چپ چاپ سنتی رہوں گی۔" تو پھر روز بھی اعجاز کے ہوش میں نہ آنے پر نگین چیخ کر رو پڑی تھی۔
الفت کا جی کٹنے لگا۔
سب بہن بھائی سے کتنی محبت و عزت تھی اس کا اُسے بخوبی اندازہ تھا۔ بھیا اگر ایک روز بھی بخار یا نزلہ زکام سے بستر پر پڑے رہتے تھے تو اُن کے دل پر عجیب سی وحشت طاری ہونے لگتی تھی۔
"میری جان! ہمت سے کام لو۔ خدا نے چاہا تو بھیا بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔ پھر تم دونوں آپس میں لڑنا اور میں تمھاری لڑائی بھی دیکھوں گی نا!"
اعجاز کی یونیورسٹی کے بے شمار ساتھی اُس کی عیادت کو آئے اور انھوں نے جلیس الحسن اور الفت سے اس طرح اظہار ہمدردی کیا کہ اُسے یوں لگا جیسے وہ سچ مچ اعجاز کی ماں ہی تو تھی۔
"آنٹی! ہم سب اعجاز کے دوست ہونے کے ناتے سے آپ کے بیٹے ہیں۔" انھوں نے کہا۔
اُن میں سے بعض نے اعجاز کی تیمارداری کے لیے اُس کے پاس ٹھہرنے کی پیشکش کی بعض اپنے نام اور فون نمبر دے گئے کہ رات کے پچھلے پہر بھی کسی سلسلے میں ہماری ضرورت ہو تو ہمیں فون ضرور کیجیے گا۔
دو دوستوں نے اعجاز کے لیے خون بھی دیا۔
اُس کا ہر دوست مغموم اور متفکر تھا۔
"بہت پیارا دوست ہے ہمارا" اُس کے اکثر دوستوں نے کہا۔
انجینئرنگ یونیورسٹی کے چند اساتذہ بھی اعجاز کو دیکھنے کے لیے آئے اور انھوں نے جلیس الحسن اور الفت سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا۔
اس حادثے کے بعد جلیس الحسن کو معلوم ہوا کہ اُن کا بیٹا اپنے دوستوں میں کتنا مقبول تھا اور اُس کے اساتذہ اُسے کس قدر چاہتے تھے!
الفت اگرچہ اُس کی ماں نہ تھی اور شاید ذاتی طور پر ماں نہ بن سکنے کے سبب اولاد کی اہمیت ایک ماں کے جذبات کا صحیح طور پر ادراک بھی نہ رکھتی تھی مگر ان دنوں اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ سچ مچ اعجاز کی ماں ہی تھی۔
گو پچھلے پانچ برسوں میں اُس کے ساتھ اعجاز کا رویہ خاصا معاندانہ رہا تھا اور الفت کو اُس کی نگاہوں میں

اپنے لیے نفرت کے سوا کبھی کوئی نرم و ملائم جذبہ نظر نہ آیا تھا اور اُس کے رویے پر وہ جی ہی جی میں ملول بھی رہا کرتی تھی اور خود کو اُس کے خلاف شاکی بھی پاتی تھی۔ مگر ان دنوں تو جیسے اعجاز کے خلاف اُس کے دل پر رکھا ہر حرف شکایت مٹ گیا تھا۔
نگین، عزرا اور زرین کے ساتھ بھی اُس کے رویے میں ایک پاکیزگی اور شعوری انقلاب رونما ہوا تھا۔ دل سے کی دوستی اور منافقت جاتی رہی تھی۔

پہلے اُس کے دل میں کچھ ہوتا تھا مگر مصلحتاً زبان سے کچھ اور کہنا پڑتا تھا اور اُن دنوں وہ اپنے دل میں بھی وہی باتیں رکھتی تھی جو اُس کی زبان پر ہوتا۔
جلیس الحسن لاکھ چاہتے کہ وہ گھر جاکر آرام کرے مگر وہ ہسپتال سے گھر جانے پر آمادہ ہی نہ ہوتی تھی۔ نگین اور زرین اُس کی ضرورت کی چیزیں لے آتی تھیں۔ دونوں وقت گھر سے کھانا بھی آتا تھا مگر کھانے کو دل کس کا چاہتا تھا۔ تربیت یافتہ ووچار نوالے حلق سے اُتار کر اعجاز کی تیمارداری کی ہمت ہے۔
ویک اعجاز ہی کیا اُسے تو ان دنوں جلیس الحسن، نگین، زرین اور فراز سب ہی کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔ صدمہ، فکر اور نہ کھانے پینے سے اُن سب کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔
الفت دن رات قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اعجاز پر دم کیے جاتی اور اُس کی صحت یابی اور درازیٔ عمر کی دعائیں کرتی۔
یہ تو خیر وہ جانتی تھی کہ جلیس الحسن کو اپنے بچوں سے پیار ہے مگر اس درجہ عشق کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔
وہ جلیس الحسن جن کے لباس کو اُس نے کبھی شکن آلود نہ دیکھا تھا جن کے بال کبھی بے ترتیب نہ ہوتے تھے جن کا سراپا ہمیشہ اُن کی پسندیدہ خوشبو میں بسا رہا کرتا تھا جس نے انھیں بہت باہمت اور اولوالعزم پایا تھا اُن دنوں عجیب وحشت خیزی کا شکار نظر آرہے تھے۔
"الفت! اگر اعجاز کو کچھ ہوگیا تو میں پاگل ہوجاؤں گا۔" انھوں نے ایک رات اعجاز کے سرہانے الفت سے کہا۔
"خدا پر بھروسا رکھیے۔"
"یہ بچے میری زندگی ہیں، میری خوشی ہیں۔" جلیس الحسن روہانسے ہو رہے تھے۔
"میں جانتی ہوں۔"
"اس نے تمھارے ساتھ جو زیادتیاں کیں انھیں معاف کردو۔"
"پلیز!" الفت نے تڑپ کر اُن کی طرف دیکھا۔ "ایسی باتیں مت کیجیے۔"
"میں جانتا ہوں...... مجھے احساس ہے کہ اس نے تمھارے معاملے میں خطائیں سرزد ہوئی ہیں۔ میں نے مداخلت نہیں کی۔ یہ دوسری بات ہے مگر مجھے احساس ہے کہ تم نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا ہے۔ پلیز اسے معاف کردو۔" وہ انتہائی جذباتی ہو رہے تھے۔
الفت کی آنکھیں بھر آئیں۔
"اگر آپ مجھے اپنے بچوں کی ماں سمجھتے ہیں تو آپ کو مجھ سے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔" اُس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا آپ کے خیال میں کوئی ماں اپنے دل میں اولاد کے خلاف کدورت رکھ سکتی ہے؟ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتی کہ یہ بچے مجھے بھی اُسی قدر عزیز ہیں جتنے آپ کو ہیں مگر یہ مجھے عزیز ہیں کیونکہ مجھے آپ کی زندگی اور آپ کی خوشی دونوں عزیز ہیں۔"
اعجاز کی عیادت کے لیے جلیس الحسن کے عزیز و اقارب کا بھی آنا جانا لگا ہوا تھا۔ اعجاز کے سرہانے الفت کی ہمہ وقت موجودگی اور اعجاز کی پوسٹ ہاسپٹل کیئر کے تیمارداری کی انتہائی ذہنیت اور اپنے ظرف کے مطابق معانی اخذ کیے جارہے تھے۔
بعض کا خیال تھا کہ وہ جلیس الحسن کو مرعوب کرنے اور دنیا والوں کی ہمدردیاں اور واہ واہ سمیٹنے کی خاطر ڈرامہ کررہی ہے۔
جبکہ وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف لوگ الفت کے خلوص اور اس کی بے غرضی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے اُسے قابلِ تحسین قرار دے رہے تھے۔
نگین اور زرین کی کئی سہیلیاں بھی اعجاز کی عیادت کو آئیں۔
الفت کے میکے والوں بالخصوص بابا، بھیا اور تسنیت کے دولہا بھائی نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا اُس سے جلیس الحسن کے دل میں اُن کی قدر بہت بڑھ گئی تھی اور الفت سر بلندی محسوس کر رہی تھی۔
خدا خدا کرکے تیرھویں دن اعجاز کو ہوش آیا اور نیم جان متعلقین کو اپنے قلب و روح میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑنے کا احساس ہوا۔
مگر ہوش میں آنے کے بعد اعجاز کو اپنی تکلیف کا احساس جس شدت سے ہوا وہ ان سب کے لیے سوہانِ روح بن گیا۔

زخم نہیں لیتے تو اس بُری طرح جلّاتا اور تڑپتا کہ وہ سب بھی جان سے لرز جاتے۔ چونکہ الفت ہر وقت اس کے پاس ہوتی اس لیے اس پر اعجاز کے تکلیف سے تڑپنے کا زیادہ اثر ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ حادثے کے بعد اعجاز کی تیرہ روزہ بے ہوشی کے دوران اس نے ایسی بے غرضی اور لگن کا مظاہرہ کیا تھا کہ یہ تیرہ دن اُس کی برسوں کی ریاضت پر بھاری تھے۔

اعجاز جب تک بے ہوش رہا اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ کون اُس کی تیمار داری کر رہا تھا، کون اس کی دیکھ بھال کی خاطر جتن کر رہا تھا۔ کون اُس کی عیادت کو آیا اور کس نے کس طور اُس سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

کاش اُس کی بے ہوشی کے دوران اُسکا کیمرہ تیرہ دن کے شب و روز کی عکس بندی کر سکتا تو وہ جان پاتا کہ اُس کے چاہنے والے اُس سے کتنی محبت کرتے تھے۔

ہوش میں آنے کے بعد اُس نے تکلیف کا اظہار جو کیا سو کیا، پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد اپنے قریب الفت کی موجودگی پر شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔

یہ تو مُمکن نہ تھا کہ وہ اُس سے کہتا کہ اب اس سے چلی جاؤ مگر اُس کی صورت نہ دیکھنے کی خاطر وہ جاگتے میں بھی آنکھیں زیادہ تر موندے ہی رکھتا۔

دوا عموماً نرس ہی پلاتی تھی لیکن کبھی کبھار الفت کو بھی یہ ذمے داری پوری کرنی پڑتی۔ ایسے میں اعجاز کے چہرے کے اثرات دیدنی ہوتے۔

مجبور تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر بستر پر پڑا تھا ورنہ الفت کے ہاتھ سے دوا تو دوا امرت بھی نہ پیتا۔

غذا تو نلکی کے ذریعے دی جا رہی تھی۔ کیونکہ بائیں جبڑے پر شدید ضرب آئی تھی۔ کھلانے پلانے کا فریضہ زیادہ تر الفت ہی انجام دے رہی تھی مگر اُس کے ہاتھ سے کھاتے پیتے ہوئے بھی اعجاز آنکھیں بند رکھتا۔

اعجاز کے ہوش میں آنے اور ایک دو روز میں حالت قدرے سنبھلنے کے بعد الفت نے جلیس الحسن کو زبردستی اپنے روزمرہ معمولات کی جانب راغب ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرازنہ، نگین اور زرین کو بھی سمجھا بجھا کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی جانے کا پابند کیا۔ اُس نے ان سب کو یقین دلایا کہ اعجاز کی وہ چنداں فکر نہ کریں، وہ اُس کی دیکھ بھال کو ہر وقت اُس کے پاس تھی۔ ویسے بھی خدا کے فضل سے اب وہ خطرے سے باہر تھا۔

اعجاز کی باطنی کیفیت سے الفت بے خبر نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اعجاز اپنے قریب اُس کی موجودگی کو بحالتِ مجبوری جبراً اور قہراً برداشت کر رہا ہے۔ وہ دیدہ نظروں سے وہ اعجاز کے گھائل چہرے پر بکھری اکتاہٹ بھانپ جاتی۔ مگر اپنے دل میں اُس کے خلاف کوئی حرفِ شکایت نہ آنے دیتی۔

اعجاز سے جتنی شکایتیں تھیں وہ اُس نے بے ہوشی کے تیرہ دنوں میں اپنے دل سے اکھاڑ پھینکی تھیں اور اب انہیں کسی صورت بھی اپنے دل میں جڑ پکڑنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

اعجاز کے ہوش میں آنے کے بعد جلیس الحسن اور بچوں نے لاکھ چاہا کہ اب ایک دو روز کو وہ گھر جا کر آرام کرے اور ان میں سے کوئی اعجاز کے پاس رک جائے مگر الفت نے منع کر دیا۔

ایک روز اس سلسلے میں جلیس الحسن کا اصرار حد سے بڑھا تو اُس نے سرگوشی میں اُن سے کہا۔ "کیا آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ خفت سے بولے۔

"بس تو اصرار مت کیجیے مجھے اعجاز کے پاس رہنے دیجیے۔"

"میں تو اس خیال سے کہہ رہا ہوں کہ تم تھک گئی ہو گی۔" جلیس الحسن نے صفائی پیش کی۔

"جی نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو اعجاز کی دیکھ بھال کر کے مجھے سکون ملتا ہے۔"

جلیس الحسن اُس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

پھر ایک روز نگین نے کہا: "ماما! آج آپ گھر چلی جائیں میں بھائی کے پاس رک جاتی ہوں۔"

"بیٹا! تمہیں یونیورسٹی جانا ہوگا۔"

"کل فری ڈے ہے ماما۔"

"اچھا!" الفت مسکرا دی پھر اُس کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے بولی: "جب تک میں موجود ہوں تو بچے! مخلوق کی طرح تیماردار بن کر اسپتال میں رہتی اچھی نہیں لگتیں۔"

"آئی ایم ناٹ اے بچی ماما۔ میں ایم ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

"میری جان! ہمارے لیے تو تم ہمیشہ بچی ہی رہو گی۔"

"وہ ماما! آپ کے پاس تو ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔" نگین مسکرا دی اور اُس نے اصرار کیا۔ "آپ کتنے دنوں سے اسپتال میں ہیں تھک گئی ہوں گی اب آپ۔ کچھ دن نہیں تو کم از کم آج رات تو گھر جا کر آرام کر لیجیے۔ یہاں کتنی بے آرام رہتی ہیں آپ۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ کتنے آرام سے رہتی ہوں میں یہاں۔ گھر جاؤں گی تو یہی فکر رہے گی کہ خدا جانے اعجاز کو بروقت دوا ملی ہو گی کہ نہیں؟ اُسے تکلیف تو زیادہ نہیں۔ چین کی ضرورت تو نہیں؟"

"میں سب دیکھ لوں گی۔"

"نہیں بیٹا! میں تو اب بھائی کے ساتھ ہی اسپتال سے ڈسچارج ہوں گی۔"

نگین مسکرا دی۔

"کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟"

"بالکل آخری۔"

"ٹھیک ہے ماما جیسے آپ چاہیں۔"

فرازنہ نے بھائی کے پاس رکنا چاہا تو الفت نے کہا: "نہیں بھئی تمہیں تو میں ہرگز اجازت نہیں دوں گی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم اچھی نرس ثابت ہو سکتی ہو آج دنیا بھر کے اسپتالوں میں قبیلہ تر بیتی کی کمی پڑی ہوئی ہے۔"

"یقین کیجیے میں ایک اچھی نرس ثابت ہوں گی۔"

"نرسنگ کا کوئی سابقہ تجربہ ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر زبانی کلامی آپ کے یقین دلانے سے میں کیسے یقین کر لوں کہ آپ ایک اچھی نرس ثابت ہو سکتی ہیں۔"

فرازنہ جھینپ کر مسکرا دی۔

الغرض الفت نے اعجاز کی تیمارداری کا فریضہ ایک رات کے لیے بھی کسی اور کو سونپنے نہ دیا۔

اور اُس کی استقامت نے اعجاز کو عجیب مشکل میں ڈال دیا۔ دن تو جوں توں گزر جاتا مگر رات کو بھی اس کی موجودگی اعجاز کو سخت گراں گزرتی۔

وہ آنکھیں موند کر سوتا بن جاتا لیکن پلکوں کے موہوم جھروکوں سے الفت کو دیکھتے جاتا۔ اُس کے قریب ہی ایزی چیئر پر بیٹھی وہ رات گئے تک کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی۔ قرآن مجید پڑھ کر آہستہ آہستہ اُس پر دم کرتی رہتی۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتی تو ذرا دیر کو پُرسکون ہو لیتی پھر اُس کے نزدیک آ بیٹھتی۔ کبھی جھک کر اُس کے چہرے کے زخموں کا جائزہ لینے لگتی۔

سات آٹھ روز تک تو اعجاز نے بادلِ ناخواستہ الفت کو اپنی تیماردار کی حیثیت سے برداشت کیا پھر اس نے ایک روز نگین سے اس وقت جبکہ جلیس الحسن الفت کے ہمراہ ایک سبزہ زار پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہا: "تنگ آ گئی کانسٹنٹ ارسٹ ہو۔"

نگین نے بھائی کے بالوں میں پیار سے اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: "بھائی! اب ایسی باتیں مت کرو۔"

"کیوں؟ اب کوئی خاص بات ہو گئی ہے کیا؟"

"ہاں۔" نگین نے کہا۔ "تم تو یہ کہتے ہو کہ تم انھیں برداشت نہیں کر سکتے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے ایکسیڈنٹ کے بعد انھوں نے تمہارا اتنا خیال رکھا ہے کہ شاید ہماری اپنی ماما بھی نہ رکھ پاتیں۔ انھوں نے بہت کچھ کیا ہے بھائی....."

نگین نے توقف کیا پھر بولی۔ "ہم سب تو پاگل ہو گئے تھے آپ کے ایکسیڈنٹ کے بعد۔ بابا کا تو بڑا حال تھا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ اگر اس موقع پہ یہ نہ ہوتیں تو ہم لوگ کیا کرتے۔ ہم میں سے ایک ایک کو تسلی اور سہارا دیا۔ پھر تمہاری جس طرح سے دیکھ بھال کی اُن کے اس احسان کو میں تو کم از کم کبھی نہیں بھول سکوں گی۔"

"بہرحال میں..... میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا انھیں۔"

نگین نے ایک غیر معمولی تبدیلی محسوس کی۔

اعجاز الفت کے بارے میں ہمیشہ "اس عورت" میں لہجہ اختیار کرتا رہا تھا۔ اُس کی نفرت میں الفت کے لیے اب سے پہلے "انھیں" کا لفظ تو گویا تھا ہی نہیں۔

الفت کے لیے اُس نے پہلی بار "انھیں" کا لفظ استعمال کیا تھا اور نگین اُسے ایک خوش آئند تبدیلی سمجھنے میں حق بجانب سمجھی جا سکتی تھی۔

"یہ بہت اچھی خبر ہے اعجاز۔"

"ہوں گی۔ آئی ڈونٹ کیئر۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ اب تو بہت دن ہو گئے بلکہ کئی سال ہو گئے اب تک اُن سے تمہاری نفرت کی وجہ؟"

"بس مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"اب جو بات ہو میں نے اپنے دل کی بات تمہیں بتا دی ہے۔ وہ مجھے ذرا اچھی نہیں لگتیں۔"

"ایک بات کہوں بھائی؟"

"ہاں کہو؟"

"بعض لوگ ہمیں اچھے نہیں لگتے مگر درحقیقت وہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں تمہارا اور ماما کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ماما تمہیں اچھی نہیں لگتیں مگر درحقیقت وہ بہت اچھی ہیں اور دیکھو تم نے یہ بات کہ تم انھیں برداشت نہیں کر سکتے مجھ سے تو کہی اور میں نے سُن کر نہیں سمجھا۔ مجھا بھی دیا لیکن اگر یہ بات تم کسی اور سے کہو میں سمجھتی ہوں کہ پاپا سے کبھی کہو گے تو وہ اور ان سے کہیں یا نہ کہیں دل میں یہ ضرور سوچیں گے کہ یہ کیسا احسان فراموش لڑکا ہے کہ جس نے اس کے لیے دن رات ایک کر کے مسلسل تیمارداری کی ایک ماں سے کہیں بڑھ کر اس کا خیال رکھا اسی کو برا کہہ رہا ہے۔" نگین نے توقف کیا پھر دلسوز لہجے میں بولی۔ "نہیں بھائی کسی اور کے سامنے ایسی بات زبان سے کبھی مت نکالنا اور بہتر ہے اُن کے خلاف اپنے دل سے کدورت کو دور کر کے اس اعتراف کو دل میں جگہ دینے کی کوشش کرو کہ وہ بہت اچھی ہیں۔"

اعجاز کچھ بولا نہیں۔

اُس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

نگین سمجھ گئی کہ وہ اس سلسلے میں تو مزید کوئی بات کرنا چاہتا تھا نہ سننا۔

"اب تکلیف تو... وہ کہاں ہوتی ہے؟"

"شانے میں اور پنڈلی میں!"

"چہرے کے زخم تو تقریباً سب ہی سوکھ چلے ہیں۔" نگین نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "جبڑے کا کیا حال ہے؟"

"بس اب ذرا تکلیف رہ گئی ہے۔" اعجاز نے بدستور آنکھیں موندے رکھیں۔

"خدا کا شکر ہے!"

"فراز وغیرہ نہیں آئے آج؟"

"... ان کا کل فزکس کا ٹیسٹ ہے پاپا نے فراز سے کہا تم بہن کے ساتھ گھر پر رکو ہم دونوں اسپتال ہو آتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر کو چپ ہو رہا پھر اُس نے آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

"کسی نے تم کو اطلاع نہیں کی؟"

ذرا دیر کو نگین سکتے میں رہ گئی۔

کہیں وہ یہ تو نہیں کہنا چاہ رہا تھا کہ مہرو کو اس حادثے کی اطلاع دینی ضروری تھی!

"اُن کا ایڈریس ہی کب تھا ہمارے پاس۔" نگین نے بوجھل آواز میں کہا۔

"خیر اطلاع تو ایسا آئٹم نہ... ہسپتال کے ایڈریس پر دی جا سکتی تھی۔"

"کیا تمہارے خیال میں انھیں اطلاع دی جانی چاہیے تھی؟"

اعجاز کچھ نہیں بولا۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں بھائی کیا انھیں کبھی ہمارا خیال نہیں آتا ہوگا؟" نگین نے گھمبیر آواز میں کہا۔

اعجاز نے... آنکھیں موند لی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں پر لرزش سی طاری تھی۔

نگین کا دل... سکتے میں رہ گیا۔

وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ گھر سے چلے جانے کے بعد اعجاز ان کے بارے میں ویسا ہی جذباتی تھا جیسا اُن کے جانے کے بعد پہلے دن۔ اُن کی تصویر آج بھی اُس نے اپنے سرہانے رکھی تھی۔

شاید اس لیے کہ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جن کے دلوں میں آباد محبتیں زمانے سے بے نیاز ہو کر سدا سرسبز رہتی ہیں۔

بالکل یہ اس رشتے کا سحر تھا جو ماں اور اُن چاروں کے درمیان تھا۔

وہ سب اچھی طرح جانتے تھے کہ لغزش ماں سے سرزد ہوئی تھی۔

غلطی سراسر انھی کی تھی۔

مگر پھر بھی ان میں سے کوئی بھی انھیں قابلِ نفرین قرار نہ دے پایا تھا۔

... یہ ایک ہر طرح غیر معمولی اور غیر افسانوی سی بات لگتی تھی۔

قصے کہانیوں میں تو انھوں نے یہی پڑھا اور تماشوں میں دیکھا تھا کہ بچوں کو چھوڑ کر چلی جانے والی ماؤں سے اُن کے بچے محبت کرنا ترک کر دیتے ہیں۔

مگر اُن کا ذاتی تجربہ یہ ثابت کرتا تھا کہ ماں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوتی ہے کہ اس کی لغزش کے باوجود اولاد عموماً محبت ہی کرتی ہے اور قابلِ نفرین نہیں قرار دے پاتی۔

نہ جانے کیوں بعض مائیں اولاد کے بھروسے اور اعتماد اُس کی محبت اور چاہت کو ٹھکرا کر اپنے منتخب کردہ راستوں پہ چل پڑتی ہیں۔

اعجاز کو اسپتال سے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ڈسچارج کیا گیا۔

بیشتر زخم مندمل ہو چکے تھے۔

کاری زخم دھیرے دھیرے بھر رہے تھے۔

مگر مضروب ہڈیوں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔

اسپتال سے ڈسچارج کرتے وقت ڈاکٹروں نے بتا دیا تھا کہ پلاسٹر کھلوانے کے لیے اعجاز کو کس دن اسپتال لانا ہوگا۔

الفت کی خواہش کے مطابق اعجاز کے گھر پہنچتے ہی صدقہ دیا گیا۔ شہر کے ایک معروف ادارے میں خیرات بھجوائی گئی۔ اہلِ خانہ نے شکرانے کے نوافل ادا کیے۔

آنے کو اعجاز اسپتال سے خوش خوش گھر آیا مگر بہت سی مشکلات بھی ساتھ ہی چلی آئیں۔ جنہیں... پسلیاں اور پنڈلی سب ہی تو مضروب تھے۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق ابھی اُسے کافی دن بستر ہی پہ گزارنے تھے۔

اسپتال سے اعجاز کے گھر واپس آنے کے بعد پہلا مسئلہ تو یہ درپیش ہوا کہ اعجاز کو اوپر اُس کے کمرے میں لے جایا جائے یا نیچے ہی رکھا جائے۔ اعجاز تو یہی چاہتا تھا کہ اُسے بدستور اسٹڈی کم اُس کے کمرے ہی میں پہنچا دیا جائے۔

لیکن الفت نے جلیس حسن کو یہ رائے دی کہ اعجاز کو نیچے ہی رکھا جائے تاکہ اس کی مناسب دیکھ بھال کی جا سکے۔ اعجاز کو بھی سہولت تھی اور تیمارداری کرنے اور عیادت کے لیے آنے والوں کو بھی۔

اعجاز کے کمرے سے اُس کا اسباب نیچے لے آنا چنداں دشوار نہ تھا مگر اعجاز کو اوپر دقت ہونے کا

ڈیڑھ ماہ کی مدت کے بعد جب اعجاز کی پنڈلی پر چڑھا پلاستر کاٹا گیا تو اعجاز اپنی دانست میں اس گمان میں تھا کہ پلاستر کے اترتے ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا اور اسٹریچر پر نہیں بلکہ اپنے پیروں پر چلتا گھر واپس جائے گا۔

لیکن وہ اس وقت سخت مایوسی سے دوچار ہوا جب پلاستر اتارے جانے کے بعد اس نے اپنی ٹانگ کو حرکت دینے کی کوشش کی تو اسے شدید اذیت کا احساس ہوا اور وہ اپنی ٹانگ کو حرکت دینے سے قاصر رہا۔

قریب کھڑے ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں جناب! ابھی آپ اپنی ٹانگ کو حرکت نہ دے سکیں گے۔ کچھ وقت لگے گا۔"

"لیکن کیوں؟ اب تو پلاستر اتر چکا ہے۔"

"دیکھئے!" ڈاکٹر نے کہا۔ "کئی ہفتوں تک آپ کی ٹانگ پلاستر میں جکڑی ایک ہی پوزیشن میں پڑی رہی ہے۔ ظاہر ہے ان میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ اسے دوبارہ اس کی فعالیت پر لانے میں کچھ وقت لگے گا۔"

"فزیوتھراپی ڈاکٹر صاحب؟" جلیس الحسن کے اس فقرے میں پورا سوال پنہاں تھا۔

"صاحب! اگر مجھ سے پوچھیں تو میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ یہاں اسپتال کے چکر لگانے کے بجائے گھر پر ہی کچھ بندوبست کر لیں تو بہتر رہے گا۔"

"نو پرابلم ڈاکٹر صاحب۔۔۔ فزیوتھراپسٹ کا میں بندوبست کر سکتا ہوں۔"

"سچ پوچھیے تو کسی پیشہ ور فزیوتھراپسٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ گھر ہی پر روغن زیتون کا ہلکا ہلکا مساج روزانہ معمول بنا لیا جائے اور بیٹا ٹانگ کو خود ہی بتدریج حرکت دینے کی کوشش کریں۔ کچھ عرصے کے لیے انھیں بیساکھی کی ضرورت بھی رہے گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

جلیس الحسن رنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

ڈاکٹر نے اعجاز کی جانب توجہ کی اور اس کے چہرے پر گہرے تفکر اور مایوسی کے سائے لرزاں دیکھ کر اس کا شانہ دھیرے سے تھپتھپا کر بولا۔ "ڈونٹ وری ینگ مین۔ یو ول بی آل رائٹ۔"

اعجاز نے اپنے لبوں کو پوری شدت سے باہم بھینچ لیا۔

الفت اور جلیس کے لیے یہ اندازہ کرنا محال نہ تھا کہ وہ اس نئی صورت حال سے خاصا مایوس اور دل گرفتہ ہوا تھا۔

"اب آپ انھیں گھر لے جا سکتے ہیں۔۔۔ لیکن اسٹریچر پر۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی بہتر۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد جلیس الحسن نے فراز سے کہا۔ "چلو بیٹے ایمبولینس کا بندوبست کیا جائے۔"

"پاپا! میں تو سمجھ رہا تھا کہ بھائی ٹانگ کا پلاستر کھلتے ہی اپنے پیروں پر اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

جلیس الحسن کچھ نہیں بولے۔

ناتجربہ کاری کبھی انسان کو بعض اوقات بڑی اذیت سے دوچار کر دینے کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ جلیس الحسن خود بھی اسی گمان میں تھے کہ اعجاز پلاستر کھلتے ہی اپنے پیروں پر اٹھ کھڑا ہو گا۔ چنانچہ پیش آمدہ صورت حال نے انھیں بھی دلگیر کیا تھا۔

فراز کی بات کے جواب میں الفت نے جلیس الحسن کے چہرے پر دل گرفتگی کے سائے رقص کرتے ہوئے دیکھے تو وہ فراز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "بیٹا! ان شاء اللہ جلد ہی بھائی اپنے پیروں پر بھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب ٹھیک ہی تو کہہ گئے ہیں کہ جب گزشتہ کئی ہفتوں سے اعجاز کی ٹانگ ایک ہی پوزیشن میں پڑی رہی ہے تو اب اسے دوبارہ فعال ہونے میں کچھ وقت درکار ہو گا۔"

فراز زبان سے کچھ نہیں بولا مگر اس کی آنکھوں نے کہا۔ "مجھے تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے!"

پھر فراز اور جلیس الحسن اعجاز کے لیے ایمبولینس کا بندوبست کرنے چلے گئے اور الفت اعجاز کے پاس ہی ٹھہری رہی۔

اعجاز نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر رنج کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ اپنی قلبی کیفیت کو اپنے چہرے پر اُمڈ آنے سے نہ روک پا رہا تھا۔

الفت چپ چاپ اس پر نظریں جمائے کھڑی رہ گئی۔

دفعتاً اعجاز کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس کی کنپٹیوں کو بھگوتے اس کے بالوں میں گم ہونے لگے۔

اعجاز جیسے کڑیل نوجوان کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر الفت کو دکھ ہوا۔

وہ ایک دو دن نہیں تقریباً ڈیڑھ ماہ اعجاز کی تیمارداری کر کے اسپتال میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ بیہوشی کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو اس کے جسم کے متضروب حصوں میں شدید تکلیف تھی لیکن شاید کراہت کے عالم میں بھی وہ بہادر بنا رہا تھا۔ الفت نے پہلی بار اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تھے!

وہ اعجاز پر جھک گئی اور اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو جذب کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "بیٹا! حوصلہ رکھو۔۔۔ تم جیسے جوان بچے ہمت نہیں ہارا کرتے۔۔۔ دیکھو تمہارے ساتھ جو تکلیف تھی اس کا بہت سا حصہ تو تم برداشت کر چکے، اب تھوڑی سی تکلیف اور ہے پھر ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اعجاز نے تڑپ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ان شاء اللہ بہت جلد تم اپنے پیروں پر چل سکو گے۔"

"نو۔۔۔ نو۔۔۔ نیور۔۔۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "ڈاکٹر جھوٹ بولتا ہے۔۔۔ اس نے جھوٹی تسلی دی ہے۔۔۔ وہ جانتا ہے کہ میں اب کبھی اپنے پیروں پر چل سکوں گا۔ مجھے بیساکھی پر چلنا پڑے گا۔"

الفت کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ اس وقت رنج و مایوسی کی انتہائی کیفیت سے مغلوب تھا۔ اس امر کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ پہلی بار الفت پر اپنی قلبی کیفیت کا برملا اظہار کر رہا تھا۔

الفت!

جسے وہ اول دن سے اپنی دشمن جاں گردانتا رہا تھا۔

"بیٹا! مایوس مت ہو۔۔۔ بیساکھی کی ضرورت تو تمہیں عارضی طور پر رہے گی پھر ان شاء اللہ تم اپنے پیروں پر چلنے لگو گے بالکل پہلے کی طرح۔"

وہ کچھ نہیں بولا اور اپنا چہرہ بدستور دوسری جانب موڑے رہا۔

الفت یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ رو رہا تھا اس سے تو کچھ کہنا سننا مناسب نہیں سمجھا مگر دل ہی دل میں اس نے بڑی فکرمندی سے سوچا۔ "اگر خدانخواستہ اعجاز دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا تو پھر کیا ہو گا؟"

جلیس الحسن کی طرح وہ بھی اس ضمن میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ہی ایسا سوچ رہی تھی۔ ورنہ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔

ٹوٹے ہوئے اعضائے انسانی کو دوبارہ فعال ہونے میں واقعی کچھ وقت درکار ہوا کرتا ہے۔

نئی صورت حال نے اعجاز کو نفسیاتی طور پر کافی متاثر کیا۔

سب سے پہلے اس نے جس شدید نفسیاتی ردعمل کا اظہار کیا وہ یہ تھا کہ اپنے خادمِ خاص برکت کے سوا کسی بھی قسم کی خدمت لینے سے انکار کر دیا۔

"میں ساری زندگی کسی دوسرے انسان کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں رہنا چاہتا!" اس نے چیخ کر کہا۔

جلیس الحسن ہڑبڑا کر رہ گئے اور الفت مسٹر برکت کو بلانے سے باہر لپکی۔

مسٹر برکت اعجاز کی بہت سی ذاتی ضرورتوں میں ان کے معاون تھے۔ آگے بڑھ کر دیتا۔ نرم تولیوں سے اس کے جسم کا مساج کرتا۔ اس کی دیکھ بھال اور چھوٹے موٹے بہت سے کام تھے جنھیں اعجاز خود انجام دینے سے قاصر تھا۔

"آرام سے۔۔۔ آرام سے بیٹا۔۔۔ ذرا یہ تو سوچو کہ مسٹر برکت کے جانے کے بعد کتنی مشکل ہو جائے گی تمہیں۔"

جلیس الحسن نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو کیا میں ساری زندگی مسٹر برکت کے رحم و کرم پر رہوں گا؟" وہ چلایا۔

"کچھ دن کی بات اور ہے۔"

"نہیں یہ آپ کی بھول ہے۔ اب یہ ساری زندگی کی بات ہے اور میں ساری زندگی مسٹر رحمت کے رحم و کرم پر نہیں

اور سلیقی کے نیچے پلاسٹک کی ایک بڑی شیٹ بچھائی تاکہ پانی سلیقی سے باہر گرے تو کمرے میں بچھا ہوا قالین نہ بھیگے۔

نگین سے کہا اُلٹی سے پانی لوٹے میں بھر بھر کر اعجاز کا سر دھلواتی رہے۔

اور خود نیچے بیٹھ کر اعجاز کا سر دھویا۔

سر دُھلوانے کے بعد نیم گرم پانی میں بھیگے تولیوں کی نرمی اور سے صاف

اعجاز کی گردن، بازوؤں، سینے اور پیٹھ کا آہستہ آہستہ مساج کیا۔ صاف ستھرے استری شدہ کپڑے تو پہلے ہی اعجاز کے پلنگ کے نزدیک اُس کی رسائی میں ایک سٹینڈ پر لٹکا دیے گئے۔

سر اور ٹانگے وغیرہ کی صفائی کے بعد اُس نے نچلے دھڑ کا مساج خود اعجاز پر چھوڑا اور بھیگے ہوئے تولیوں کی ٹرے اُس کے نزدیک رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا اور جب اُس نے گھنٹی بجا کر فراغت پا لینے کی اطلاع دی تو بہتر سارا سامان اُس کے کمرے سے ملازم لڑکے سلیم کی مدد سے ہٹوایا۔

اعجاز کے پلنگ کی چادر بدلوائی۔

کمرے میں ایئر فریشنر سپرے کیا۔

اور خود اعجاز کو بھی سر تا پا خوشبو میں بسا دیا۔

اعجاز کو پسند ہوتی خوشبو کا ضروری اسباب اُس کے سامنے دھر تو آئینہ دونوں آنکھوں سے اس کے سامنے تھام کر بیٹھ جاتی۔

اُس کے ہر تاثر کے باوجود صبح و شام اُس کے جسم کے متاثرہ حصوں، بالخصوص پنڈلی پر روغنِ زیتون کا حسبِ دستور مساج کرتی۔

اس خدمت گزاری سے قطع نظر اُس نے اعجاز کے لیے ایک ماہرِ تغذیہ سے متوازن اور مقوی غذا کا ایک ہفتے وار جدول بنوا لیا تھا۔ اور اُس کی سختی سے پابندی کر رہی تھی۔

یہی نہیں بلکہ اعجاز کے دل بہلانے کی خاطر وہ اُس کے قریبی دوستوں کو خود فون کر کے گھر بلاتی کہ وہ کچھ وقت اعجاز کے ساتھ گزاریں۔

اعجاز کو اپنے تعلیمی سلسلے میں رخنہ پڑنے کا بہت قلق تھا۔ الفت اُس کے دل سے اس قلق کو دُور کرنے کے لیے باقاعدہ اور بلاناغہ ٹیوٹر بلانے پر آمادہ ہو چکی تھی۔

مسلسل چٹکنے والا خطرہ اب تو بیشک سنگ میں بھی دریچہ کھول دیتا ہے۔

اعجاز کے سینے میں تو گوشت پوست کا نرم و نازک دل تھا۔

الفت کے حسنِ سلوک کی مستقل اور مسلسل یورش نے اُس کے دل میں بھی ننھے ننھے دریچے وا کر دیے۔

اب سید اور بات تھی کہ ان دریچوں پر ابھی پردے پڑے تھے۔

الفت کی انہی بے پناہ توجہ کا سلسلہ رہا۔ الفت کے پیچھے وہ اعجاز بیساکھی کے سہارے بسہولت اٹھنے کے لائق ہو گیا۔ اگرچہ وہ ابھی ٹانگ پر پورا زور اور اُسے بخوبی حرکت تو نہ دے پاتا تھا مگر اتنا ہو گیا کہ ٹانگ پھیلا کر کموڈ پر بیٹھنے لگا اور اٹیچڈ باتھ روم میں ہی رکھوا دی گئی بیٹھ کر خود ہی غسل بھی لینے لگا۔

الفت کو اب اُسے بیڈ پین دینے، اُس کا سر دھلوانے اور مساج کرنے کی ضرورت تو نہ رہی تھی تاہم لقیہ معمولات بدستور برقرار تھے۔ اُس کے جسم کے متاثرہ حصوں پر روغنِ زیتون کی مالش وہ باقاعدگی سے کیا کرتی تھی۔

اعجاز کے موجودہ کمرے کے علاوہ ہر تیسرے چوتھے دن اس کا بالائی منزل پر واقع کمرہ بھی صاف ستھرا کیا جاتی تھی اس کمرے سے اعجاز کا بیشتر ضروری اسباب جو اُس نے نیچے اُس کے کمرے میں منتقل کروا دیا تھا لیکن غیر ضروری سامان اوپر پڑا رہنے دیا تھا۔

مگر اس کمرے میں ایک چیز ایسی بھی تھی جس کو اُس نے اعجاز کے لفظ لفظ نظر سے اہم سمجھنے کے باوجود کبھی نیچے پر رہنے دیا تھا۔ اور وہ تھی اُس کی ماں کی تصویر جو اُس کے بستر کے دائیں دیوار پر آویزاں تھی۔

چونکہ اعجاز کی سمجھ میں نیچے نہ لے جائی گئی تھی اُس کے لیے نیچے دل بہت فراہم کر دیا گیا تھا اس لیے اس تصویر کا نیچے

لے جانا ممکن بلا جواز نظر آتا تھا۔ خود اعجاز نے بھی مذکورہ تصویر کی بابت کوئی استفسار نہ کیا تھا۔

اُس روز صبح تقریباً گیارہ کا عمل تھا۔

نگین یونیورسٹی، فرزانہ اپنے کالج، زر اور زرین اسکول جا چکی تھیں جبکہ محسن کو بینک دفتر گئے دیر ہو چکی تھی۔ اعجاز اپنے کمرے میں بستر پر دراز اپنے نصاب کی کتاب کے مطالعے میں مستغرق تھا۔ الفت بالائی منزل پر ماجراں سے صفائی کروا رہی تھی۔ جب وہ اوپر سے نیچے آنے لگی تو اُس نے اعجاز کے کمرے سے جاسمہ بیگم کی فریم شدہ تصویر اُس کے سرہانے سے نکال لی۔

نیچے آنے کے بعد اُس نے اعجاز کے کمرے کی کھڑکی سے اُس کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بستر پر دراز کتاب کے مطالعے میں مستغرق تھا۔

الفت نے آگے بڑھ کر اُس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"کم ان" اعجاز نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلنے پر الفت کا چہرہ دکھائی دیتے ہی وہ دوبارہ کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ الفت کا اس کے کمرے میں آنا کوئی غیر معمولی بات نہ رہی تھی۔ وہ اکثر چیزوں کو اُٹھا لے دھر رکھتی اور اعجاز کو دیکھتے اُس کی ضرورت کی بابت استفسار کرنے اور آنے وقفے وقفے سے خورد و نوش کا سامان بہم پہنچانے اُس کے کمرے میں آتی رہتی تھی۔

اعجاز نے جو اپنے کمرے میں الفت کی آزادانہ آمد و رفت کا عادی ہو چکا تھا اور جسے اسپتال میں اور اسپتال سے گھر آنے کے بعد بالخصوص مسٹر برکت کی خود اس کی چھاتی پر تھپکی کیے جانے کے بعد الفت کے حسنِ سلوک نے گنگ کر رکھا تھا اس کے اپنے کمرے میں آنے کا کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا اور اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ مطالعے میں مستغرق نظر آنے لگا۔

الفت نے جاسمہ کی فریم شدہ تصویر اعجاز کے سرہانے سائیڈ بورڈ پر رکھ دی پھر اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے بولی: "بیٹے! ذرا دیکھو تمہارے کمرے میں کون آیا ہے؟"

اعجاز نے چونک کر پہلے دروازے کی سمت دیکھا پھر چہرے پر اُلجھن لیے الفت پر نظر ڈالی۔

"ادھر دیکھو۔" الفت نے آنکھ کے اشارے سے اُس کی توجہ سائیڈ بورڈ کی طرف مبذول کرائی۔ اُس نے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اس میں تو شک نہیں کہ تمہاری ممی بہت خوبصورت تھیں۔" اُس نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اُس نے اس منزل سے گزرنے کے لیے کتنی بڑی قیمت ادا کی تھی۔

اعجاز ساکت و صامت آنکھیں پھاڑے بےیقینی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

جب یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے اُسے ختم ہو جانا اور صفحۂ ہستی سے مٹ جانا ہے۔

تو پھر جذبے فانی کیوں نہیں ہو سکتے؟

ہر جذبے کی ایک عمر ہوتی ہے اور اس عمر کی انتہا کو پہنچنے کے بعد وہ جذبہ آپ ہی آپ دم توڑ دیتا ہے، مٹ جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے۔

اعجاز کے دل میں الفت کے خلاف نفرت کی بس اتنی ہی عمر تھی۔

اعجاز کے دل نے اس سے پوچھا:

"بتا اب کیا جواز ہے تیرے پاس اس عورت سے نفرت کرنے کا؟"

وہ بیچارے دل پر بیٹھی چلنیں یک بیک اُٹھ گئیں۔

"تھینک یو سو مچ!" اُس نے سرگوشی کا کہا۔

الفت اُس کے پائنتی بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟" اُس نے اعجاز سے پوچھا۔

"میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی بہت بدتمیزی کی ہے۔" اعجاز نے قصور وار کی مجرم کی طرح اعتراف جرم کرنے کے بعد بوجھل آواز میں کہا۔ "کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟"

"ایسی بات مت کرو بیٹا۔" الفت نے کہا۔ "چھوٹوں کی ہر غلطی کی بنیاد بڑوں کا کوئی رویہ ہوتا ہے۔ کوئی خطا کوئی لغزش ہوا کرتی ہے۔" وہ کچھ پل ٹھہریں پھر انہوں نے بوجھل آواز میں کہا۔ "شاید مجھ سے بھی سخت روی میں غلطی سرزد ہوئی ہو تو تم اتنے سال مجھ سے دور رہے۔"

اعجاز نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آئی نو بیٹا... مجھے... تم چاروں سے محبت ہے... یو آر مائی لو... تم چاروں اس گھر کی رونق ہو سب رہو۔"

اعجاز نے اپنے سرہانے دھری اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا۔

پھر اس کی نگاہیں الفت کے چہرے پر جا ٹکیں

کچھ دیر وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

اس کے دل نے کہا:

"یہ عورت نفرت کیے جانے کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔"

اعجاز کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

اس نے مدھم سے سروں میں کہا۔ "آنی ٹھیک ہی کہتی ہیں آپ واقعی عظیم ہیں!"

الفت کے لیے اس کے یہ چند الفاظ نوبل انعام سے بڑھ کر تھے۔

منافقت سے محبت تک کا یہ سفر کس قدر دشوار رہا تھا۔

بابا نے سچ ہی کہا تھا کہ

"بڑی خوش قسمتی انھیں ملتی ہے جو خودغرضی کو اپنی ذات سے علیحدہ کر کے اپنے اوپر محبت کو لاگو کر سکتے ہیں۔"

اس نے عورت کے سب سے بڑے ہتھیار صبر اور خاموشی سے کام لے کر خود پر حکومت کرنا سیکھ لیا تھا!

خدا کے فضل سے اعجاز مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ انتہائی دیکھ بھال اور متوازن غذا کے استعمال سے اس کی صحت پہلے سے زیادہ اچھی ہو گئی تھی جوانی کا خون سرخی بن کر چہرے سے جھلکتا تھا۔ رخسار دمکتے تھے اور آنکھیں ہیروں کی مانند دمکتی تھیں۔

بیساکھی کو اس نے ان اذیت ناک دنوں کی یادگار کے طور پر ایک چادر میں محفوظ کروا کے رکھ لیا تھا۔ اب جب کہ وہ اپنے پیروں پر چلنے لگا تھا ان دنوں کو اکثر یاد کرتا تھا اور اپنی پنڈلی پر سے پلستر اتارے جانے کے بعد اپنی قلبی کیفیت کو وہ اکثر بخصوص یاد کیا کرتا تھا۔

"مائی گاڈ! اپنی زندگی کے وہ چند دن تو میں کبھی نہیں بھول سکتا... مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو چکا ہوں اور اب کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکوں گا... میں اتنا مایوس تھا کہ مجھے ساری دنیا بری لگتی تھی... میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے پیروں پر چلنے والے ہر انسان کی ٹانگیں توڑ دوں۔ لوگوں سے حسد محسوس ہوتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ جب میں اپنے پیروں پر نہیں کھڑا ہو سکتا تو پھر یہ لوگ کیوں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں... بخدا وہ میری زندگی کے بدترین دن تھے۔"

اعجاز زبان سے اقرار کرتا یا نہ کرتا ان اذیت ناک دنوں کی نسبت الفت کے بے پایاں خلوص کا وہ دل سے معترف تھا جس قدر خدمت گزاری اس کی الفت نے کی تھی شاید اس کی اپنی ماں بھی نہ کر سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ الفت کا بہت احترام کرنے لگا تھا۔ الفت کے خلاف دل میں جتنی کدورت اور نفرت تھی اسے اس نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے بہت ہی سعادت مند بیٹوں کی طرح سر جھکائے رہتا تھا۔

اعجاز کی الفت نے جس تن دہی سے دیکھ بھال کی تھی اور اس کے لیے جو کچھ کیا تھا اس کے اپنے پرائے سب ہی معترف تھے جلیس محسن تو گویا اس کے بندۂ بے دام بن کر رہ گئے تھے۔

جس روز اعجاز نے پہلی بار کسی سہارے کے بغیر اپنے پیروں پر چند قدم چلا اس روز جلیس محسن کی مسرت دیدنی تھی۔

اس روز انھوں نے الفت سے کہا تھا "جانِ جلیس! کیسے شکریہ ادا کروں میں تمہارا؟"

"کس بات کا شکریہ؟" الفت ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئی۔

"تم نے اعجاز کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ شاید اس کی سگی ماں بھی نہیں کر سکتی تھی۔"

"براہِ کرم آپ مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش مت کیجیے کہ میں اعجاز کی سگی ماں نہیں ہوں۔"

"اوہ! خدانخواستہ میرا یہ مقصد تو نہیں۔"

"تو پھر اور کیا مطلب ہے؟"

"میں تو تمہارا شکریہ ادا کرنا اور اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"صفائی میں؟" اس نے قدرے تعجب سے ان کے الفاظ دہرائے۔

"ہاں!" وہ سر جھکا کر بولے۔

الفت استفہامیہ نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگی۔

جلیس محسن نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر دوبارہ سر جھکا کر خفیف سے لہجے میں بولے۔

"بہت دنوں سے میں تم سے یہ بات کہنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔" انھوں نے پل بھر کے توقف کے بعد کہا۔ "یہ مت سمجھنا جانِ جلیس کہ میں تمہاری نسبت بے حس، کٹھور، بے پروا یا بے خبر تھا۔ دوسری بار تمہارے اس گھر میں آنے کے بعد سے اب تک میں نے اس گھر میں رونما ہونے والے حالات اور واقعات پر بڑی گہری نظر رکھی ہے... بہت معذرت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ پہلی بار بالکل واقعی تمہاری غلطی تھی لیکن دوسری مرتبہ تمہارے اس گھر میں آنے کے بعد بچوں نے واقعی بہت ناروا سلوک روا رکھا تمہارے ساتھ...!"

الفت نے بے ساختہ چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"اگرچہ تم نے اس سلسلے میں مجھ سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔" وہ اپنا سلسلۂ کلام بدستور جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "لیکن میں بچہ نہیں ہوں۔ زمانے کے سرد و گرم سے آشنائی رکھتا ہوں۔ حالات اور واقعات کا جائزہ لے کر بخوبی سمجھ سکتا ہوں اور نتائج اخذ کر سکتا ہوں... چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے بعض بڑی باتیں سمجھا دینے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ دنوں تک تم نے جس صبر و تحمل سے زرین اور فراز کی بدتمیزیاں برداشت کیں، فراز کے پیدا ہونے پر اپنے تمام کارڈز پر تم نے شکریہ لکھا تھا وہ سو فیصد اتفاق سے تمہارے شکریہ لکھنے کے بعد میری نظروں سے بھی گزرے تھے۔"

الفت ایک بار پھر چونکی۔

"شاید تم جاننا چاہو گی کہ کس طرح؟" انھوں نے ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد کہا۔ "تمہیں شاید یقین نہ آئے مگر ان دنوں میں گھر میں رونما ہونے والے حالات سے باخبر رہنے کے لیے کوڑا دانوں میں بھی جھانکنے سے گریز نہیں کیا کرتا تھا۔ فراز نے ان تمام کارڈوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انھیں اپنے کمرے کے دروازے کے باہر رکھے کوڑا دان میں پھینکا تھا... میں نے انھیں نکالا اور جوڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ... خیر یہ تو میں نے محض ایک مثال بیان کیا تاکہ تم جان سکو کہ میں کس طرح حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ پھر کتنی مرتبہ میں نے تمہاری اور بچوں کی باتیں چھپ چھپ کر سنیں۔ میں اپنے ذرائع کو کام میں لاتے ہوئے اس امر سے بھی باخبر رہا کہ دوپہر کا کھانا بچے تمہارے ساتھ کھانے کے بجائے اوپر کھانا اپنا کر سکتے تھے اور تم بغیر نوالہ توڑے اٹھ جایا کرتی تھیں..."

"یہ... یہ آپ کو... کس نے بتایا؟" اس نے بے ساختہ چونک کر پوچھا۔

جلیس محسن دھیرے سے مسکرا دیے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا...."

"نہیں پہلے آپ میری بات کا جواب دیجیے۔"

"بھئی ہماری بھی اپنی سی آئی ڈی ہے۔"

"پلیز مذاق میں ٹالنے کی کوشش مت کیجیے... بتائیے نا!"

"وہ ایک بہت خوبصورت سراغرساں تعینات کر رکھا تھا۔"

"کون؟" وہ انھیں گھورتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "فاضلہ ماں؟"

انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ کو خود میں نے؟"

"تھیں، تم تھلیاں گننے کے چکر میں کیوں لگ گئیں؟"

"تاکہ آہستہ آہستہ پہچان کر آرام کی نوں۔"

وہ ہنس دیے۔

پھر الفت کی اجنبا کرتے ہوئے بولے "میں تمہارے اس کرب سے کبھی ناآشنا نہیں رہا کہ تم نے جس طرح بچوں کی طرف خلوص و محبت کا ہاتھ بڑھایا انھوں نے تمہارا ہاتھ بُری طرح جھٹک دیا.... المختصر یہ سمجھو کہ دوسری بار تمہارے گھر آنے کے بعد میں تمہارے ساتھ بچوں کی اس قدر بدتمیزیوں سے بخوبی واقف رہا لیکن میں بظاہر انجان بنا رہا کیونکہ اول تو میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ بچے میری مداخلت کو تمہاری طرف سے شکایت سمجھیں اور میری جانب داری پر محمول کرتے ہوئے مجھ سے بدگمان اور تم سے مزید متنفر ہو جاتے کیونکہ اپنی ماں کے جانے کے بعد اور پھر میری دوسری شادی کے باعث وہ نفسیاتی طور پر پہلے ہی کافی اُلجھے ہوئے تھے اور..... دوسری بات یہ کہ میں دور سے تمہاری سرخروئی کا نظارہ دیکھنا چاہتا تھا.... میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر تم خدانخواستہ شکست خوردہ ہو تو کسی کو موردِ الزام ٹھہرا سکو اور اگر فاتح بن کر لوٹو تو کوئی دوسرا تمغۂ سُرخروئی اپنے سینے پر سجانے کی کوشش نہ کر سکے۔" انھوں نے توقف کیا پھر بولے "مجھے اعتراف ہے کہ بعض مواقع ایسے بھی آئے جب میں نے بچوں کے نامناسب طرزِ عمل سے جان بوجھ کر نظر پوشی کی۔ تمہاری جگہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو شاید میری اس جانب داری پر میرا گریبان پکڑ لیتی مگر تم نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا... الفت! زمین کے ٹکڑوں کو بزورِ طاقت فتح کر لینا کوئی بڑی بات نہیں، دلوں کو تسخیر کر لینا بڑی فتح ہے۔ تم نے ایک نہیں پانچ دھڑکتے دلوں کو تسخیر کیا ہے.... مجھے تم پر فخر ہے۔ میں اپنے بچوں سے شرمندہ نہیں ہوں کہ میں انھیں ایک اچھی ماں نہ دے سکا.... مجھے واقعی تم پر فخر ہے۔ اتنا اسیر تو مجھے عاصمہ بھی نہ کر سکی تھی جتنا کہ تم نے کر لیا ہے۔ تم نے دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیا ہے جلیس کو۔"

الفت پر ایک عجیب سی سرشاری طاری ہوتی چلی گئی۔

اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے جلیس الحسن نے اُس کی آنکھوں کی سُوئیاں بھی چُن لی ہوں اور وہ ایک دم ہی پھر سے جی اٹھی ہو!

اُس نے جی ہی جی میں اپنے آپ سے پوچھا:

"کیا میں اس خراجِ تحسین کی واقعی اہل ہوں؟"

اور اُسے جواب مل گیا۔

یہ راز تو شاید وہ کسی کو کبھی نہ بتا سکتی تھی کہ اس منزل تک جس پر کہ وہ اب تھی پہنچنے کی خاطر وہ ایک عرصے تک مصلحت اور منافقت کے راستے پر آبلہ پائی کرتی رہی تھی۔

اُس کا دل جلیس الحسن کے بچوں کو گالیاں دے رہا ہوتا تھا، بُرا بھلا کہہ رہا ہوتا تھا، انھیں کوس رہا ہوتا تھا اور اُس کی زبان سے پھول جھڑ رہے ہوتے تھے۔

یہ اور بات تھی کہ بعد میں غیر شعوری طور پر منافقت کا یہی راستہ محبت کا راستہ بن گیا تھا اور جب وہ نفرت والی تھی تو اُسے اپنے چہار اور پھول ہی پھول کھلے نظر آتے تھے۔

جلیس الحسن کے بچے اُسے اپنے ہی جگر گوشے محسوس ہوتے تھے۔

ایسا شاید اس لیے بھی تھا کہ اُس نے اس حقیقت کو چپ چاپ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ کبھی اپنے بچے کی ماں نہیں بن سکتی تو کیوں نہ دوسری عورت کے بچوں ہی کی ماں بننے کی کوشش کرے۔

جلیس الحسن کے بچوں کو اب وہ ایک ماں کی ہی نظر سے دیکھتی تھی۔

اعجاز کے جشنِ صحت یابی کے موقع پر وہ سچ مچ ان چاروں کی ماں ہی نظر آ رہی تھی۔

جلیس الحسن نے اعجاز کو پھر سے ایک نئی گاڑی خرید دی تھی اور وہ دوبارہ یونیورسٹی جانے لگا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔

"حسن لاج" کے مکین خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

ٹیلیفون کی تیسری گھنٹی پر الفت ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ ریسیور اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ جلیس الحسن نے لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ بورڈ پر دھرے ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا۔

الفت کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

لحظہ بھر میں کئی خدشات اُس کے دل کو ہولا گئے تھے۔

رات کے پچھلے پہر کوئی فقط خیر و عافیت پوچھنے کو تو فون نہ کر سکتا تھا۔

"خدا خیر کرے امی اور ابا کی طبیعت ٹھیک ہو۔" اُس نے سہم کر سوچا۔

جلیس الحسن اُٹھ بیٹھے تھے اور مسلسل ہیلو! ہیلو! کر رہے تھے۔

ریسیور میں ایسی گڑگڑاہٹ تھی کہ وہ دوسری جانب سے آواز صاف نہ سن پا رہے تھے۔

"کس کا فون ہے؟" الفت نے سرگوشی نما لہجے میں پوچھا۔

"کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" جلیس الحسن بولے اور پھر ہیلو! ہیلو! کی گردان کرنے لگے۔ ناچار انھیں ریسیور رکھ دینا پڑا۔

الفت کے دل پر دہشت طاری تھی۔

اُس کا دھیان مستقل اپنے میکے کی طرف لگا ہوا تھا اور وہ جی ہی جی میں وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے کی دعا مانگ رہی تھی۔

دو تین منٹ کے توقف سے دوبارہ گھنٹی بجی۔

"ہیلو!" اس مرتبہ الفت نے کال ریسیو کی۔

ایک زنانہ آواز نے فون نمبر کی تصدیق چاہی پھر پوچھا "آپ کون صاحبہ بات کر رہی ہیں؟"

"جی.... میں مسز جلیس ہوں۔ آپ کون بول رہی ہیں اور آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"میں نیویارک سے عالیہ رفیق احمد بات کر رہی ہوں۔ مجھے جلیس الحسن صاحب سے بات کرنی ہے۔"

نیویارک سے عالیہ رفیق احمد!

الفت کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

نگین کے ساتھ بیٹھ کر...... ایک دو دفعہ اُس نے اس کے کمرے میں رکھی چاروں البم دیکھی تھیں۔ ان میں نگین کی دونوں خالاؤں، اکلوتے ماموں اور ان کے اہلِ خانہ کی متعدد تصاویر بھی تھیں۔ نگین نے اسے ان کے نام بھی بتائے تھے۔ عاصمہ سے بڑی بہن کا نام عالیہ رفیق احمد تھا اور چھوٹی بہن کا نام عارفہ رشید۔ ماموں کا نام شجاع احمد۔

الفت نے ریسیور جلیس الحسن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "نیویارک سے کال ہے آپ کے لیے!"

یہی تو رات آدھی کی کیفیت کی وجہ تھی۔

"نیویارک سے!" جلیس الحسن تعجب سے بولے پھر انھوں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا "جلیس الحسن اسپیکنگ!"

"عالیہ بول رہی ہوں نیویارک سے۔" دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "عاصمہ کی بہن۔"

جلیس الحسن ٹھٹک سے گئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اپنی بہن عاصمہ کی نسبت سے اُن کا عالیہ رفیق احمد سے گہرا تعلق رہا تھا مگر عاصمہ کے بعد وہ اُن کے لیے غیر ہی قرار پا چکی تھیں۔

اُن کا جی چاہا ریسیور وہیں رکھ دیں مگر یہ خیال مانع رہا کہ ہزاروں میل دور سے عالیہ رفیق احمد نے بلا سبب فون نہ کیا ہوگا اور پھر عاصمہ بیگم کی فوتگی میں آنے کا تیار دیش تھا۔

"پہچانا؟"

"جی۔"

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ٹھاک۔" وہ سرد لہجے میں بولے۔

"گھر میں سب خیریت ہے؟" اُن کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

"جی ہاں!"

"وہ..... حقیقی..... ہم تو بہت پریشان ہیں۔"

"وجہ؟"

"آج ہی کسی ذریعے سے اطلاع ملی کہ خدانخواستہ اعجاز کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ کئی گھنٹے ہوگئے تم سے بات کرنے کی کوشش کرتے۔ خدا جانے کیا بات تھی کال لگ ہی نہیں رہی تھی۔ مل بھی تو آواز صاف سنائی نہ دے رہی تھی۔ بہرحال اب بتاؤ کیا یہ خبر درست ہے؟" وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئیں۔

"جی ہاں! بالکل درست!"

"خدایا! کب؟ کیسے ہوا ایکسیڈنٹ؟" وہ گھبرا کر بولیں۔

"ہوا تھا، اب تو وہ صحت یاب بھی ہو چکا۔"

"چوٹ کہاں آئی تھی؟"

"چہرے پر کافی چوٹیں تھیں۔ شانہ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں، ایک پنڈلی میں کمپاؤنڈ فریکچر تھا، تین جگہوں سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔"

"میرے خدا! اب کہاں ہے؟ کیسا ہے وہ؟" بہت ہی تشویش کے ساتھ پوچھا گیا۔

"خدا کے فضل سے مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا ہے!"

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔" انھوں نے الفت کے چہرے پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے تو! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا..... میرا مطلب ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے اطمینان دلانے کے لیے کہہ رہے ہو کہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے۔ مجھے تو جب سے خبر ملی ہے پریشان ہوں۔ عاصمہ کو اطلاع دینے سے قبل تم سے کنفرم کر لینا ضروری سمجھتی تھی۔"

"عاصمہ!" وہ طنز سے ملی ہنسی ہنسے۔ "عاصمہ کو بھلا اعجاز سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے!"

"ایسا نہ کہو۔" وہ کچھ جھجک سے بولیں۔ "آخر کو وہ ماں ہے۔"

"ماں!" جلیس الحسن نے طنزاً ان کی بات دہرائی۔

"کیا میں اعجاز سے بات کر سکتی ہوں؟"

"وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ دراصل اس وقت یہاں رات کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ ہم لوگ ابھی سوتے سے اٹھے ہیں۔"

"اوہ! سوری! میں نے تمہاری نیند میں خلل ڈالا..... دراصل مجھے جب سے خبر ملی تھی میں اتنی پریشان تھی کہ کسی بھی طرح پاکستان سے اعجاز کی خیریت معلوم کرنے کو بے چین تھی۔ میں نے کراچی اور نیویارک کے اوقات میں فرق کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا..... میں معذرت خواہ ہوں۔"

جلیس الحسن کو خیال آیا کہ کبھی عالیہ رفیق احمد ان کے لیے انتہائی محترم ہوا کرتی تھیں۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ قدرے رسانیت سے بولے۔

"ویسے سچی بات بتاؤں کہ تم نے اگرچہ اطمینان تو دلا دیا ہے اعجاز کے بارے میں مگر میرا دل اب بھی بہت بے چین ہے اس کے لیے۔"

"آپ میری بات کا یقین کر سکتی ہیں۔ اگر وہ سو نہ رہا ہوتا تو میں اس کی آپ سے بات بھی کرا دیتا۔"

"اب تو بڑا ہو گیا ہوگا وہ؟"

"جی ہاں..... ماشاء اللہ مجھ سے اونچا۔" وہ پدری شفقت سے معمور لہجے میں بولے۔

"ماشاء اللہ! اور باقی دونوں بچے؟" عالیہ رفیق احمد کے لہجے میں اشتیاق بھری کیفیت تھی۔

"وہ بھی خیریت سے ہیں۔"

"ماشاء اللہ کافی بڑے ہو گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا پڑھ رہے ہیں؟"

جلیس الحسن کا جی چاہا کہیں:
جب آپ کی ہمشیرہ ہی نے واسطہ نہ رکھا تو آپ کے ان استفسارات کا فائدہ!
مگر انھوں نے بڑے تحمل سے انھیں بتایا۔
"نگین ایم بی بی ایس کر رہی ہے۔ اعجاز انجینئرنگ یونیورسٹی میں ہے، فراز کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم ہے۔ نازین کا یہ کیا..... یہ آخری سال ہے؟"

"کتنے کل ہی کی بات ہے جب میں نے انھیں چھوٹا سا دیکھا تھا۔"

"جی ہاں۔ آپ کو پاکستان گئے ہوئے بھی تو کئی برس ہوگئے۔"

"ہاں شاید تیرہ برس کے لگ بھگ..... عاصمہ کے یہاں آنے کے بعد وہاں آنا ہی نہ ہوا۔ عاصمہ وہاں ہوتیں تو سال دو سال میں ایک دو چکر تو لگ ہی جاتے۔"

"ہاں! اس کے بعد آپ کا یہاں تھا ہی کون۔"

عالیہ رفیق احمد ان کے طنز کو پا گئیں۔

"تم جانتے ہو کہ میں کتنی مصروف رہتی ہوں۔" انھوں نے ایک سرد آہ کھینچی پھر بولیں۔ "ویسے عاصمہ نے بڑی غلطی کی۔"

"غلطی!" جلیس الحسن نے طنز اور استعجاب سے ان کا لفظ دہرایا۔ "آپ لوگوں کی تو خواہش ہی تھی کہ عاصمہ وہیں آ بسیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ہم دونوں بہنیں اور بھائی عاصمہ کے بھی امریکا آ بسنے کے خواہاں تھے مگر اس طور ہرگز نہیں جیسی غلطی کہ اس نے کی۔"

جلیس الحسن نے خاموشی پر اکتفا کیا۔

"جلیس!" ادھر سے چونک کر کہا گیا۔

"جی سن رہا ہوں۔"

"ہم بھائی بہنوں کی خواہش تھی کہ عاصمہ تمہارے اور بچوں کے ساتھ یہاں آ بسیں، ہم نے خدانخواستہ یہ ہرگز نہیں چاہا تھا کہ وہ ہماری خاطر اپنی بسی بسائی جنت کو ٹھکرا دیں۔" انھوں نے توقف کیا پھر بولیں۔ "بہرحال ہر غلطی کی ایک سزا ہوا کرتی ہے سو عاصمہ کو بھی اپنی غلطی کی سزا تو بھگتنی پڑی۔"

"گویا سزا اور جزا پر یقین رکھتی ہیں آپ؟"

"الحمدللہ مسلمان ہوں..... اصولاً مجھے تمہارے اس طنز کا برا ماننا چاہیے تھا مگر میں برا نہیں مناؤں گی کیونکہ جانتی ہوں کہ تم کس کرب سے گزرے ہو گے۔"

"بہرحال اب میں مطمئن اور خوش ہوں۔"

"خدا کا شکر ادا کیا کرو۔" انھوں نے کہا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی ہمشیرہ محترمہ کو سزا کس طور ملی؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ بیٹھے۔

"کیا تمہیں کوئی سن گن نہیں ملی کہیں سے؟"

"میں غیر متعلق لوگوں کے معاملات سے زیادہ دلچسپی رکھنے کی کوشش نہیں کرتا!"

"تو پھر اب کیوں پوچھ رہے ہو؟" عالیہ رفیق احمد نے انھیں ان کے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کی۔

"بس یونہی..... بائی دی وے!"

"کیا تمہیں واقعی خبر نہیں؟"

"کس بات کی؟"

"کہ عاصمہ کے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی؟"

"جی نہیں۔"

"عاصمہ اور اسد کا بمشکل دو برس ساتھ رہا پھر اختلافات ہو گئے اور دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔"

"اچھا!"

"ہم لوگوں نے عاصمہ کو بہت سمجھایا کہ بچوں کے پاس واپس چلی جاؤ مگر شاید وہ یہ سوچتی ہوں گی کہ اب کس منہ سے جاؤں۔"

اُن کے چہروں پر حیرانی اور دبی دبی مسرت کی ملی جلی کیفیت اُبھری لیکن ذرا سی دیر میں دُھندلا گئی۔

"کوئی خاص بات پاپا؟" اعجاز نے پوچھا۔

"انہیں کسی سے تمہارے ایکسیڈنٹ کا پتا چلا تھا۔ تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا انھوں نے!"

"بہت جلد کو خیال آ گیا!" اعجاز نے تلخ لہجے میں کہا۔

الفت کو اُس کے جواب سے یک گونہ طمانیت ہوئی۔

"بیٹے! انہیں اطلاع ہی کل ملی تھی، فوراً ہی انھوں نے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔" جلیس الحسن بولے۔

"ٹھیک ہے پاپا! جاپ کے ایکسیڈنٹ کی خبر تو انہیں کل مل گئی ہم لوگ تو یہاں کل سے پہنچے ہیں ہتے، وہ مسکرا کر پوچھ بھی ہمارے ساتھ سکتے تھے۔" انجیلین نے کہا۔

"ہاں اور کیا!" اعجاز نے بہن کی تائید کی۔

"اور فون بھی کیا تو خالہ آنٹی نے!" فراز تلخی سے بولا۔ "کیا کسی اور کو خیال نہیں آیا؟"

اُن سب سے کسی کے لیے یہ سمجھنا محال نہ تھا کہ "کسی اور" سے فراز کی مراد کیا تھی۔

وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ کیا ان کو اعجاز کی خیریت معلوم کرنے کا خیال نہیں آیا؟

"چھوڑو مس تھنے کو!" اعجاز نے کہا۔

اُس کے لہجے میں موہوم سا دکھ تھا۔

الفت طمانیت محسوس کر رہی تھی۔

لیکن جلیس الحسن کو بچوں کے ملول چہروں کو دیکھ کر ملال ہو کہ کیوں انھوں نے صبح ہی اُن سے یہ ذکر کر دیا تھا۔ انھوں نے تو اپنی دانست میں یہ قیاس کیا تھا کہ وہ چاروں اپنی خالہ کے فون کرنے کی خبر سن کر خوش ہوں گے اور اگر خیر ملال کر وہ دکھی ہو جائیں گے تو کم از کم صبح ناشتے کی میز پر یہ تذکرہ نہ کرتے وہ اب جب کہ ذکر چھیڑ ہی رہا تھا تو وہ انہیں وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ نہ رہ سکے تھے جو وہ یقیناً جاننا چاہتے ہوں گے۔

"آپ کی ماما تو سات دن فرانس کو میں رہ رہی ہیں!"

اُن میں سے کوئی زبان سے کچھ نہیں بولا

لیکن ان سب کی آنکھوں نے اُن سے تقاضا کیا:

"مجھ سے یادرے بیں کچھ اور بتایئے پاپا!"

"آپ کی آنٹی بتا رہی تھیں کہ اس سے تو اُن کی دو سال بعد ہی سیپریشن ہو گئی تھی!" انھوں نے توس پر جام لگانے کے بہانے اُن سے نظریں چراتے ہوئے بتایا۔

اُن چاروں نے بے ساختہ چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

اُن کی آنکھوں میں لحظہ بھر کو قندیلیں سی روشن نظر آئیں۔

پھر اُن کے چہرے پر دھواں دھواں نظر آنے لگے۔

اُلفت تو دیدہ لگا ہوں سے اُن کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

جلیس الحسن نے نیکھں اور جام لگے توس کا ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹ کر منہ میں تو لے لیا تھا اور آہستہ آہستہ چبا بھی رہے تھے مگر اُسے نگلنا انہیں کوہ گراں عبور کرنے کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔

بچوں کے ملول چہرے انہیں بھی دل گرفتہ کیے دے رہے تھے۔

عاصمہ کی بڑی ہمشیرہ عالیہ رفیق احمد کا فون آئے تقریباً دو ہفتے گزر چکے تھے۔

بچیوں اعجاز، فراز اور ندرت میں سے ہر ایک کا دل گو ہی دیتا تھا کہ اُن کی ماں کا فون بھی ضرور آئے گا۔

ہر صبح وہ اسی گمان کے ساتھ ناشتے کی میز پر آتے کہ شاید آج پاپا یہ کہیں کہ رات اُن کی ماں نے فون کیا تھا۔

وہ اپنے سکول، کالج اور یونیورسٹی تو چلے جاتے مگر دل میں یہی گمان ہلکورے لیتا رہتا کہ شاید فون کی گھنٹی بجنے پر جب گھر میں کسی نے فون ریسیو کیا ہو گا تو ایک مدھر آواز نے جس سے "حسن لاج" کے بام و در مجھی آشنا

تھے کہا ہو گا "میں عاصمہ بول رہی ہوں!"

جب وہ گھر واپس لوٹتے تو اُن کی پُر اُمید نگاہیں الفت سے ایک ہی سوال پوچھتی دکھائی دیتیں "کوئی فون تو نہیں آیا تھا؟"

اس امر کی گواہی تو جلیس الحسن کا دل بھی دیتا تھا کہ اعجاز کی خیریت معلوم کرنے کے لیے عاصمہ بیگم بھی ضرور فون کریں گی۔

عاصمہ کی بہن کا فون آنے کے بعد سے اُلفت جس دہشت کا شکار تھی اس کا اندازہ کچھ اسی کو تھا۔ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی دیگر اہل خانہ کے ساتھ اُس کے کان بھی ایک بیک کھڑے ہو جاتے اور دل بُری طرح دھڑکنے لگتا۔ دوسروں کی طرح اُس کے دل کی گواہی بھی یہی تھی کہ عاصمہ کا فون ضرور آئے گا۔

عالیہ رفیق کا فون آنے کے بعد کوئی آٹھ دس روز تو اپنی جگہ وہ سب ہی بے قرار رہے مگر پھر جلیس حسن اور چاروں بچوں کے دل پر چھائے انتظار اور بے تابی کا رنگ دھیرے دھیرے پھیکا پڑنے لگا۔

"وہ ہمارے بارے میں متفکر کیوں ہونے لگیں بھلا!" بچے دکھ سے سوچتے۔

"جب اتنے برس عاصمہ نے پلٹ کر بچوں کی خبر نہیں لی تو اب بھلا کیا لے گی!" جلیس ... بھی آپ سوچتے۔

مگر الفت کے دل کو جو کھٹکا لگا تھا وہ بدستور تھا۔

وہ جانتی تھی کہ طوفان آنے سے پیشتر سناٹا بھی چھا جایا کرتا ہے!

اس سناٹے سے اُسے خوف محسوس ہوتا تھا۔

اپنے باطن میں وہ بہت خوف زدہ تھی۔

کسی بھی لمحے کچھ ہو جانے کا خوف اُسے ہمہ وقت رہتا تھا۔

کانچ کا جو محل اُس کی رہگزر تھا ایک بس ٹھیس سے اُس کے پارہ پارہ ہو جانے کا ڈر اُس کے دل کو شکنجے میں دبوچے لیتا تھا۔

پھر وہ لمحہ آ پہنچا!

جلیس الحسن شہر کے ایک معروف صنعت کار کی محل نما کوٹھی کے مجوزہ نقشے میں اُلجھے بیٹھے تھے تو اُن کی سیکرٹری نے انٹرکام پر انہیں اطلاع دی:

"سر! مہوٹل تاج محل سے کوئی خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں!"

مصروفیت کیسی ہی کیوں نہ ہو کسی خاتون کی فون کال پر اُس سے بات نہ کرنے کی حماقت تو کوئی بدذوق مرد ہی کر سکتا تھا۔

جلیس الحسن بدذوق نہ تھے!

"بات کرایئے!" انھوں نے اپنی خاتون سیکرٹری سے کہا۔

"رائٹ سر!"

اور دو گھڑی بعد ہی مذکورہ خاتون لائن پر تھیں۔

"مسٹر جلیس!" استفہامیہ لہجے میں کہا گیا۔

اس آواز نے گہری آشنائی کے احساس سے جلیس الحسن کی رفتار دل بڑھا دی۔ یہ آواز تو وہ قرنوں بعد لاکھوں پار سے بھی پہچان سکتے تھے۔

مگر وہ تو ہزاروں میل دور بس رہی تھی۔

جبکہ فون کال سیکرٹری کی اطلاع کے مطابق تاج محل سے تھی۔

"اسپیکنگ" انھوں نے کہا۔

"عاصمہ بول رہی ہوں!"

"اوہ! تم ... مگر سکرٹ ... بتا رہی تھی تاج محل سے فون ہے!"

"ہاں میں تاج محل ...

"کیا تم یہاں ہو؟ کراچی میں؟"
"جی ہاں آج ہی آئی ہوں۔ گھر فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

وہ ... جلیس الحسن کو جو اس عورت کی آواز سُن کر یکبارگی جذباتی ہو گئے تھے جس کے ساتھ انھوں نے اٹھارہ برس انتہائی خوش و خرم ازدواجی زندگی بسر کی تھی اور جس کے بطن سے جنم لینے والے چار بچے ... ہوتے تھے احساس ہوا کہ اس عورت سے تو کئی برس ہوئے اُن کا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ دوسری غیر عورتوں کی طرح اب وہ بھی اُن کے لیے غیر ہی تھی۔

"کیسے ہیں آپ؟" اُس کا لہجہ خفت کی چغلی کھا رہا تھا۔
"زندہ ہوں اور بہت خوش۔" وہ تیکھے پن سے بولے۔
"اور بچے؟"
"کون سے بچے اور کس کے بچے؟"
"آپ کے اور میرے بچے۔"
"اونہہ! وہ تمہیں، تم ٹھکرا کر چلی گئی تھیں۔" وہ طنز سے بولے۔
"پلیز طعن و تشنیع کی ضرورت نہیں۔" عاصمہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کے بعد کہا۔ "مجھے عالیہ آپا کے ذریعہ اعجاز کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تھی۔ اُسے دیکھنے اور چاروں سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔"
"تم بہت ظالم ہو..... بہت ظالم ہو عاصمہ۔"
"ظالم کا طعنہ..... مجھے کچھ نہ کہیں..... میں اپنی غلطی کی سزا بھگت چکی ہوں، کچھ بھگت رہی ہوں۔" عاصمہ نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا پھر جلیس الحسن کو سسکیاں سنائی دینے لگیں۔

عاصمہ سے جلیس الحسن کو کتنے ہی گلے شکوے کیوں نہ ہوں آٹھ برسوں عاصمہ سے اُن کی دکھ سکھ کی ساجھے داری رہی تھی۔ وہ اُن کی من چاہی عورت اور اُن کی رفیق سفر رہی تھی..... اُس کی سسکیاں سُن کر وہ موم ہو گئے۔
"اعجاز اب بالکل ٹھیک ہے۔" وہ خفا مگر رسانیت سے بولے۔
"یہ اطمینان تو مجھے عالیہ آپا نے بھی دلا دیا تھا لیکن مجھے قرار نہیں آیا۔ میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا..... اُس سے ملنا چاہتی ہوں..... میں..... میں اُن چاروں سے ملنا چاہتی ہوں..... اُن کو دیکھ کر اپنے جلتے ہوئے دل کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتی ہوں۔"
"کاش! تم نے اس وقت سوچا ہوتا۔"

"سب کا ذکر مت کیجیے۔" عاصمہ نے بسور کر کہا۔ "اب کی بات کیجیے اور اب کی بات کیجیے۔"
جلیس الحسن نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بولے۔ "وہ ٹھیک ٹھاک ہیں مطمئن اور خوش ہیں تم ملو گی تو پھر ڈسٹرب ہو جائیں گے۔"
"پلیز مجھ پر یہ ظلم نہ کریں..... آئی وانٹ ٹو سی دیم..... میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں..... اپنی پیاس بجھانے کے لیے آئی ہوں..... کنوئیں کے پاس آ کر واپس نہیں پلٹوں گی۔" عاصمہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "خدا کے واسطے مجھے اُن کی دید سے محروم نہ کیجیے گا۔"
پھر جلیس الحسن کو عاصمہ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز سنائی دی۔
وہ پگھل گئے۔

"آل رائٹ۔ اگر وہ تم سے ملنا چاہیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"
"تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ.....!" عاصمہ نے کہا۔ "اب مجھ پر ایک مہربانی اور کیجیے۔"
"کیسی مہربانی؟"
"میں جانتی ہوں انھیں مجھ سے بہت شکایتیں ہوں گی، بہت متنفر ہوں گے وہ مجھ سے۔" عاصمہ نے پل بھر کو توقف کرنے کے بعد انتہائی لجاجت سے کہا۔ "آپ کو ان برسوں کی قسم جو ہم نے اکٹھے گزارے، اُن تک میری رسائی کے لیے راستہ ہموار کر دیجیے۔ میں..... میں اُن کی نگاہوں میں اپنے لیے نفرت اور بیزاری نہیں دیکھنا چاہتی۔"

جلیس الحسن سوچ میں پڑ گئے۔
اس کے سلسلے میں انھوں نے بچوں کے جذبات کو کبھی ٹٹولنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔
کیا عجب وہ اتنے متنفر ہو چکے ہوں اس سے کہ اُس کا نام سننا بھی گوارا نہ کریں۔
"آپ کو اُن لمحوں کی قسم جو ہم نے ساتھ گزارے۔" عاصمہ نے گڑگڑا کر کہا۔
"میں کوشش کروں گا۔"
"کوشش کرنے کی بات نہیں وعدہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے کیونکہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں..... آپ کی عزت کرتے ہیں..... آپ کو خدا اور اُس کے رسول کا واسطہ جلیس۔"
جلیس الحسن دم بخود رہ گئے۔
اس قدر لجاجت سے اتنا تڑپ کر تو عاصمہ نے اُن سے کبھی کچھ مانگا نہیں تھا۔
"ٹھیک ہے میں اپنی سی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"
"آج ہی بات کریں گے اُن سے..... ہے نا؟" عاصمہ نے تڑپ کر کہا۔

"ہاں۔"
"مجھ سے ملانے کے لیے آئیں گے آپ؟"
جلیس الحسن کو ایک موہوم سے دکھ کے احساس نے آ لیا۔
وہ عورت جو کبھی اُن کے نزدیک جان جہاں رہی تھی جب وہ ساتھ تھی تو اُن کے نزدیک اُس سے جدائی کا تصور بھی اُن کے لیے محال تھا آج تنہائی سے پوچھ رہی تھی "مجھ سے ملنے کے لیے آئیں گے آپ؟"
"مجھے ڈر ہے عاصمہ کہ میں تم سے اکیلے میں ملنے نہ آ سکوں گا۔" انھوں نے کہا۔
"سوری۔" عاصمہ نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں بھول گئی تھی کہ اب آپ صرف میرے بچوں کے باپ ہی نہیں ایک دوسری عورت کے شوہر بھی ہیں۔"
"بہرحال میں بچوں کے ہمراہ آنے کی کوشش کروں گا۔"
"میں انھیں دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔ ایک ایک پل بھاری ہے۔ زیادہ دیر مت کیجیے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"
"کیا واقعی؟" عاصمہ نے بے یقینی سے کہا۔
"ہاں میں جانتا ہوں کہ دوسروں کے دیئے ہوئے گھاؤ سے زیادہ انسان کو اپنے ہاتھوں خود کو دیے گئے زخموں کی تکلیف کہیں زیادہ محسوس ہوا کرتی ہے۔"
"تھینک یو..... تھینک یو جلیس کہ آپ نے میرا دکھ سمجھنے کی کوشش کی۔" عاصمہ بیگم نے بوجھل آواز میں کہا اور انھیں اپنا کمرہ نمبر بتا دیا۔

***

بچوں کو یہ خبر سنانے اور اُن کا ردِعمل دیکھنے سے پہلے جلیس الحسن نے الفت کو یہ خبر سنائی۔ اُس کا ردِعمل دیکھنے اور اُسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔
الفت حواس باختہ ہو کر رہ گئی۔
اُس کی سماعت میں خطرے کی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔
کانچ کے پل میں بال دکھائی دینے لگا۔
"کیوں آئی ہے وہ یہاں؟"
"میں نے تمہیں بتایا نا بچوں سے ملنے۔ اعجاز کو بطور خاص دیکھنے۔"
"وہ اس گھر میں نہیں آئے گی اگر اُسے بچوں سے ملنا ہے تو اس گھر سے باہر ہی ملے۔"
"اگر وہ آ بھی گئی اس گھر میں تو کیا فرق پڑ جائے گا؟" جلیس الحسن نے رسانیت سے کہا۔
"فرق!" الفت نے تڑپ کر کہا۔ "کیا وہ اپنے دوسرے شوہر سے علیحدہ نہیں ہو چکی ہے؟"

"یاں نو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"آپ کے لیے نہ ہی مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔"
"مثلاً؟"
"بس میں اسے اپنے گھر میں نہیں آنے دوں گی۔"
جلیس الحسن دھیرے سے مسکرا دیے۔
الفت انھیں گھائل ہرنی کی طرح متوحش نظر آ رہی تھی۔
"وہ بچوں سے ملنا چاہتی ہے۔ کیا عجب کہ بچے بھی اُس سے ملنا چاہیں!"
"بچوں کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے!"

"فرض کرو میں انھیں نہیں بتاتا ہوں، کیا تمہارے خیال میں وہ اُن تک پہنچنے کا کوئی اور ذریعہ نکالنے کی کوشش نہیں کر سکتی؟ وہ انھیں فون کر سکتی ہے اور ہم فون پر پہرہ نہیں لگا سکتے۔ وہ ادھر ادھر سے معلومات فراہم کر کے ان کے اسکول کالج یا یونیورسٹی تک پہنچ سکتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو وہ انھیں راستے میں بھی گھیر سکتی ہے۔ ہم کہاں کہاں پہرے لگا سکتے ہیں!"
"ٹھیک ہے اُسے بچوں سے ملنا ہے تو گھر سے باہر ملے۔ اس گھر میں تو میں اسے ہرگز نہیں آنے دوں گی۔"
"میں پوری کوشش کروں گا کہ ایسا ہی ہو لیکن بالفرض بچوں نے خود اُس سے ملنے کے لیے جانے کے بجائے یہ چاہا کہ وہ اُن سے ملنے کے لیے خود گھر آئے تب تو میں مجبور ہوں گا۔"
الفت زیادہ ہراساں نظر آنے لگی۔
جلیس الحسن اس کی وجۂ پریشانی سے ناآشنا نہ تھے۔
انھوں نے بڑے پیار سے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے شانوں پر رکھ دیے اور بڑی محبت سے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے: "کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟"

اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے اور اُس نے اپنا چہرہ اُن کے سینے میں چھپا لیا۔
"مجھ پر بھروسا رکھو۔" وہ اُس کے بالوں میں سبک سبک ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "تم نے اس گھر کی شیرازہ بندی میں جو اہم اور بھرپور کردار ادا کیا ہے اُس سے کوئی احسان فراموش ہی منکر ہو سکتا ہے اور..... میں احسان فراموشوں اور کم ظرفوں میں سے نہیں ہوں۔"
وہ چاہنے کے باوجود اُن سے یہ نہ کہہ سکی کہ لمحہ لمحہ وہ اُس لمحے سے خائف رہی تھی جب اُن کی زندگی سے نکل جانے والی عورت کی واپسی اس کے سکون کو تہ و بالا کر دے۔

اُس نے جی ہی جی میں سوچا۔ "کاش! میں آپ کو بتا سکتی کہ اس عورت کا خیال میرے لیے کس کس طرح سوہانِ روح بنا رہا تھا۔"
کاش! وہ انھیں بتا سکتی کہ اُن کے ساتھ چلتے ہوئے وہ ایک قدم بھی اس زعم کے ساتھ نہیں اُٹھا سکی تھی کہ اُس کے ہم قدم چلنے والا مرد صرف اور صرف اُس کا ہے۔

پہلی بار اس سے وحشتناکی میں جو کچھ غلطی سرزد ہوئی ہو دوسری بار گھر آنے کے بعد سے اب تک اس نے ہر قدم احترام و احتیاط کے ساتھ اُٹھایا تھا جیسے کانچ کی رہگزر پر چل رہی ہو!
"تمہیں عاصمہ کی آمد سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں جانِ من۔" انھوں نے اُسے سمجھایا۔ "تم میں اور اُس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس نے مجھے منتشر کر کے رکھ دیا تھا، تم نے مجھے ریزہ ریزہ سمیٹا ہے۔ اُس نے عورت ذات پر سے اعتماد متزلزل کر دیا تھا، تم نے اُسے بحال کیا ہے..... وہ میری محبوبہ تھی، تم میری محبت ہو۔"
الفت نے چونک کر سر اُٹھایا اور اُن کی طرف دیکھا۔
"کیا تم جانتی ہو کہ جب کوئی مرد کسی عورت کو اپنی محبوبہ نہیں بلکہ اپنی محبت قرار دیتا ہے تو اُس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"
"کیا؟" اُس نے بے ساختہ پوچھا۔
وہ دھیرے سے مسکرا دیے اور اُس کی ناک کی پھننگ کو چھوتے ہوئے بولے۔ "اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد اس عورت کو بے حد عزیز رکھتا ہے۔"

وہ ٹکٹکی باندھے بھیگی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہی۔
"الفت! تم نے بہت سی کڑی منزلیں بہت بہادری اور جرأت کے ساتھ سر کی ہیں، یہ آخری منزل اور رہی۔"
"کاش! آپ اندازہ کر سکتے کہ یہ منزل کتنی کڑی ہے!" اُس نے جی ہی جی میں سوچا۔
اُن کی تمام تر یقین دہانیوں اور تسلیوں کے باوجود اُس کے من پر چھا جانے والی گھٹا چھٹنے نہ پا رہی تھی۔
یوں لگتا تھا جیسے گرج چمک کے ساتھ طوفان آئے گا۔

عاصمہ کے چلے جانے کے بعد جلیس الحسن کی بچوں سے اُس کے بارے میں کم ہی بات ہوتی تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر ہی۔ خصوصاً الفت کے گھر سنبھال لینے کے بعد تو عاصمہ کا ذکر گویا شجرِ ممنوعہ بن گیا تھا۔
وہ اس حقیقت سے تو بے خبر نہ تھے کہ بچے ماں کو بھلا نہ سکتے تھے مگر اب اُس کی آمد پر اُن کے کیا جذبات ہو سکتے تھے اس کا انھیں صحیح اندازہ نہ تھا۔
وہ یہ تو جانتے تھے کہ الفت سے بچوں کے کیسے ہی خوشگوار مراسم کیوں نہ استوار ہو چکے ہوں، بعض معاملات میں وہ اس سے متنفر نظر آنے لگے تھے۔
چنانچہ اس خدشے کے تحت کہ شاید بچے الفت کے سامنے ماں کی آمد پر اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ کر پائیں، انھوں نے بچوں سے فرداً فرداً الفت سے علیحدگی میں بات کرنا مناسب جانا۔ اس ضمن میں وہ الفت کو پہلے ہی اعتماد میں لے چکے تھے۔

"مجھے یقین ہے کہ بچے عاصمہ سے ملنے سے قطعاً انکار کر دیں۔" انھوں نے الفت سے کہا تھا۔
"تب؟" الفت نے خدشات سے لبریز نگاہیں اُن پر مرکوز کی تھیں۔
"تب تو پھر عاصمہ کو واپس ہونا پڑے گا۔"
"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" الفت نے دل ہی دل میں خاموشی سے دعا کی۔
اس رات جب جلیس الحسن نے ان چاروں کو یکجا کر کے الفت سے علیحدگی میں بچوں کو بتایا کہ ان کی ممی پاکستان آئی ہوئی ہیں تو اُن کے چہروں پر حیرانی اور خوشی کی ایسی ملی جلی کیفیت عود کر آئی کہ جلیس الحسن دیکھتے ہی رہ گئے۔
"رئیلی پاپا؟" زرین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"ہاں بیٹا! وہ آئی ہوئی ہیں۔"
"کب سے آئی ہوئی ہیں؟" زرین نے بے تابانہ پوچھا۔
"بھئی! مجھ سے تو اُن کے بیان کے مطابق وہ آج ہی پہنچی ہیں۔"
تمکین، اعجاز اور فراز دم بخود بیٹھے تھے۔
اور زرین جو باپ کی چہیتی اور لاڈلی ہونے کے سبب اکثر اُن کی مشکل آسان کر دیا کرتی تھی اس وقت اُن کی مشکل آسان کیے بیٹھی تھی۔
"کیا..... آپ سے بات کی انھوں نے؟" زرین نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔
"ہاں، آج دفتر کے نمبر پر بات کی تھی انھوں نے مجھ سے۔"
"کس وقت؟"
"سہ پہر کو۔"
"ائیرپورٹ سے بات کی تھی؟"
"نہیں، تاج محل سے جہاں وہ ٹھہری ہوئی ہیں۔"
"آئی کیوں ہیں؟ ان کا تو کوئی رشتے دار یہاں نہیں رہتا۔" اعجاز نے گمبھیر آواز میں کہا۔
"تم لوگوں سے ملنے..... بالخصوص تمہیں دیکھنے۔"
"مجھے!" اعجاز شدت سے بڑبڑایا: "مجھ سے کیا تعلق ہے ان کا؟"
"بیٹے ہو تم اُن کے۔"

"فادر کا ڈسیک پاپا!" اعجاز نے سر جھٹک کر کہا۔
جلیس الحسن کو حیرانی نے آلیا۔

اگر وہ واقعی ان سے متنفر تھا تو اس کی تصویر اس نے اپنے کمرے میں کیوں سجا رکھی تھی!

"اب تو ہم بہت بڑے ہو گئے ہیں پاپا!" فراز نے کہا۔
"تو؟" جلیس الحسن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"تو یہ کہ ہمیں اُن سے ملنے کی ضرورت نہیں۔"
جلیس الحسن کی سماعت میں حاصمہ بیگم کی سسکیاں بازگشت کی صورت ابھرنے اور ڈوبنے لگیں۔
"شی از ڈاؤٹ فل ٹو سی یو" جلیس الحسن نے عاصمہ کی وکالت کی۔
"تو ہم کیا کریں..... ہماری بلا سے!" فراز تلخ لہجے میں بولا۔
جلیس الحسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔
پھر جلیس الحسن نے رسانیت سے کہا: "وہ تمہاری ماں ہیں!"
"سو واٹ پاپا! ہم تھی تو اولاد تھے ان کی!" اعجاز جھنجلا کر بولا۔
"بہت بے چین ہیں وہ تم لوگوں سے ملنے کے لیے" تمکین اور مذہرین نہایت مضطرب دکھائی دینے لگیں۔
"مگر ہم بے چین نہیں ہیں اُن سے ملنے کے لیے۔"

"ماما جی! ڈونٹ بی سو کرو کن" نگین نے تڑپ کر کہا۔
جلیس الحسن نے چونک کر نگین کی طرف دیکھا۔
"تم! تم بھی ظالم تھی جو یہ بات ہوتے تھی کہ ظلم کس نے کیا تھا؟ ظالم کون ہے؟" اعجاز جھنجھلا کر بولا۔
"ٹھیک ہے" نگین نے سر جھٹک کر کہا۔ "مگر ایک تم کبھی ہو تو یہ ہمارا گونا تھا۔ ہم سب شامل تھے سب سے زیادہ ظلم تو زرین پر ہوا تھا کتنی چھوٹی سی ہو کر رہ گئی تھی یہ ان دنوں!"

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟" اعجاز نے اُسے تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔
نگین نے سر جھٹکا اور پھر دھیمے سے بولی: "تمہیں پاپا سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ پاپا سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے توقف کیا پھر ذرا کی ذرا باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی: "پاپا! آپ نے ہمیشہ ہمیں راستہ دکھایا ہے اور ہم نے ہمیشہ آپ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اب بھی آپ ہی بتائیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"
جلیس الحسن نگین کا منہ تکتے رہ گئے۔
بے شک وہ ایم ایس سی کی طالبہ تھی۔

چاروں بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔
سمجھ دار بھی تھی۔
مگر انہیں اس سے ایسی دانشمندی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔
کس دانشمندی اور خوبصورتی سے اس نے نہ صرف اپنا بلکہ باقی بہن بھائیوں کے دامن بھی صاف بچاتے ہوئے حملہ بوجھ انہی پر ڈال دیا تھا۔
وہ کچھ دیر منتظر رہی۔
پھر اس نے کہا: "آپ کی کیا رائے ہے پاپا؟"
"میری رائے؟" وہ چونکے۔ "کس سلسلے میں؟"
"اسی سلسلے میں کہ ہمیں اُن سے ملنا چاہیے یا نہیں؟" نگین نے بڑی چابکدستی سے پانسا پھینکا۔
"تمہاری کیا مرضی ہے؟" جلیس الحسن نے اُلٹ چال چلنے کی کوشش کی۔
"ہم وہی کریں گے جو آپ چاہیں گے" نگین نے پھر دانشمندی کا مظاہرہ کیا۔
جلیس الحسن کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔

کیسا الجھا کے رکھ دیا تھا نگین نے انہیں!
سارا بوجھ انہی پر ڈال دیا تھا۔
اعجاز اور فراز کے چار جانے دیئے کے بیش نظر وہ تو کچھ دیر قبل یہ سوچ رہے تھے کہ اب وہ عاصمہ کو جتا سکیں گے کہ بعض غلطیوں کا انجام انسان بھگتا تک نہیں ہوا کرتا ہے کہ اپنے وجود کے حصے تک اپنے نہیں رہتے۔
اُن کا خیال تھا عاصمہ تڑپے گی، روئے گی، بلبلائے گی۔
شاید ہو، دروں بیت کبھی سر ٹکرائے گی۔
وہ رحمت بستہ ان کے سامنے گڑگڑا رہی ہوگی۔
تڑپے گی، معافیاں مانگے گی۔
وہ اس کے تڑپنے بکھرنے پر کتنا دوں کے سامنے لرزاں دیکھ سکیں گے۔
اور یوں شاید کسی حد تک ان دکھوں کا تاوان ادا کر دے گی جو اس کے جانے کے بعد انہوں نے اور بچوں نے بھگتے تھے۔

پھر وہ بچوں کو اس سے ملنے پر مجبور کر کے کسی منتور فاتح کی طرح اپنی گردن اکڑا لیں گے!
مگر۔
نگین نے تو بساط ہی اُلٹ دی تھی۔
انہوں نے تو عاصمہ کے جانے کے بعد ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اگر کبھی حساب کتاب کا موقع آیا تو عاصمہ ہی نقصان میں رہے گی۔
لیکن
یہاں تو کچھ اور ہی صورت حال بن رہی تھی۔

"بتائیں پاپا!" نگین نے تقاضا کیا۔
"کیا بیٹے؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن گئے۔
"یہ کہ ہمیں اُن سے ملنا چاہیے یا..... ؟" اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔
"میرے خیال میں تو مل لینے میں کوئی حرج نہیں" وہ محتاط لہجے میں بولے۔
"ٹھیک ہے پاپا!" نگین نے سعادت مندی سے گردن ہلائی۔
"کیا ٹھیک ہے؟" اعجاز جھنجھلا کر بولا۔
"اگر پاپا یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اُن سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں تو ہمیں اُن سے مل لینا چاہیے"
"یو آر سلی!"
"سلی میں ہوں! تم جو ہر وقت پاپا کی بات کا خیال رکھتے ہو؟"

"دیکھو رہنے دیں پاپا آپ رہنے" اعجاز نے شکایتی لہجے میں کہا۔
"آل رائٹ..... آل رائٹ....." جلیس الحسن نے دونوں ہاتھوں سے امن و آشتی کے قلم کا کام لینے کی کوشش کی۔
"لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں، جو کچھ کرنا ہے باہم اتفاق سے"
"جانی کو سمجھائیں پاپا کہ کبھی کبھی غصہ دل میں ہی رکھنا چاہیے آخر اس کا بھی آرام کرنے کو جی چاہتا ہوگا"
نگین بولی۔
جلیس الحسن مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔
اعجاز نے منہ پھلا لیا۔
توقف سے جلیس الحسن نے ان چاروں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا: "تو آپ لوگ ابھی ماما سے ملنے کے لیے تیار ہیں؟"
"ایبز لیوٹلی پاپا!" نگین نے کہا۔
"اعجاز بیٹے! تمہاری کیا مرضی ہے؟"

اعجاز کچھ نہیں بولا بدستور منہ پھلائے بیٹھا رہا۔

"فراز بیٹے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے پاپا جیسے آپ کی مرضی۔" فراز نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اعجاز نے چونک کر فراز کو دیکھا۔

زرتین کچھ دیر لب منتظر رہنے کے بعد بولی۔ "پاپا آپ نے مجھ سے نہیں پوچھا؟"

جلیس الحسن مسکرا دیئے۔

"چلو تم بھی بتا دو کہ تمہاری کیا مرضی ہے؟"

"میرا ووٹ نگی باجی اور فراز بھائی کے ساتھ ہے۔"

"گڈ۔"

"پاپا! ایک بات تو بتایئے۔" زرتین نے کہا۔

"ہاں پوچھو۔"

"مما ہوٹل میں کیوں ٹھہری ہیں؟"

"کیونکہ یہاں اُن کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں رہتا۔"

"ہم لوگ تو تھے پاپا۔" زرتین نے جوان کی لاڈلی بیٹی تھی بلا تامل کہا۔

جلیس الحسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر قدرے تلخ لہجے میں بولے۔ "بیٹا! آپ لوگوں سے انھوں نے تعلق ہی کہاں رکھا! کس منہ سے وہ آتیں یہاں؟"

حقیقت یہ تھی کہ اس وقت جلیس الحسن کو عاصمہ سے حسد محسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے گزشتہ برسوں کے دوران بچوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ انھیں اپنا بنائے رکھنے کی خاطر تو انھوں نے الفت کو ایک مسلسل آزمائش کی بھٹی میں تپ و تاب دینے سے بھی دریغ نہ کیا تھا تب کہیں جا کے ان کی نظروں میں سربلند بنے تھے جبکہ عاصمہ...! ایک بڑی لغزش کے باوجود بھی نقصان میں نہ رہتی نظر آ رہی تھی!

ان کے گمان میں نہ تھا کہ حقیقت روایتی قصوں اور داستانوں سے اس درجہ مختلف بھی ثابت ہو سکتی ہے!

"تو کل آپ چل رہے ہیں؟" جلیس الحسن نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں پاپا؟" نگین نے حیرانی سے پوچھا۔

"اپنی مما سے ملنے۔"

"کیا وہ یہاں نہیں آئیں گی؟" نگین کی حیرانی بڑھ گئی۔

"آنا تو انھی کو چاہیے۔ ہم کیوں جائیں ملنے!" فراز نے زبان کھولی۔ "وہ ہمیں چھوڑ کر گئی تھیں! ہم نے تو انھیں نہیں چھوڑا تھا۔" اس نے زہر خند لہجے میں مزید کہا۔

جلیس الحسن کو تھوڑی سی تقویت تو ملی۔

"فراز ٹھیک کہتا ہے۔" اعجاز نے پہلو بدل کر کہا۔

جلیس الحسن چونکے اور انھوں نے اعجاز کو دیکھا۔

کیا اُس کا فراز کی تائید کرنا اس امر کا اظہار نہ تھا کہ ماں کی نسبت اُس کے خیالات میں واضح تبدیلی موجود تھی۔

لیکن مسئلہ یہ بھی تو تھا کہ الفت نہیں چاہتی تھی کہ عاصمہ گھر آئے۔

چنانچہ انھوں نے کہا۔ "میری رائے تو یہ ہے کہ آپ لوگ ایک دفعہ اُن سے خود جا کر مل لیں پھر اُن کی مرضی کہ وہ آئیں یا نہ آئیں۔"

"پاپا!" زرتین نے ہچکچاتے ہوئے۔ "کیا آج ہی نہیں چل سکتے ہم لوگ؟"

جلیس الحسن نے گہری نگاہوں سے اُسے دیکھا پھر ہلکی سی ناگواری کے ساتھ بولے۔ "بہت بیتاب ہوئی جا رہی ہو تم!"

زرتین خجل سی ہو گئی۔

نگین نے جب زرتین سے ان جیسی محبت کی آگے خجل ہوتے دیکھا تو اس کی مدافعت کرتے ہوئے بولی۔

"اِٹ از جسٹ نیچرل پاپا!"

"جی پاپا۔" اعجاز نے کھلی تائید کی۔ "اس میں زرتین بے چاری کا کیا قصور! یہ تو بالکل فطری سی بات ہے۔"

جلیس الحسن اعجاز کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

"ہاں پاپا۔ مما اگر ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارے دل سے بھی اُن کی محبت ختم ہو گئی۔" نگین نے کہا۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔

ان چاروں کی خوبی یہی تھی کہ آپس میں لاکھ معرکہ آرائیاں ہوتیں لیکن جب کہیں اور سے اپنوں میں سے کسی پر بھی آنچ آتے دیکھتے تو متحد ہو کر مقابلہ کرتے۔

جوان بچوں کے جواز و دلائل، اُن کی دانشمندی، اُن کی ترپ چالوں کے آگے جلیس الحسن خود کو بے دست و پا محسوس کر رہے تھے۔

انھیں عاصمہ پر رشک سا ہو رہا تھا۔

"کل کس وقت چلیں گے پاپا؟" نگین نے پوچھا۔

"سہ پہر کو بیٹا!"

"کیا آپ دفتر سے جلدی آ جائیں گے؟"

"ہاں!"

"بھائی تم بھی چلو گے نا؟" نگین نے مسکراتے ہوئے اعجاز کو دیکھا۔

"میں تمہاری طرح احمق نہیں ہوں۔" اعجاز نے خفگی سے کہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں ایک افلاطون بھی بستا ہے۔" نگین نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"تو آپ نہیں چلیں گے؟" فراز نے بھائی سے پوچھا۔

"تب کی بات تب دیکھی جائے گی۔"

جلیس الحسن کو اُن کی اپنی ڈپلومیسی حیران کیے دے رہی تھی۔

اعجاز تو "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کی تفسیر دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بے چارہ بھی کیا کرتا۔

محبت کی بعض اقسام ایسی بھی ہیں جو انسان کو صحیح یا غلط، جائز یا ناجائز، مناسب یا نامناسب، فائدہ یا نقصان سے ماورا کر دیتی ہیں۔

ماں سے اولاد کی محبت بھی ایسی ہی اقسام کے زمرے میں آتی ہے!

اگلے روز سہ پہر کے وقت جب جلیس الحسن نگین، فراز اور زرتین کو لے کر عاصمہ سے ملوانے کے لیے جا رہے تھے تو الفت کے دل پر ایک ناقابل بیان وحشت سوار تھی۔

ان تینوں کی سج دھج اور اُن کے چہروں پر پہلے بہانے سے اُمڈ آنے والی مسکراہٹ اُسے جلا کر کے دے رہی تھی۔

عاصمہ سے اُسے انوکھا سا حسد محسوس ہو رہا تھا۔

"ایسی عورتیں کتنی خوش قسمت ہوا کرتی ہیں کہ جو مرضی آئے کر لیا پھر بھی بازی انھی کے ہاتھ رہا کرتی ہے۔" وہ انتہائی رشک سے سوچ رہی تھی۔

کم و بیش کچھ ایسی ہی کیفیت سے جلیس الحسن بھی دوچار تھے۔

"کیسی عجیب بات ہے عاصمہ کہ تم میری توقع کے برخلاف نقصان میں نہیں رہیں!" وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

کاش!

الفت اور جلیس الحسن سطحی صورت حال سے نتائج اخذ کرنے کے بجائے گہرائیوں میں جھانک سکتے۔

عاصمہ بیگم نے بچوں کی مدارات میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔
انھیں بہت پیار کیا۔
کافی دیر ان کے ساتھ گزارنے کے بعد شام ڈھلے جب جلیس الحسن نے رخصت ہونے کا ارادہ کیا تو عاصمہ بیگم نے بچوں کو چند تحائف بھی دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے تردد کیا تو وہ گلوگیر آواز میں بولیں۔ "بیٹا خطا کی سزاوار ہوں مگر تمہاری ماں ہوں بہت دکھ ہوگا مجھے اگر تم نے ان چیزوں کو قبول نہ کیا۔"
عاصمہ بیگم نے یہ بات اتنے درد بھرے لہجے میں کہی کہ جلیس الحسن کا دل بھی پگھل گیا۔
"لے لو بیٹے!" انھوں نے بچوں سے کہا۔
انھیں تو گویا اجازت ہی درکار تھی۔
پھر عاصمہ بیگم نے پولی تھین کے ایک شاپنگ بیگ میں ملفوف سوغات جلیس الحسن کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کے لیے ہے۔"
"یہ کیا؟" وہ چونک کر بولے اور انھوں نے عاصمہ بیگم کی پیش کردہ سوغات کو لینے سے تردد کیا۔
"پلیز! مجھے مایوس نہ کیجیے گا۔" انھوں نے اس قدر لجاجت سے کہا کہ جلیس الحسن کو لیتے ہی بنی۔
"مجھے یقین ہے آپ کو پسند آئے گا۔" عاصمہ بیگم بولیں۔
"پاپا دیکھیے تو ذرا، اس میں کیا ہے؟" زرمین آگے بڑھی۔
جلیس الحسن نے شاپنگ بیگ اسے تھما دیا۔
زرمین نے شاپنگ بیگ میں ملفوف تحفہ نکال کر جلیس الحسن کے سامنے کیا تو وہ ششدر رہ گئے۔
عاصمہ بیگم ان کی پسندیدہ برانڈ کی خوشبویات کا ایک خوبصورت سیٹ لائی تھیں۔
"تمہیں یاد رہا کہ میں کون سی خوشبو استعمال کرتا ہوں!" وہ بے ساختہ چونکے۔
"بھولنا آسان تو نہیں تھا۔" وہ حزنیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔
جلیس الحسن ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔
جب وہ چلنے لگے تو عاصمہ بیگم نے دبی زبان سے کہا۔ "کیا میں اعجاز سے ملنے کے لیے آپ کے گھر آ سکتی ہوں؟"
"آپ کے گھر!"
عاصمہ کے ان الفاظ پر جلیس الحسن سکتے میں رہ گئے۔
وقت نے انھیں کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔
وہ جانتے تھے کہ الفت کو عاصمہ کا گھر آنا گوارا نہ ہوگا۔
کم از کم اتنی جلدی تو ہرگز نہیں۔
اور وہ اپنے گھر کے خوشگوار اور پُرسکون ماحول میں کوئی تلخی پیدا نہ کرنا چاہتے تھے۔
سو انھوں نے اعجاز کو آڑ بناتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں تمہیں اعجاز کو اس کی آمادگی کے لیے کچھ وقت دینا چاہیے۔"
"کتنا وقت؟" وہ بیتابانہ بولیں۔
"کم از کم دو چار دن تو ضرور دو۔"
"اس سے کچھ فرق پڑے گا؟"
"ہاں میں سمجھتا ہوں ضرور پڑنا چاہیے۔ اس دوران یہ تینوں تمہارے پاس آتے جاتے رہیں گے جب وہ انھیں تم سے ملتے جلتے دیکھے گا، ان سے تمہاری باتیں سنے گا تو یقیناً تم سے ملنے پر آمادہ ہو جائے گا۔"
حقیقت یہ تھی کہ چند دن کا یہ وقفہ وہ اعجاز کے لیے کم الفت کے لیے زیادہ ضروری سمجھتے تھے۔
"ٹھیک ہے۔" عاصمہ بیگم نے بوجھل آواز میں کہا۔ "جیسے آپ کی مرضی۔"
"اچھا اب ہم لوگ چلتے ہیں۔"
"بیٹا اب کب آؤ گے تم لوگ میرے پاس؟" عاصمہ بیگم نے بچوں سے پوچھا۔
وہ تینوں ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے باپ کی جانب دیکھنے لگے۔

"یہ تو آتے رہیں گے۔" جلیس الحسن نے کہا۔
"کل پھر لائیں گے انھیں میرے پاس؟" انھوں نے بڑی لجاجت سے کہا۔
ان کے لہجے کی لجاجت نے جلیس الحسن کو پگھلا کے رکھ دیا۔
اگرچہ عاصمہ بیگم سے ان کا ناتا ٹوٹے عرصہ ہو چکا تھا۔
مگر ماضی میں تو بہرحال ان سے گہرا تعلق رہا تھا۔
"ہاں۔" انھوں نے کہا۔ "کل شام کو لاؤں گا انھیں تمہارے پاس۔"
"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے بڑی مہربانی۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولیں۔
الفت اور اعجاز دونوں ہی جلیس الحسن اور ان تینوں کی واپسی کے بے قراری سے منتظر تھے۔ اعجاز بچوں کی زبانی ماں سے ملاقات کی روداد سننا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ماں سے ان کی کیا باتیں ہوئی تھیں؟
اور کیا وہ اس کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔
الفت مضطرب تھی کہ انھیں اتنی دیر کیوں ہو گئی تھی۔
رات ہونے کو تھی اور وہ اب تک واپس نہ لوٹے تھے۔
بار بار اس کی نگاہیں گھڑی پر جا رہی تھیں۔
وہ بولائی بولائی سی گھر میں پھر رہی تھی۔
بار بار اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتی۔
گھبرا گھبرا کر برآمدے میں نکل آتی اور کوٹھی کے صدر دروازے کی سمت نگاہیں لگا کے کھڑی ہو جاتی۔
جیسے ہی جلیس الحسن کی گاڑی کوٹھی میں داخل ہوتی دکھائی دی وہ وسیع برآمدے کی آخری سیڑھی پر جا کھڑی ہوئی۔
"بہت دیر کر دی!" اس نے جلیس الحسن کے گاڑی سے اُترنے کے بعد برآمدے تک آ پہنچنے کا بھی انتظار نہ کیا۔
"ہاں... ہاں..." انھوں نے اس کی تشویش کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔
الفت کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ خاصی بازپرس کے موڈ میں تھی اور جلیس الحسن اس سمے بچوں کے سامنے کچھ کہنا سننا نہ چاہتے تھے۔
تینوں بچے خاصے مسرور دکھائی دے رہے تھے۔
"ہیلو ممّا..." ان میں سے ہر ایک نے کہا۔
"ہیلو جان۔" اس نے حسبِ معمول محبت سے جواب دینے کی کوشش کی۔
کمرے میں آتے ہی اس نے پھر کہا۔ "بہت دیر لگائی آپ نے؟"
"سبھی بچے کئی سال کے بعد ماں سے ملے تھے اتنی رعایت تو انھیں دینا ہی تھی۔"
"آپ کی بھی تو کئی برس بعد ملاقات ہوئی تھی؟" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔
"کیا مطلب؟" انھوں نے چونک کر الفت کی طرف دیکھا۔
"مطلب یہ کہ رعایت کی ضرورت بچوں کو تھی یا آپ کو؟" الفت نے انھیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔
"بچوں کی سی باتیں مت کرو۔"
"میں سب سمجھتی ہوں۔"
"تم کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔" وہ جزبز نظر آنے لگے۔
"ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا بچے کیسے ہیں جو بڑے فخر سے اُس ماں سے ملنے چل دیے جو انھیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔"
"الفت!" وہ صاف صاف بولے۔ "آدمی خطا کا پتلا ہے غلطی مجھ سے، تم سے کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ خطا کار کو ہمیشہ کے لیے مصلوب کر دینا انصاف نہیں.... اور جہاں تک بچوں کے جانے کا سوال ہے کچھ بھی سہی عاصمہ اُن کی ماں ہے۔ ان سے ان کا محبت کرنا قطعاً فطری ہے۔"
الفت ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

ہفتہ بھر گزر چکا تھا۔

اور اس دوران تگین، فراز اور زرّین کی عاصمہ سے چار ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔

وہ تینوں ماں سے مل کر بے حد خوش تھے۔ ہر مرتبہ ماں سے مل کر آنے کے بعد وہ تینوں تادیر اس ملاقات کا ذکر کرنے میں منہمک رہتے۔ اور اعجاز انھیں رشک سے دیکھے جاتا۔ جب وہ تینوں اُس کے سامنے ماں کی باتیں کرتے تو اُس کے دل میں عجیب سی چبھن ہونے لگتی۔

کتنی عجیب بات تھی کہ ماں کے جانے کے بعد اُسی نے ماں کو سب سے زیادہ یاد رکھا تھا۔ ماں سے اُس کی محبت کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ تھا کہ کئی برس تک اُس نے ماں کی تصویر اپنے سرہانے دبائے رکھی تھی جو اُس کے ایکسیڈنٹ کے بعد الفت کی وسیع القلبی کے سبب اب سائیڈ بورڈ پر دھری نظر آنے لگی تھی۔

مگر جب ماں اُن سے ملنے کے لیے لوٹ آئی تو وہی نقصان میں رہا تھا۔ باقی تینوں بھائی بہن تو ماں سے کئی مرتبہ مل چکے تھے وہ اب تک اُن کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پایا تھا۔

تگین، فراز اور زرّین سے ملنا اپنی جگہ ایک تسکین تھی مگر اعجاز کے لیے عاصمہ بیگم کے دل کا ایک گوشہ بدستور تڑپ رہا تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے انتہائی بے چین تھیں اور جب وہ اپنی بے چینی کا جلیس الحسن کے سامنے اظہار کرتیں تو وہ کہتے۔ "انشاء اللہ اس سے بھی جلد مل لو گی!"

کبھی کبھی تو عاصمہ بیگم کو یہ واہمہ گھیر تا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جلیس الحسن انھیں اعجاز کے بجائے اُس کے بارے میں کسی روح فرسا خبر کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر رہے ہوں!

چنانچہ جب تینوں بچے اُن سے ملنے کے لیے آتے تو وہ بار بار اُن سے پوچھتیں۔ "بیٹا! اعجاز ٹھیک تو ہیں نا؟"

"جی! بالکل ٹھیک۔" اُن میں سے ہر ایک کا یہی جواب ہوتا مگر عاصمہ کے دل کو قرار نہ آتا۔

سچی بات تو یہ تھی کہ اگر وہ اعجاز سے ملنے کے لیے بے چین تھیں تو اعجاز بھی اُن سے ملنے کے لیے کچھ کم مضطرب دکھائی نہ دیتا اور جی ہی جی میں پچھتاتا تھا کہ کیوں نہ وہ بھی اپنے باقی بھائی بہنوں کی طرح ماں سے ملنے چلا گیا۔

تگین اور فراز بھائی کی قلبی کیفیت سے آشنا تھے مگر یہ سمجھنے سے قاصر کہ پاپا اعجاز کی ممی سے ملاقات کروانے میں غیر ضروری تاخیر کیوں کر رہے تھے!

بالآخر ایک دن تگین نے کہہ ہی دیا۔ "پاپا! آپ اعجاز سے ممی کے پاس چلنے کو کہیں تو سہی، میرا خیال ہے اب وہ راضی ہو جائے گا۔"

مگر اب جلیس الحسن عاصمہ کو اعجاز سے ملاقات کے بہانے گھر بلا کر انھیں اپنی پُر مسرت اور مطمئن زندگی کا نقشہ بھی تو دکھانا چاہتے تھے!

اُن کا خیال تھا کہ دو چار روز کی مہلت الفت کا موڈ درست کر دے گی مگر ان کا یہ خیال ہفتہ بھر گزر جانے کے بعد بھی خیالِ خام ثابت ہوا۔

بالآخر ماں سے اپنی چوتھی ملاقات میں تگین نے انھیں از خود ہی گھر آنے کی دعوت دے دی۔

"بیٹا! میں تو تمھارے پاپا کی اجازت کی منتظر ہوں۔" عاصمہ نے کہا۔

"پاپا!" تگین نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ممی کیا کہہ رہی ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔" جلیس الحسن نے نیم دلی سے کہا۔

"یعنی میں آ سکتی ہوں؟" عاصمہ بیگم کی آنکھیں دمکنے لگیں۔

جلیس الحسن نے رضامندی میں سر ہلا دیا۔

"تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ۔" اُن کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"کب آؤں گی؟"

"میں تو ابھی اسی وقت چلنے کو تیار ہوں۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کل پر رکھو۔"

"کل کس وقت؟"

"بچے تو عموماً دوپہر کے بعد ہی گھر پر ہوتے ہیں۔"

"دوپہر کے بعد آ جاؤں؟ میرا مطلب ہے سہ پہر کو؟"

"میرے خیال میں شام کو رکھو، میں بھی ہوں گا گھر پر۔"

"رائٹ۔"

"میں ڈرائیور کو بھیج دوں گا تمھیں لینے کے لیے۔"

"نہیں..... خود آ جاؤں گی۔"

"ڈرائیور چھ بجے تک تمھیں لینے پہنچ جائے گا۔"

"پاپا!" تگین نے سرگوشی میں کہا۔ "ممی کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کیوں نہ کھائیں؟"

"یہ پوچھ لو اپنی ممی سے۔"

"کیا؟" عاصمہ بیگم نے اپنی نگاہیں اُن پر ٹکا دیں۔

"آپ..... کل رات کا کھانا..... گھر پر ہی کھائیں..... ہم سب کے ساتھ۔"

عاصمہ بیگم نگاہیں جھکا کر تشکر آمیز انداز میں مسکرا دیں اور جب انھوں نے اپنی نظریں دوبارہ اٹھائیں تو اُن کی نگاہوں میں آنسو لرزاں تھے۔

"پہلے اپنے پاپا سے تو اجازت لے لو۔" وہ بوجھل آواز میں بولیں۔

"اجازت کی کیا بات ہے۔" وہ وقتی جوش کے زیر اثر کہہ بیٹھے اور بھول گئے کہ الفت کے عاصمہ کے بارے میں کیا جذبات تھے۔

"او کے..... او کے بیٹا!" عاصمہ بیگم نے تگین کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اُس کی دعوت قبول کر لی۔

الفت کو اس امر سے آگاہ کرنا کہ عاصمہ بیگم کل ان کی مہمان ہوں گی، جلیس الحسن کے نزدیک ایک کارِ گراں تھا۔

گزشتہ ایک ہفتے کے دوران انھوں نے جب کبھی الفت سے عاصمہ بیگم کے موضوع پر کوئی بات کرنا چاہی تھی، اُس نے شدید ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

اُسے تو بچوں کا عاصمہ بیگم سے ملنے جانا بھی گوارا نہ تھا۔ بس جبراً قہراً برداشت کرنے والی بات تھی۔

اس روز بھی جب جلیس الحسن نے عاصمہ بیگم کی اعجاز سے ملنے کے لیے بیتابی کا ذکر کیا تو اس نے ویسی ہی ناگواری کا اظہار کیا۔

"کل وہ اعجاز سے ملنے کے لیے گھر آ رہی ہے۔" جلیس الحسن نے اس کی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "بچوں نے اُسے رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ گھر میں کوئی بدمزگی ہو۔"

الفت جہاں کی تہاں رہ گئی۔

کیا جلیس الحسن اُسے تنبیہ کر رہے تھے اُس عورت کی بابت جس کے تصور نے اُسے اپنے لیے جلیس الحسن کا پیغام منظور کیے جانے کے بعد سے مشتعل کرنا شروع کر دیا تھا!

کیا کانچ کی وہ رہگزر جس پر اس نے ہر قدم بصد احتیاط اٹھایا تھا، پارہ پارہ ہونے جا رہی تھی؟

کیا شیشے کا وہ گھر جس کے بام و در پر جلیس الحسن کی زندگی سے نکل جانے والی عورت کی پرچھائیاں لرزاں تھیں بکھرنے جا رہا تھا؟

اوہ!

سبزہ زار پر ننھی کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور وہ نیم تاریک کمرے میں دلگیر پڑی تھی۔
دفعتاً ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا اور وہ دم بخود رہ گئی کہ یہ قہقہہ تو جلیس محسن کا تھا۔
اُف! کس قدر خوش تھے وہ!
کھانے کی میز پر بھی اُن کی نظریں بار بار عاصمہ کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔
جلیس محسن خوش تھے۔
بچے مسرور تھے۔
نوکر چہکے جا رہے تھے۔
شاید گھر کے بام و در بھی مسرور رہے ہوں!
تو پھر اس گھر میں اس کا کون تھا؟
اور کیا تھا؟
اُس کی گردن پر تناؤ سا طاری ہونے لگا۔
کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔
وہ اٹھی اور بے تابانہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔
ہر بار کھڑکی تک پہنچنے پر وہ کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے باہر جھانکتی۔
باہر جیسے دنیا پر محفل سی جمی ہوئی تھی۔
جلیس محسن ڈرائنگ روم میں کچھ دیر بچوں کی خوشنودی کا خیال عزیز رکھتے ہوئے بیٹھے رہے تھے اب کچھ مضطرب ہو چلے تھے۔ اُن کی نگاہیں بار بار اپنی خواب گاہ کی جانب اُٹھ رہی تھیں .... وہ جانتے تھے الفت نے عاصمہ کی آمد کو اُن کے سمجھانے بجھانے پر بڑا جبر اور برداشت کیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ الفت نے مروت کا محض بہانہ کیا تھا۔ درحقیقت وہ اپنے گھر میں عاصمہ کی موجودگی کو برداشت نہ کر پا رہی تھی!
عاصمہ بیگم جب بھی جانے کا ارادہ کرتیں زرین کہتی "تھوڑی دیر اور!"
بالآخر پونے بارہ بجے عاصمہ بیگم اٹھ ہی گئیں۔
"ڈارلنگ! آئی مسٹ گو ناؤ!" انھوں نے زرین کو پیار کرتے ہوئے کہا۔
"کل پھر آئیں گی؟" زرین نے پوچھا۔
"بیٹا! کل تم لوگ آؤ۔ میرے پاس اتنے دن گزار لیں گے۔" وہ بولیں پھر انھوں نے جلیس محسن سے کہا "کل کا دن آپ انھیں میرے ساتھ گزارنے کی اجازت دیں۔"
"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" وہ بولے۔
"ایسا کرو بیٹا کل سہ پہر کو تم لوگ میرے پاس آجاؤ۔ ہم سب مل کر باہر چلیں گے۔" انھوں نے اعجاز کا بازو تھپک کر محبت سے کہا "آؤ گے نا بیٹا؟"
"کوشش کروں گا۔" اعجاز نے جواباً کہا۔
"فار گیٹ اٹ بیٹا" وہ منہ ہی منہ میں بولیں۔
"بھائی جان آکر دیکھیے نا۔" زرین گڑگڑائی۔
اعجاز چند لمحوں کو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے گردن اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے!"
"تھینک یو" عاصمہ بیگم نے کہا "اچھا اب چلتی ہوں۔"
"اعجاز بیٹے!" جلیس محسن نے اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اپنی ممی کو ان کے ہوٹل تک تو چھوڑ آؤ۔"
"نہیں نہیں!" عاصمہ بیگم گھبرا کر بولیں "میں خود چلی جاؤں گی۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے ٹیکسی مل جائے گی۔"
"آپ اس وقت ٹیکسی میں اکیلی جائیں گی؟" نگین نے تشویش ظاہر کی۔
"ہاں تو کیا ہوا؟"
"یہ پاکستان ہے آپ کا امریکا نہیں۔"
"ڈارلنگ! میں نے جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ سیکھ رکھے ہیں۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے آخر تو آپ ایک خاتون ہیں۔"

"گھبراؤ مت" عاصمہ بیگم نے نگین کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں اکیلی جا سکتی ہوں اور وقت پڑنے پر اپنا دفاع بھی کر سکتی ہوں۔"
جلیس محسن جو ماں بیٹی کے درمیان مکالمہ سن رہے تھے بولے "تمہیں اعجاز کے ساتھ جانے میں کیا قباحت ہے؟"
"میں خود چلی جاؤں گی۔"
"میرے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتیں آپ؟" اعجاز نے انھیں گہری نگاہوں سے دیکھا۔
عاصمہ بیگم نے اس کا بازو تھام کر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں ڈرائیونگ کرتے دیکھنا ہی نہیں چاہتی۔"
جلیس محسن ان کے تردد کا سبب سمجھ گئے۔
وہ اعجاز کے ایکسیڈنٹ سے اس درجہ خائف ہو کر اپنے ماں ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔
"فراز بیٹے تم چھوڑ آؤ اپنی ماں کو۔" جلیس محسن نے فراز کو مخاطب کیا۔
"نہیں فراز بھی نہیں۔"
"کیوں؟ فراز بھی کیوں نہیں؟"
"کیونکہ میرے بیٹے فراز بھی اتنا ہی پیارا ہے جتنا اعجاز۔"
"پاپا آپ چھوڑ آئیں نا!" زرین نے کہا۔ اس کی اس تجویز نے جلیس محسن کو چونکا دیا۔
"ٹھیک ہے بیٹا!" نگین بھی کہہ اٹھی "بلکہ پاپا آپ کے ساتھ تو ہم سب چلیں گے ممی کو چھوڑنے۔"
عاصمہ بیگم نے جلیس محسن کو متذبذب دیکھا تو بولیں "ارے نہیں! میں خود چلی جاؤں گی۔"
"پاپا آپ چھوڑنے کے لیے چلیں نا۔" نگین نے کہا۔
"ہاں پاپا!" زرین بھی بول اٹھی۔
"اچھا ایک منٹ" جلیس محسن نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں آتا ہوں۔"
وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے برآمدے کی سمت چل دیے۔
جونہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے الفت نے اُنھیں تیکھی نگاہوں سے تکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "فرصت مل گئی آپ کو؟"
انھوں نے اس کی اس بات کو نظرانداز کرتے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا "میں ذرا عاصمہ کو ہوٹل تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔"
"کیوں؟" وہ بھڑک کر بولی۔
"کیونکہ رات کافی ہو چکی ہے اور اس وقت کسی عورت کا تنہا ٹیکسی میں کہیں جانا مناسب نہیں۔"
"بہت خیال ہے!"
جلیس محسن کچھ نہیں بولے اور انھوں نے دروازے کا رخ کیا۔
"کوئی اور چھوڑنے نہیں جا سکتا کیا؟" الفت کی غصے میں ڈوبی آواز نے اُن کے قدم پکڑ لیے۔ وہ پلٹ کر اس کے قریب آ گئے۔
"میں تو چاہ رہا تھا کہ اعجاز یا فراز چھوڑ آتے مگر عاصمہ بیگم کو وہم ستا رہا ہے کہ کہیں خدانخواستہ پھر کوئی ایکسیڈنٹ ...... ہاں ہے نا اس لیے۔"
"اتنے برس یہ چاہت ان بچوں کی کہاں تھی؟" وہ تڑخ کر بولی۔
"یہ بحث کا موقع نہیں ہے۔" انھوں نے ایک بار پھر دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا "بچے بھی ساتھ جا رہے ہیں اس لیے تمہیں زیادہ متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔"
پھر وہ مزید کچھ سنے بنا تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔
الفت کو ہیجانی کیفیت نے آ لیا۔
اس پر جنون سا طاری ہو گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ باہر جا کر عاصمہ کو اتنا برا بھلا کہے کہ وہ دوبارہ اس گھر کا رخ کرنا بھول جائے۔
ابھی وہ اسی ہیجانی کیفیت سے دوچار دم بخود کھڑی تھی کہ باہر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

وہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور اُس نے دیوانہ وار پردے سمیٹ دیے۔
مصنوعی روشنیوں کے اُجیارے میں اُس نے دیکھا، اگلی نشست پر جلیس الحسن کے برابر تزئین اور
تزئین کے ساتھ عاصمہ بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔
عقبی نشست پر یقیناً بچیاں، اعجاز اور فراز ہی تھے۔
بے اختیار اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔
اُس نے کمرے کا دروازہ بند کیا، اور بے دم سی بستر پر گر گئی۔
"آہ! اِس بے رُخی سے وہ یہ کہہ کر چل دیے کہ محبت کا موقع نہیں۔" اُس نے چھت سے آویزاں
فانوس کو تکتے ہوئے سوچا۔
گرم گرم آنسو اُس کی کنپٹیوں کو بھگوتے اُس کے بالوں کی بھول بھلیوں میں اُترنے لگے۔
روتے روتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔
دروازے پر دستک سُن کر جب اُس کی آنکھ کھلی تو رات کے تقریباً ایک بجے کا عمل تھا۔
کوٹھی کی بالائی منزل سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
اُس نے جلیس الحسن سے کوئی پرسش نہیں کی۔ بلکہ بازو آنکھوں پر دھر کر لیٹ گئی۔
"اُلفت!" انھوں نے اُس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو..... وہ اعجاز، فراز کے ہمراہ جانے پر
آمادہ نہیں تھی اور بچے اس وقت اُسے اکیلے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے مجبوراً بچوں کی خوشی کی خاطر جانا پڑا۔"
اُس نے ذرا کی ذرا آنکھوں پر سے بازو ہٹایا اور بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں سب سمجھتی ہوں۔"
پھر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔
جلیس الحسن مزید کچھ کہے بغیر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔

اگلی صبح انھوں نے اُلفت کو بجھا بجھا سا پایا۔
انھوں نے اُس کے سامنے کوئی وضاحت یا صفائی پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ
وقت سے بڑا مرہم کوئی نہیں۔ بعض اوقات بالخصوص ازدواجی معاملات میں زیادہ وضاحت و صفائی بھی معاملات
کو سلجھانے کے بجائے اُلجھا دیتی ہے۔
وہ جانتے تھے کہ عاصمہ بیگم بچوں سے بہت قریب تھیں اور اُن کے جانے کے بعد اُلفت کے تمام شکوک رفع
ہو جانے تھے۔
دوپہر کو انھوں نے عاصمہ بیگم سے اُن کے دفتر کے نمبر پر فون کیا۔ اُن کی سیکریٹری نے کال منتقل کرنے کے بعد جب
جلیس الحسن نے کہا "جلیس" تو انھوں نے اپنا نام بتانے سے پہلے ہی وہی جانی پہچانی آواز بولی:
"میں سن رہا ہوں۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔
ادھر وہ ہنس دیں۔
وہی برسوں پہلے والی مسکراہٹ بھری ہنسی۔
"کیسے ہیں؟"
"خدا کے فضل سے ٹھیک ٹھاک۔"
"رات بیگم صاحبہ بہت خفا تو نہیں ہوئیں؟"
"کس بات پر؟"
"مجھے ہوٹل تک چھوڑنے اور زندگی کی فرمائش پر آئس کریم کھلانے کے چکر میں دیر ہو جانے پر؟"
"نہیں۔" جلیس الحسن نے صاف جھوٹ سے کام لیا۔
"حیرت ہے!"
"نہیں..... ایسی کوئی خاص حیرت کی بات نہیں۔ وہ ایک اچھی اور سمجھدار عورت ہے۔"

"ہوں!" عاصمہ بیگم کی ہوں، خاصی معنی خیز تھی۔ "اچھا یہ بتائیے، بچے آج آ رہے ہیں نا؟"
"ہاں ضرور۔"
"آپ خود اُن کو لے کر آ جائیے گا یا انھیں بچوں کا اسی اعجاز یا فراز کے حوالے کر دیجیے گا؟"
"میں تو دفتر سے نکلوں گا۔"
"اوہ! تو کیا بچوں میں سے کوئی ڈرائیو کرے گا؟"
"ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر اعجاز ابھی یونیورسٹی بھی تو جاتا ہے۔ فراز کی ڈرائیونگ بھی اچھی
پرفیکٹ ہے۔"
"نہ جانے کیوں میں اِن دونوں میں سے کسی کو ڈرائیونگ کرتے نہیں دیکھنا چاہتی.... آپ نہیں جانتے جب
مجھے عالیہ آپا کی زبانی اعجاز کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تو میرا کیا حال ہوا تھا۔ میرے بچوں کو بہت تکالیف اور دکھ ملے ہیں...
اب میں انھیں کسی تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔"
"دکھ وہ کس سے؟" وہ شائستہ لہجے میں بولے۔
"ہاں مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے ہی.... مگر.... اب.... اب میں انھیں کسی دکھ سے دوچار نہیں دیکھنا چاہتی۔"
"اعجاز کا ایکسیڈنٹ محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ اُس کے بارے میں اس قدر جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً
اعجاز کے سامنے ورنہ اُس کا اعتماد جو کہ کل بحال ہوا ہے دوبارہ متزلزل ہو سکتا ہے۔"
"میں جانتی ہوں.... جانتی ہوں کہ وہ محض اتفاقی حادثہ تھا۔ مگر میں کیا کروں اپنے احساسات کے آگے
بے بس ہوں۔ وہم میں مبتلا ہو گئی ہوں۔"
"اِس پر قابو پانے کی کوشش کرو۔"
"آئی کانٹ!" وہ دردانگی آواز میں بولیں۔
"دیکھو عاصمہ! کو تو میں بچوں کو ڈرائیور کے ساتھ بھی بھیج سکتا ہوں مگر اس صورت میں انھیں جلدی
تک گھر واپس آنا ہوگا کیونکہ ڈرائیور کو گھر جانا ہوتا ہے اُس کا گھر کافی دور ہے۔"
"ٹھیک ہے، مگر میں جانتی ہوں آج رات بچے کیا کہیں گے.... ابھی سے کیا کہیں!"
"دیکھو تو!"
"آپ.... کیوں نہیں لے آتے انھیں اپنے ساتھ؟"
"میری مشکل تم نہیں سمجھ سکتیں شاید۔"
"سمجھتی ہوں۔"
"پھر بھی؟"
"ہاں پھر بھی۔" انھوں نے کہا۔ "کچھ تعلق میرا بھی ہے آپ سے۔"
"کیسا تعلق!" وہ چونک کر بولے۔
"آپ میرے بچوں کے باپ ہیں۔" عاصمہ بیگم نے بڑے رسان سے کہا۔
"مجھے اس تعلق سے انکار نہیں۔"
"پھر ہچکچاہٹ کیوں؟"
انھوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد کہا: "کاش عاصمہ تم نے سوچا ہوتا کہ تمہاری ایک غلطی کتنے مسائل
پیدا کر سکتی ہے۔"
چند لمحوں کو خاموشی سی چھا گئی پھر عاصمہ بیگم بھیگی آواز سے عاجزانہ لہجے میں بولیں: "میں بہت شرمندہ
ہوں آپ سے بھی اور بچوں سے بھی۔"
"کوئی فرق نہیں پڑتا تمہارے شرمندہ ہونے یا نہ ہونے سے۔"
"پلیز!" وہ گڑگڑائیں۔
"ٹھیک ہے.... بچے چار پانچ بجے تک پہنچ جائیں گے تمہارے پاس۔"
"آپ کے ساتھ؟"
"نہیں ڈرائیور کے ساتھ۔"

"آفلائٹ تک تو وہ واپس نہ ہو پائیں گے۔"
"تو پھر ایسا کرنا ڈرائیور کو فارغ کر دینا واپسی پر اعجاز خود ڈرائیو کر لے گا۔"
"اوہ! بات تو وہیں کی وہیں رہی۔"
"اچھا تو پھر میں انھیں تمہارے پاس پہنچا آؤں گا اور رات کو پک کر لوں گا۔"
"تھینک یو..... تھینک یو ویری مچ۔"
"ویسے تمہارے وہم کی یہ قسم میری سمجھ میں آئی نہیں کہ اعجاز آخر ویسے بھی تو خود ہی آ جاتا ہے۔"

"شاید میں پاگل ہو گئی ہوں۔"
"شاید نہیں یقیناً۔"
"اچھا تو پھر بالکل پاگل ہوتی ہوں گی۔"
"اس میں کیا شک ہے۔"
وہ دھیرے سے ہنس دیں۔
وہی جلترنگ سی ہنسی۔
"تو پھر شام کو آپ بچوں کو لا رہے ہیں؟"
"ہاں مجبوراً۔"
"میں منتظر رہوں گی۔"

***

اُس روز جب جلیس الحسن دوپہر کے کھانے پر آئے تو انھوں نے کھانے کی میز پر بچوں سے کہا: "آپ لوگ چار بجے تک تیار ہو جایئے گا۔"
الفت کے کان کھڑے ہو گئے۔
خدایا!
یہ کیا ہوا۔ انتہا اُن کے گھر میں!
کہاں لے جا رہے تھے جلیس الحسن بچوں کو جو انھیں چار بجے تک تیار ہو جانے کی ہدایت کی جا رہی تھی!
وہ تو ہر معاملے میں پہلے اس سے مشورہ لینے کے عادی ہو چکے تھے۔
یک بیک یہ تبدیلی کیسا!
کیا اسے قصداً نظر انداز کیا جا رہا تھا؟
وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ بچوں کو چار بجے تک تیار ہو جانے کی ہدایت کیوں کر رہے تھے مگر پھر یہ خیال مانع رہا کہ جب وہ خود ہی نہیں بتا رہے تو پھر وہ کیوں پوچھے۔
کھانے کے بعد جلیس الحسن حسب معمول دفتر نہیں گئے بلکہ قیلولے کے لیے اپنے کمرے میں آ لیٹے۔
الفت اپنی نگرانی میں کھانے کی میز صاف کروانے کے بعد کمرے میں آئی تو انھوں نے از خود کہا۔
"آج عاصمہ نے بچوں کو بلایا ہے اپنے پاس۔ انھیں چھوڑنے بھی جانا ہے اور رات کو واپس لینے بھی۔"
"میں نے آپ سے کوئی وضاحت تو نہیں چاہی۔" وہ خفگی سے بولی۔
"مگر میں ضروری سمجھتا ہوں۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ تم میری بیوی ہو۔"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
"بہت فرق پڑتا ہے..... کم از کم میرے نزدیک۔"
وہ چپ چاپ ان سے دور مسہری کے دوسرے کنارے پر کروٹ لے کر لیٹ گئی۔
"بچوں کو وہاں چھوڑ کر میرے واپس آنے تک تم تیار رہنا، باہر چلیں گے اور واپسی پر بچوں کو عاصمہ کے پاس

سے لیتے ہوئے آ جائیں گے۔"
وہ کچھ نہیں بولی۔
جلیس الحسن سرک کر خود اُس کے نزدیک ہو گئے۔
"الفت!" انھوں نے دھیرے سے اُسے پکارا۔
وہ بدستور کروٹ لیے پڑی رہی۔
جلیس الحسن چونکہ اس کی خفگی کے سبب سے آشنا تھے اس لیے اُن کے نزدیک اس سے یہ پوچھنا کہ وہ خفا کیوں تھی، سراسر حماقت تھی۔
بچوں کو عاصمہ کے پاس وہ کیوں چھوڑنے جا رہے تھے اُن کی دانست میں یہ توضیح بھی بے سود تھی کیونکہ عاصمہ کی جذباتی کیفیت کو وہ اہمیت دینے پر آمادہ نہ ہوتی۔
"تیار رہو گی نا؟"
وہ بدستور خاموش پڑی رہی۔
"بہت کچھ کیا ہے تم نے بچوں کے لیے..... یہ ایک مرحلہ اور سہی!" وہ اُس کے وجود پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولے۔
الفت کی نگاہوں میں عاصمہ کی صورت پھر گئی اور اُس نے پوری شدت سے اپنے جبڑے بھینچ لیے۔
"کتنے دنوں سے تم امی اور بابا سے بھی تو ملنے نہیں گئیں۔"
"احمق ہوں نا اس لیے۔" اُس نے آنسو پیتے ہوئے سوچا: "میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ شاید یہ گھر یہ بچے میرے ہیں..... مگر..... نہیں..... یہاں تو میرا کچھ بھی نہیں۔"
"ہاں سنتی ہو..... ہمدانی نے آج پھر فون کیا تھا نگین کے لیے اپنے بیٹے کا باقاعدہ رشتہ لے کر آنے پر مُصر ہے۔ اُس سے برسوں کا یارانہ ہے میں انکار بھی نہیں کر سکتا ویسے لڑکا بھی اچھا ہے۔ مگر میں یہ چاہ رہا تھا کہ پہلے نگین اپنی تعلیم سے فارغ ہو لے پھر منگنی اور شادی کے چکر میں اُلجھا جائے۔ تم بتاؤ کیا ان لوگوں کو اس سلسلے میں ہاں کی منظوری دے دی جائے؟"
وہ کچھ نہیں بولی۔
"بھئی کچھ تو بولو۔"
"میں کیا بولوں۔ اب تو نگین کی ماں سے پوچھیے۔"
انھیں جھٹکا سا لگا۔
"تم نگین کی ماں نہیں ہو کیا؟"
"دعویٰ تو نہیں کر سکتی۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔
"دیکھو۔" انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی، "تمہاری حیثیت میں ان بچوں سے تمہارا تعلق عاصمہ سے زیادہ قوی اور مضبوط ہے۔ عاصمہ کا کیا ہے فقط نام کی ماں! آج یہاں ہے کل نہیں ہو گی۔ بچوں کے مستقبل کے بارے میں تو ہم تم ہی کو کرنا ہے۔"
"ہاں۔" الفت نے چپ چاپ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سوچا۔ "نا کو آتا مہربان تو نہیں ہونا چاہیے کہ دکھ سکھ میں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں..... یعنی اس گھر کی خاطر اپنا تن من میں نے تجا اور آ کر قابض ہو جائے وہ بدبخت۔"
"اور ادھر میری طرف تو دیکھو ذرا۔" انھوں نے بڑی محبت سے کہا۔
وہ بدستور کروٹ لیے پڑی رہی۔
"پلیز!" انھوں نے اتنی سماجت سے کہا کہ وہ پلٹ کر اُن کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔
وہ کچھ دیر یک ٹک بامحبت اُسے دیکھتے رہے۔ پھر بولے: "میں خود کو تمہارا احسان مند سمجھتا ہوں۔ تم نے میرے اس گھر کے اور بچوں کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کی بہت قدر ہے میرے دل میں۔"
اُس کی آنکھوں کے کناروں میں نمی سی اُتر آئی۔

سہ پہر کو جب جلیس الحسن ان چاروں کے ہمراہ عاصمہ بیگم کے ہوٹل پہنچے تو وہ لقینی شگفتہ گیل کا سنتے سے آراستہ ان کی منتظر تھیں۔

"تم آج بھی ویسی ہی دلکش اور دلربا ہو عاصمہ!" جلیس الحسن نے دزدیدہ نظروں سے عاصمہ بیگم کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے جی ہی جی میں کہا۔ پھر وہ اپنے خیال پر آپ ہی آپ شرمندہ سے ہو گئے۔

کیا حق تھا اب انھیں عاصمہ بیگم کو سراہنے کا؟ وہ تو ان کے لیے غیر قرار پا چکی تھیں۔

عاصمہ بیگم نے بچوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر یوں پیار کیا اور انھیں ایسی ممتا بھری نظروں سے دیکھا کہ اعجاز جیسا ہٹیلا اور خود سر لڑکا بھی پسیج گیا۔

عاصمہ بیگم جیسی دلکش، دوسرا محبت نظر آنے والی ماں تو کٹر سے کٹر اولاد کے دل کو موہ سکتی تھی۔

جلیس الحسن فوراً ہی واپس ہو جانا چاہتے تھے مگر عاصمہ بیگم نے انھیں اتنے اصرار سے چائے کے لیے روکا کہ وہ انکار نہ کر سکے۔

چائے کے بعد جب سبھوں نے جانے کا قصد کیا تو عاصمہ بیگم نے بچوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! ہم لوگ بھی نکل لیتے ہیں کچھ وقت تو ٹیکسی کے انتظار کو بھی دینا ہوگا۔"

"اسی لیے تو اگر اعجاز گاڑی لے آتے تو آسانی رہتی۔" جلیس الحسن بولے۔

"پاپا! میں تو کچھ رہا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے! یہاں کوئی اور ارینجمنٹ ہوگا ورنہ میں ہرگز نہ آتا۔ آتا تو اپنی گاڑی میں..... ٹیکسی میں ہم پانچ افراد بیٹھیں گے کیسے؟" اعجاز نے کہا۔

"جیسے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔" زرین نے لقمہ دیا۔

"ڈونٹ بی سلی۔" اعجاز نے اسے گھورا۔ "اپنی گاڑی کی بات دوسری ہوتی ہے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ تو وہ فراز آگے نہیں بیٹھ سکتے۔"

"کچھ نہ کچھ کر لیں گے بھائی۔" زرین اعجاز کی گھرکی سے ذرا متاثر نظر نہ آئی۔

"بات یہ ہے چھوٹی کہ تمہارا دماغ بھی چھوٹا ہے۔"

"میری بیٹی اکسا بیٹھی ہے۔" عاصمہ بیگم نے زرین کو پریم سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا جلدی سوچیں کہ کیا کرنا ہے۔" فراز نے کہا۔ "بائی دی وے ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"سی سائیڈ پر۔" عاصمہ بیگم نے بتایا۔

"پاپا! آپ ہمیں ڈراپ کیوں نہیں کر دیتے؟" فراز نے باپ کی جانب دیکھا۔

جلیس الحسن اپنی ٹھوڑی کھجانے لگے۔

"ہاں پاپا! آپ ڈراپ کر دیں ہمیں۔" زرین نے فراز کی تائید کی۔

"زری بیٹا!" عاصمہ بیگم نے کن انکھیوں سے جلیس الحسن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاپا کی کوئی اور مصروفیت بھی تو ہو سکتی ہے۔ ہم لوگ ٹیکسی میں چلتے ہیں۔"

"اچھا تو پھر میں تو پاپا کے ساتھ واپس جا رہا ہوں۔" اعجاز نے ناگواری سے کہا۔

"اوہ نو۔" عاصمہ بیگم نے بے ساختہ کہا۔

"گھر میں ایک نہیں تین تین گاڑیوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم ٹیکسی میں خوار ہوتے پھریں تو ہم سے بڑا احمق اور کون ہوگا۔" اعجاز نے کہا۔

"ٹھیک ہے... میں ڈراپ کیے دیتا ہوں تم لوگوں کو۔" جلیس الحسن بولے۔

"تھینک یو پاپا!" نگین نے کہا۔

اعجاز کے تردد کے پیش نظر عاصمہ بیگم نے تکلفاً بھی ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔

کچھ ہی دیر بعد جلیس الحسن کی گاڑی ساحل سمندر کی جانب رواں دواں تھی۔

اور "حسن لاج" میں الفت غیر معمولی اہتمام سے تیار ہو چکنے کے بعد جلیس الحسن کی منتظر تھی۔ وہ صد سے صد گھنٹا بھر میں واپس لوٹ آنے کو کہہ گئے تھے۔

ایک گھنٹا کیا اب تو دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ساڑھے چار بجے وہ گھر سے نکلے تھے اور گھڑی کی سوئیاں اس وقت سوا چھ سے آگے نکل چکی تھیں مگر جلیس الحسن کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

وہ آن کیسے اضطراب سے دوچار ہوتے جا رہی تھی!

جلیس الحسن کی گاڑی شہر کے پررونق راستوں سے گزرتی ساحل سمندر کی جانب رواں دواں تھی۔ زرین گاڑی کی اگلی نشست پر باپ اور ماں کے درمیان بیٹھی تھی۔ عقبی نشست پر دائیں بائیں اعجاز اور فراز تھے۔ نگین ان کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔

اعجاز کی فرمائش پر زرین نے کیسٹ پلیئر پر طربیہ دھنوں والی ایک کیسٹ آن کر دی تھی۔

یعنی اپنی جگہ وہ سب کے سب اپنی قلبی کیفیات میں ڈوبے بیٹھے تھے۔

اعجاز طربیہ دھنوں پر ونڈ اسکرین پر اپنے پاؤں تھرکاتے اور آہستہ آہستہ چٹکیاں بجاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "مم کے آجانے سے زندگی یک بیک کتنی خوبصورت ہو گئی ہے!"

فراز گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے شہر کی پررونق سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک کو ایک نئی سوچ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

"تصویروں میں ہلکے رنگوں کا استعمال اچھا لگتا ہے مگر گہرے رنگوں کا بھی اپنا منفرد حسن ہے!" اس نے اپنی گاڑی کے قریب سے گزرنے والی اسکارلیٹ سرخ رنگ کی گاڑی میں بیٹھی ہنستی ہوئی والی اس حسینہ کو دیکھتے ہوئے سوچا جو مذکورہ کار کی اگلی نشست پر بیٹھی نہ جانے کس بات پر مسکرا رہی تھی۔

نگین کی نگاہیں بار بار ماں کے آدھے چہرے کا طواف کرنے کو اگلی نشست کی جانب اٹھے جا رہی تھیں۔

"کاش! ہم ساری زندگی اسی طرح اکٹھے رہیں!" وہ سوچ رہی تھی۔

زرین ان کی خوشبو کو اپنے نفس میں اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے چپ چاپ سوچ رہی تھی۔ "اگر مم ہمیشہ اسی طرح میرے ساتھ بیٹھی رہیں تو کتنا اچھا ہو!"

جلیس الحسن کی نظریں بار بار اپنے سامنے آویزاں آئینے میں عاصمہ بیگم کی نگاہوں سے ٹکرائے جا رہی تھیں۔ "کاش! تم نے ایک دفعہ سوچا ہوتا عاصمہ کہ تمہاری ایک بھول ہم سب کو کیسی صلیب پر لٹکا گئی ہے!" وہ سوچ رہے تھے۔ عاصمہ بیگم کے باطن میں ایک بھونچال آیا ہوا تھا۔

امریکا سے پاکستان روانہ ہوتے ہوئے وہ تو اپنے ذہن میں چار ننھے بچوں کے وہی سراپا لے کر چلی تھیں جو وہ امریکا جاتے ہوئے اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھیں۔

وہ گزشتہ کئی برسوں سے ان کی پرانی تصویریں اپنے ذہن میں بسائے بیٹھی تھیں۔

ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ دونوں بیٹے ماشاء اللہ بھری بہار کی مکمل تفسیر بنے ملیں گے اور بیٹیاں ان کے اپنے قد کو پہنچی ہوں گی بلکہ نگین تو ان سے بھی نکلتی ہوئی نکل گئی تھی۔

کیسا چمن کھلا پڑا تھا۔

وہ اتنی تو چند دنوں کو تھیں مگر ایسی بھری بہار چھوڑ کر جانے کی ہمت نہ کر پا رہی تھیں!

انھوں نے گردن موڑ کر عقبی نشست پر بیٹھے اپنے دونوں شاہزادوں اور حسین و جمال کی منہ بولتی تصویر نگین کو دیکھا پھر بڑے پریم سے اپنا بازو زرین کے شانوں پر پھیلاتے ہوئے ایک دزدیدہ نظر جلیس الحسن پر ڈالتے ہوئے جی ہی جی میں کہا۔ "کتنے خوش قسمت ہو تم جلیس الحسن!"

"اچھا جناب! میں تو اب چلتا ہوں۔ چونکہ بچے آج کی شام آپ کے ہمراہ ہیں اس لیے بتا دیں مجھے کہ انھیں میں کہاں اور کس وقت لینے پہنچوں؟" جلیس الحسن نے انھیں ساحل سمندر کے ایک نسبتاً خاموش قطعے پر پہنچانے کے بعد اپنی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے عاصمہ بیگم سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ عاصمہ بیگم کوئی جواب دے پاتیں، زرین نے پوچھا۔ "پاپا! آپ جا رہے ہیں کیا؟"

"ہاں بیٹی!"

"دیکھیے اندھیرا پھیلنے تک تو ہم لوگ یہیں ٹھہریں گے پھر ہوٹل پہنچیں گے ڈنر لیں گے میرے خیال میں کم از کم دس تو بج ہی جائیں گے۔" عاصمہ بیگم بولیں۔

"ہم لوگوں کی واپسی کا کیا ہوگا؟" اعجاز نے تشویش سے پوچھا۔

"شاہزادے۔ میں آپ لوگوں کو لینے آؤں گا اسی لیے تو آپ سے ہم نے ان کے آج کے پروگرام کی تفصیل پوچھی ہے۔"

"میرا مطلب ہے یہاں سے ہوٹل تک واپسی کیسے ہوگی؟" اعجاز نے اپنے سوال کی توضیح کی۔

"ہم ٹیکسی لے لیں گے۔" عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن کو ان آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسئلہ تو ٹیکسی کا ہوگا جو ہوٹل سے چند وقت دستیاب تھا۔" اعجاز نے منہ بنایا۔

"پاپا آپ رک جائیں؟" زرین نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

"پاپا! آپ نے ہمیں گھر سے چلتے وقت بتا رہا ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ نہ رکیں گے تو میں اپنی گاڑی لے آتا۔" اعجاز نے ہلکی سی جھلاہٹ کا اظہار کیا۔

جلیس الحسن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں عاصمہ بیگم سے کہا: "دیکھا تم نے اسی لیے کہہ رہا تھا کہ اعجاز اپنی گاڑی لے آئے تو بہتر ہے گا مگر تم مانیں ہی نہیں۔"

وہ خفیف سی نظر آنے لگیں۔

"پاپا آپ نہیں ہوں گے ہمارے ساتھ تو کیا مزہ آئے گا؟" زرین بولی۔

"مجھے کچھ کام ہے بیٹے۔"

زرین آزردہ خاطر نظر آنے لگی۔

"اگر کوئی بہت ضروری کام نہ ہو تو بیٹی کی خوشی کی خاطر رک جائیے۔" عاصمہ بیگم نے کہا۔

جلیس الحسن سوچ میں پڑ گئے۔

الفت کو وہ تیار رہنے کی ہدایت کر کے گھر سے نکلے تھے اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں واپس آنے کو کہہ آئے تھے۔ وہ یقیناً منتظر ہوگی۔ یہاں پانچ نفوس اُن پر امید بھری نگاہیں مرکوز کیے کھڑے تھے۔

الفت کو تو وہ بہلا پھسلا کر سمجھا بھی لیتے، نرمی اور کچھ اپنی محبت کی گرمی سے منا سکتے تھے۔

مگر ان پانچ نفوس کو جن میں سے چار اُن کے ٹوٹ کر چاہت تھے اور پانچویں ایک ایسی عورت جس کو کبھی وہ ٹوٹ کر چاہا کرتے تھے جس کی بات کو ٹالنا اُن کے اختیار میں نہ تھا بھلا کیونکر مایوس کر سکتے تھے۔

خدا جانے یہ سمندر کی جانب سے آنے والی ٹھنڈی اور مست خرام ہواؤں کا اثر تھا یا زرین کی خواہش کا احترام یا ان پانچ نفوس کی خوشی کا خیال یا پھر اپنی ماضی کی دلکش ساعتوں کی کشش کہ وہ ان سب کے ساتھ ٹھہر گئے۔

جلیس الحسن نے اعجاز کے شانوں پر اپنا دایاں اور فراز کے شانوں پر بایاں بازو دراز کر دیا اور عاصمہ بیگم دونوں بیٹیوں کے ہاتھ تھامے ساحل پر چہل قدمی کو چل دیں۔

قصۂ ماضی کے اوراق الٹتے وہ تا دور نکل گئے۔

اوراقِ ماضی کا اعادہ جلیس الحسن پر یہ حیرت انگیز راز آشکار کرتا چلا جا رہا تھا کہ عاصمہ کی محبت تو ابھی تک اُن کے دل کے نہاں خانوں میں بسا جان تھی!

تو کیا اب تک وہ خود کو اس گمان سے دھوکا دیتے رہے تھے کہ اُن کے دل سے عاصمہ کی محبت ختم ہو چکی تھی۔

کیا انھوں نے الفت کو بھی دھوکے میں رکھا تھا!

انھیں عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد کی وہ اُداس اور بے رونق شامیں یاد آ رہی تھیں جو انھوں نے اسی سمندر کنارے گزاری تھیں۔ اس ساحل کی ریت میں اُن کے آنسوؤں کی نمی اور نمکینی دفن تھی۔

عاصمہ بیگم کا دلکش چہرہ اور اُن کا دلربا سراپا جو آج بھی بہت سوں کے ایمان کو ڈانواں ڈول کر سکتا تھا، اُن کی آنکھوں کی رسائی میں تھا۔

قانوناً اور شرعاً وہ ایک بار پھر انھیں اپنا سکتے تھے۔

وہ اس حیثیت میں تھے کہ انھیں ایک نہیں چار عورتوں کو اپنے نکاح میں لا کر اُن کے حقوق بخوبی ادا کر سکتے تھے۔ مگر الفت!

الفت کا خیال سراپا شکوہ، سراپا سوال بنا اُن کے تصور میں ہچکولے لینے لگا۔

وہ اپنے ذہن کو ایک کشمکش سے دوچار پانے لگے۔

پھر اُن کا ذہن جیسے پھر ایسی کہانی سے بننے لگا۔ اور اُن کے ماضی اور حال سے تعلق رکھنے والی دونوں

عورتیں باہمی تقابل کے لیے ایک دوسرے کے روبرو آ کھڑی ہوئیں۔

عاصمہ بیگم زرین کو اُس کے بچپن کا کوئی دلچسپ قصہ سنا رہی تھیں اور بقیہ زرین ہی نہیں باقی تینوں بہن بھائی بھی دلچسپی اور انہماک سے سن رہے تھے۔

اور جلیس الحسن کا ذہن بلا جواز عاصمہ اور الفت کے تقابل میں مصروف تھا!

عاصمہ بیگم میں دلکشی اور دلربائی تھی۔

اُلفت میں سادگی اور پرکاری!

عاصمہ بیگم اُن کی من چاہی عورت بن کر اُن کے گھر آئی تھیں۔

الفت اُن کی ضرورت اور مجبوری بن کر!

عاصمہ بیگم اُن کے چار بچوں کی ماں تھیں۔

الفت انھیں ایسی کسی زنجیر میں نہ جکڑ سکی تھی!

عاصمہ شعلۂ جوالہ تھیں۔

الفت سلگتی ہوئی چنگاری!

عاصمہ برق تھیں۔

الفت موم بتی کی ٹمٹماتی ہوئی لو!

عاصمہ بیگم سب کچھ تھیں۔

الفت اُن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں!

عاصمہ بیگم، عاصمہ تھیں۔

الفت، الفت!

عاصمہ اُن کا ماضی تھیں

اُلفت حال!

عاصمہ نے اپنی تکمیلِ تمنا کی خاطر اُن کے گھر کا شیرازہ بکھیر دینے میں کوئی رُو رعایت نہیں دکھائی تھی۔ کسی تعلق کا خیال نہیں رکھا تھا.... جنے بنائے گھروندے کو پیچھے سے اپنا پاؤں نکال کر آسے بے ستون کر دیا تھا۔ جبکہ اُلفت نے اس مسمار گھروندے کو ریزہ ریزہ اپنی پلکوں سے سمیٹا تھا.... اپنی ذات پر جبر سہہ کر اُن کے بکھرے ہوئے گھر کی شیرازہ بندی کی تھی!

دفعتاً نگین نے اُن کی گہری سوچ میں مخل ہوتے ہوئے کہا: "آپ کہاں کھوئے ہوئے ہیں پاپا؟"

"آں..... ہاں..... کہیں نہیں؟" وہ ہڑبڑا سے گئے۔

"بیٹا! تمہارے پاپا اپنی بیگم کی ناراضگی کی فکر میں ڈوبے ہوئے ہوں گے؟" عاصمہ بیگم نے کن انکھیوں سے انھیں دیکھتے ہوئے نگین سے کہا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں؟"

"آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

"ضرور پوچھو۔"

"آپ کی بیگم ماں کیسی ثابت ہوئیں؟ میرا مطلب ہے میرے بچوں کی سوتیلی ماں؟"

جلیس الحسن دھیرے سے مسکرائے اور بولے: "یہ تو اپنے بچوں ہی سے پوچھو"

"ان بیچاروں سے کیا پوچھوں، میری غلطی کی سزا انھوں نے ہی بھگتی ہوگی..... وکر جھیلے ہوں گے سوتیلی ماں کی نفرت بھری نگاہوں اور زہر آمیز صداؤں کی زد میں رہتے ہوں گے بیچارے!" اُن کی آواز لحظہ بہ لحظہ رندھتی چلی گئی۔

"ارے نو ممی!" نگین نے بے ساختہ: "وہ تو بہت اچھی ہیں۔"

عاصمہ بیگم نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا پھر مشکوک نگاہوں سے جلیس الحسن کو دیکھنے لگیں کہ کہیں انھوں نے نگین کو کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔

ابھی اُن کی نگاہیں جلیس الحسن کے چہرے پر ہی مرکوز تھیں کہ فراز کی آواز اُن کی سماعت سے ٹکرائی۔ خوش

ہوئی" واقعی وہ بہت اچھی ہیں!"

"میرے ایکسیڈنٹ کے بعد انھوں نے میرے لیے جو کچھ کیا اُسے تو میں ساری زندگی نہیں بھلا سکتا" یہ اعجاز تھا۔

"مم! بھائی کو بیڈ پین تک دیا کرتی تھیں ما" زرین بولی۔

زرین کی اس بات پر اعجاز قدرے محجوب سا نظر آنے لگا۔

"زینی!" عاصمہ بیگم نے تعجب کا اظہار کیا۔

"بھائی کا منہ دھلواتی تھیں، انھیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی تھیں" زرین نے مزید بتایا۔

"خیر یہ تو جو کچھ کیا سو کیا، سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے مجھے اس وقت ذہنی سہارا دیا جب میں مایوس ہو چکا تھا۔ جب مجھے ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا تھا تب انھوں نے میرے دل میں امید کی شمع روشن کی..... انھوں نے میرے لیے بہت کچھ کیا" اعجاز بولا۔

"اور آپ کو ایک بات اور بتاؤں مم کہ جس دن ان حضرت پر کچھ زیادہ ہی جھلاہٹ اور غصہ سوار ہو رہا ہوتا تھا تو بے چاری ماں ان کے دوستوں کو ان سے چوری چھپے فون کر کر کے انھیں گھر بلاتی تھیں اور انھیں ہدایت کر دیتی تھیں کہ جب گھر آئیں تو یہ نہ کہیں ان سے کہ انھیں ان حضرت کی ماما نے فون کر کے بلایا ہے بلکہ یہ ظاہر کریں کہ بس خود ہی ملنے چلے آئے ہیں" تمکین نے بتایا۔

اعجاز جو اتنا سا اور قدرے استعجاب سے تمکین کی بات سن رہا تھا، احساس تشکر سے معمور لہجے میں بولا۔

"ممی از گریٹ!"

"یہ بتاؤں آپ کو مم کہ بہت دنوں تک ہم نے انھیں اپنی حرکتوں سے عاجز رکھنے کی بہت کوشش کی" تمکین نے کہا "خاص طور پر اس وقت جب وہ ایک مرتبہ ناراض ہو کر اپنے گھر چلے جانے کے بعد دوبارہ گھر آئیں اور پاپا نے ہم سے وعدہ کیا کہ اب اگر ان کی طرف سے کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ ہمیشہ کے لیے ان کی چھٹی کر دیں گے" تمکین نے لحظہ بھر کو توقف کیا پھر ندامت سے بولی "اوہ! میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ تب کیا کچھ نہ کیا ہم نے انھیں ستانے کے لیے! فراز صاحب نے ان کے ایسے ایسے کارٹونز بنائے تھے کہ ماما کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو ہم سب کا اور فراز کا سر تو توڑ ہی دیتی مگر اُف! کیا قوت برداشت ہے ماما کی کہ خود ان ہی کارٹونز پر شکریہ لکھ دیا فراز کے نام! اور جاجی کی تو انھوں نے اتنی بدتمیزیاں برداشت کی ہیں کہ لکھنے پر آئیں تو رجسٹر کے رجسٹر بھر جائیں.... اوہ میرے خدا! کتنا ستایا ہے ہم نے انھیں..... مجھے تو شبہ ہے کہ اُن کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے ہیں..... وہ جو کہتے ہیں نا اسٹیل نروز کا ہونا تو کچھ وہ والی بات لگتی ہے..... اور اب جب ہم اپنی ان حرکتوں کو یاد کرتے ہیں جو ہم ماما کو ستانے کے لیے کیا کرتے تھے تو کم از کم مجھے تو بہت شرمندگی ہوتی ہے!"

عاصمہ بیگم جو تصویر حیرت بنی قدرے بے یقینی سے یہ سب کچھ سن رہی تھیں تمکین کے چپ ہو جانے پر بولیں۔

"میں حیران ہوں یہ سوچ کر کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے!"

"ہو سکتا نہیں بلکہ ہوا ہے!" اعجاز بولا۔

جلیس الحسن جانتے تھے کہ اپنی خطا کا اعتراف آدمی کسی انتہائی صورت میں ہی کیا کرتا ہے۔

اُلفت کے ساتھ اپنا رویہ اور ماضی میں کی گئی زیادتیوں کے سلسلے میں انتہائی وسیع القلبی سے تمکین کا یہ اعتراف غالباً بلکہ یقیناً اس غیر معمولی مسرت کا خوشگوار ردعمل تھا جو اسے یہاں سے برسوں جدائی کے بعد اس کی آمد کی صورت مل گئی تھی۔ زندگی کے ہر محاذ پر ساتھی ہونے کے ناتے اُلفت کی فتح جلیس الحسن کی اپنی فتح تھی۔

اپنی اس فتح پر وہ کھلے پڑتے تھے۔

اب اس سے بڑھ کر خراج تحسین کیا پیش کیا جا سکتا تھا اُلفت کو کہ اُس کی عدم موجودگی میں اس کے سوتیلے بچے اپنی ماں کے سامنے اُسی کی تعریف میں رطب اللسان تھے!

عاصمہ بیگم ہنوز تصویر استعجاب بنی ہوئی تھیں!

کاش! اُلفت اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور کانوں سے سنتی کہ اس کی ریاضت کیسی بارآور ثابت ہوئی تھی۔

وہ تو اس خراج تحسین سے بہت دُور "حسن لاج" کی زیریں منزل پر واقع اپنی اور جلیس الحسن کی مشترکہ خوابگاہ کا دروازہ بند کیے، تکیے میں منہ دبائے، بستر پر دل گرفتہ پڑی تھی۔

دیر ہوئی کہ قدرتی روشنی کی جگہ مصنوعی روشنیاں لے چکی تھیں۔

اندھیرا کب کا آسمان سے اُتر چکا تھا۔

مگر اس کے من میں اس اندھیرے سے زیادہ مہیب تاریکی چھائی ہوئی تھی!

جس خوف کو اس نے برسوں دبائے رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ آج جذبات کی صورت ضبط و برداشت کی ساری حدیں توڑ کر باہر نکلنے کو تھا۔

جلیس الحسن زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں واپسی کا کہہ کر ساڑھے چار بجے گھر سے نکلے تھے اور اسے تیار رہنے کی ہدایت کر گئے تھے۔

وہ پانچ بجے سے تیار اُن کی منتظر تھی۔

اب نو بجنے والے تھے مگر اُن کا دور دور تک پتا نہ تھا!

احساس توہین سے اس کا رواں رواں تپ رہا تھا۔

تصور کی کارگزاریاں عجیب عجیب تصویریں اس کی چشم تصور کے سامنے لا رہی تھیں۔

بیوی تو وہ بھی تھی اُن کی۔

اور وہ گھومتے پھرتے اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ وقت گزارتے پھر رہے تھے۔

عاصمہ بیگم کا تصور رقیب رو سیاہ اور دشمن جاں کا تصور بن گیا تھا۔

کتنی عرق ریزی سے اُس نے اس خزاں رسیدہ گلشن کی آبیاری کی تھی!

کس قدر چاہت سے اس اُجڑے چمن کو سنوارا تھا۔

کتنی جاں سوزی سے اس بکھرے ہوئے گھر کی شیرازہ بندی کی تھی۔

کس دلسوزی سے بچوں کو اپنا بنایا تھا۔

ایثار و وفا کی پتلی بن کر جلیس الحسن کا دل جیتا تھا۔ عاصمہ کی آمد نے اس کی ساری ریاضت اکارت کر دی تھی۔

اُس کی مطمئن اور مسرور دنیا میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ چند دنوں میں اس گھر کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔

جلیس الحسن جو اس کی رائے اور مشورے کے بغیر قدم نہ اُٹھانے اور اس کی مرضی کا احترام کرنے کے عادی ہو چکے تھے عاصمہ کے آنے کے بعد سے اُکھڑے اُکھڑے پھر رہے تھے اس کی رضا کا احترام تو کجا اُس سے رضا لینا بھی ضروری نہ سمجھ رہے تھے۔

بچے جو اس سے محبت جتاتے تھے، اس کا دم بھرتے تھے، پروانہ وار اس پر نثار ہوتے تھے، ہر قدم اٹھانے سے قبل جس کی آشیرباد لینا ضروری سمجھتے تھے، گزشتہ چند روز سے اُسے کسی اور ہی ہوا میں محسوس ہوتے تھے۔ انھوں نے اس سے بیٹھ کر حسب معمول ادھر اُدھر کے قصے بھی نہ کیے تھے اور اس درجہ خوشی اس نے انھیں اس سے پہلے بڑی سے بڑی خوشی کے موقع پر بھی نہیں دیکھا تھا۔

عاصمہ نے نہ جانے کیا جادو پڑھ کر پھونکا تھا کہ بچے تو بچے خود جلیس الحسن کا رویہ بھی اس کے ساتھ بدل گیا تھا۔ اُن کی تازہ ترین واردات یہ تھی کہ وہ ساڑھے چار بجے کے گئے نو بجنے تک بھی نہ پلٹے تھے۔

وہ ان کے انتظار میں سُوکھ گئی تھی۔

اس پر ستم یہ کہ اس نے پونے پانچ بجے سے لے کر اب تک سہاگ بابا اور ماں کو بھی فون کر دیا تھا کہ وہ اُن سے ملنے کے لیے آ رہی ہے۔

سات بجے بابا نے یہ جاننے کے لیے کہ وہ اب تک پہنچی کیوں نہیں، پہلا فون کیا تھا۔ پونے آٹھ بجے دوسرا اور ساڑھے آٹھ بجے تیسرا۔ پہلی دو کالز پر تو اس نے ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ بس تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گی لیکن بابا کی تیسری کال پر اسے کہنا پڑا تھا کہ جلیس الحسن کسی اچانک اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث وہ ان سے ملنے نہ آ سکے گی تاہم جلیس الحسن کی اس اچانک اور غیر معمولی مصروفیت کے بارے میں بابا کے استفسار پر اس نے انھیں عاصمہ کی آمد کے بارے میں بتانے سے گریز کرتے ہوئے اس مصلحت آمیز دروغ گوئی سے کام لیا تھا کہ وہ جلیس الحسن کی کوئی کاروباری مصروفیت تھی۔

بابا سے بات کرتے ہوئے اُن کی آواز میں آنسوؤں کی نمی حلول کر گئی تھی اور جب بابا نے تشویش کے ساتھ پوچھا "کیا بات ہے بیٹی! کچھ پریشان لگ رہی ہو تم آواز سے؟" تو انھوں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔
"نہیں بابا! ایسی تو کوئی بات نہیں...... اب تو ساری پریشانیاں ختم ہوگئی ہیں!"
وہ بابا کو اپنی پریشانی سے آگاہ کر کے انھیں فکرمند نہیں کرنا چاہتی تھی۔
جلیس الحسن بچوں کے ساتھ ایسے رُکے کہ پھر تو انھیں عاصمہ کی جانب سے بچوں کو دیے جانے والے پُرتکلف ڈنر میں بھی شریک ہونا پڑا۔
رُکنے کو تو وہاں سب کے ساتھ رُک گئے تھے مگر اُن کا دھیان بار بار الفت کی طرف جا رہا تھا۔
شادی کے کچھ عرصے بعد ایک طویل اور باقاعدہ ناراضگی سے قطع نظر اُس نے گزشتہ پانچ برس سے زائد عرصے کے دوران خود کو ایک صابرہ شاکرہ عورت ثابت کر دکھایا تھا۔
اس تمام عرصے کے دوران وہ شاذ ہی اُن سے کسی بات پر خفا ہوئی تھی۔
مگر عاصمہ کی آمد کے بعد سے اس کے چہرے کے خطوط نمایاں کھنچے ہوئے تھے۔
انھیں یقین تھا کہ آج وہ تادیر اُن کی منتظر رہنے کے بعد اب تک باقاعدہ خفا ہو چکی ہوگی اور اس کا خفا ہونا بجا بھی ہوگا۔ لیکن انھیں یقین تھا کہ وہ اپنی محبت کے فسوں سے اُسے رام کر لیں گے۔

ہوٹل میں پُرتکلف کھانے کے دوران عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن سے کہا "دو دن اور ہوں میں یہاں، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ دو دن بھی میں بچوں کے ساتھ گزار سکوں؟"
"صرف دو دن اور!" جلیس الحسن تعجب سے بولے "اتنا مختصر قیام!"
"بس صرف دو دن!" ثمین نے یک بیک کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا اور وہ انتہائی آزردہ خاطر نظر آنے لگی تھی۔ اُس کی آزردگی کا عکس اعجاز، فراز اور زرّین کے چہروں پر بھی ہلکورے لیتا دیکھا جا سکتا تھا۔
"مم!" زرّین نے دھیمی آواز میں کہا "کیا آپ دو دن بعد واپس چلی جائیں گی؟"
"ہاں بیٹا!"
"مم! کیا...... کیا...... آپ......؟" وہ دُزدیدہ نظروں سے باپ کی جانب دیکھنے لگی۔
"چپ کیوں ہو گئیں سویٹ ہارٹ...... بولو نا!" عاصمہ بیگم نے پوچھا۔
زرّین دُزدیدہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔
"ڈارلنگ! میں تمہاری بات سننے کے لیے بے چین ہوں!" عاصمہ بیگم نے بے تابانہ کہا۔
ثمین کو شاید کچھ کچھ اندازہ تھا کہ زرّین کیا کہنے جا رہی تھی۔ شاید اعجاز اور فراز کو بھی ہو۔
"مم!" زرّین کے لب کپکپائے۔
"بولو بیٹا!" عاصمہ بیگم نے بڑے پیار سے کہا۔
"مم" زرّین نے ہچکچاتے ہوئے زبان کھولی "کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتیں ہمیشہ کے لیے مم!"
جلیس الحسن بُری طرح چونکے۔ زرّین کی ہچکچاہٹ سے انھیں یہ تو اندازہ تھا کہ وہ کوئی غیرمعمولی بات کہنے جا رہی تھی مگر زرّین کا یہ سوال اُن کے گمان میں بھی نہ تھا۔
عاصمہ بیگم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور دل شکستہ لہجے میں بولیں "آئی ایم سوری سویٹ ہارٹ!" پھر انھوں نے توقف کرنے کے بعد کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں اگر چاہوں بھی تو نہیں رک سکتی!"
"کیوں؟" فراز نے پوچھا۔
"کیونکہ" عاصمہ بیگم سر جھکا کر بولیں "میں اس غلطی کو دوبارہ نہیں دہرا سکتی جو مجھ سے آپ چاروں کے سلسلے میں سرزد ہوئی تھی!"

ان چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ثمین نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا "کیا مطلب مم؟"
عاصمہ بیگم نے ایک لمبی سانس لی پھر اُن سے نظریں چُراتے ہوئے بولیں "ماشاء اللہ آپ چاروں تو اب بڑے ہو چکے ہیں۔ آپ سب کو شاید میری اتنی ضرورت نہیں جتنی اشعر کو ہے!"
"اشعر!" ثمین نے تعجب سے کہا۔

اور جلیس الحسن سمیت وہ سب وضاحت طلب نظروں سے عاصمہ بیگم کی جانب دیکھنے لگے۔
"اشعر تم چاروں کا چھوٹا بھائی ہے!" انھوں نے سر جھکا کر کچھ اس طرح کہا جیسے کوئی اعتراف جرم کرتا ہو۔
جلیس الحسن سمیت وہ سب اُن کے اس انکشاف سے دم بخود رہ گئے تھے۔
"اشعر ابھی چھوٹا ہے اور میں جانتی ہوں کہ اُسے ابھی کئی برس تک میری ضرورت ہے!" وہ دھیمے سُروں میں بولیں۔
اُن کے چاروں بچے خود کو ایک عجیب سے اضطراب سے دوچار پا رہے تھے۔
اُن دیکھے سوتیلے بھائی سے انھیں انجانا سا حسد محسوس ہو رہا تھا۔
یہ خیال کہ اُن کی ماں تقریباً اُنھی کی ملکیت نہیں تھی بلکہ کوئی اور بھی تھا جسے اُن کی ماں اُن سے زیادہ اپنی محبت اور توجہ کا حق دار سمجھتی تھی، اُن کے دل کو مٹھی میں جکڑے لے رہا تھا۔
گویا ماں اب بھی اُن کی کم اور کسی اور کی زیادہ تھی!
خوشگوار مسکراہٹوں اور ہنسی کی جگہ یک بیک ایک گہری سنجیدگی نے لے لی تھی۔
اور ان چاروں نے کھانے سے ہاتھ روک لیے تھے۔
جلیس الحسن کی جہاں دیدہ نظروں کے لیے اپنے نوجوان بچوں کی قلبی کیفیت سے آگاہی چنداں دشوار نہ تھی اور وہ انھیں زیادہ دیر اس ہیجان اور اضطراب سے دوچار نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ کھانے کے ذرا دیر بعد ہی انھوں نے عاصمہ بیگم سے اجازت چاہی۔
"میری درخواست پر غور کیا آپ نے؟" عاصمہ بیگم نے جلیس الحسن سے کہا۔
"کون سی درخواست؟"
"یہی کہ میں دو روز اور ہوں یہاں۔ اگر آپ بچوں کو یہ دو دن میرے ساتھ گزارنے کی اجازت دیں تو میں آپ کی شکرگزار ہوں گی!"
"مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر یہ چاہیں تو بخوشی تمہارے ساتھ رہیں۔ غریب خانے کے دروازے کھلے ہیں، تم ان کی ماں کی حیثیت سے وہاں قیام کر سکتی ہو اور اگر اس میں کچھ قباحت ہو تو میں دو روز کے لیے تمہارے ساتھ ہی ان کے بھی ہوٹل میں قیام کا بندوبست کر سکتا ہوں!"
"اوہ! آپ کتنے کنسیڈریٹ ہیں...... دوسروں کے جذبات کا کتنا خیال رکھا کرتے ہیں...... رہا ان کے میرے ساتھ ہوٹل میں قیام کے بندوبست کا سوال تو وہ میں بہ آسانی کر سکتی ہوں بس آپ کی اجازت درکار ہے!"
"میں نے کہا نا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ان چاروں سے پوچھ لو اگر یہ یہاں رکنے پر راضی ہیں تو میں انھیں ابھی سے یہاں چھوڑ کر جانے کو تیار ہوں!"
"کیوں بیٹے ٹھہرو گے نا میرے ساتھ؟" عاصمہ بیگم نے اپنی نگاہ چاروں کے چہروں پر دوڑاتے ہوئے کہا۔
"فائدہ؟" اعجاز گمبھیر لہجے میں بولا۔
"میں سمجھی نہیں بیٹا!" عاصمہ بیگم متذبذب نظر آ رہی تھیں۔
"دو روز بعد تو آپ واپس چلی جائیں گی، ہم اپنی عادت کیوں بگاڑیں، ہمیں تو کل بھی آپ کے بغیر رہنا پڑا تھا آئندہ بھی رہنا ہوگا!" اعجاز کے الفاظ خنجر کی صورت عاصمہ بیگم کے دل میں اُترتے چلے گئے۔
پھر اعجاز نے باپ کی جانب رُخ کرتے ہوئے کہا "ہمیں چلنا چاہیے پاپا! ماما ہماری منتظر ہوں گی!"
"اچھا کل تھوڑی دیر کو تو آ سکتے ہو نا میرے پاس؟" عاصمہ بیگم کی آنکھوں میں اُمنڈنے والے آنسوؤں کی لہر نے اُن کی آواز کو بھی بھگو دیا تھا۔
اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لہر نے ان چاروں کو بھی مضطرب کر دیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اعجاز نے عاصمہ بیگم کی جانب توجہ کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا کر کہا "ٹھیک ہے!"
ماں کی آنکھیں سی بہہ رہی تھیں۔ "ہم چاہیں بھی تو آپ سے محبت کرنا ترک نہیں کر سکتے!"

رات گیارہ کا عمل تھا اور الفت کا دل ایک ناقابل بیان وحشت میں ڈوبا جا رہا تھا۔
نہ صرف بچے بلکہ جلیس الحسن بھی ابھی تک نہ لوٹے تھے۔
وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

عورت سے التفات ظاہر کریں جو بے تحاشا ان کی سگی ماں بھی مگر میرے لیے سوہان روح بنی رہی ہے۔ مجھے بزدل مت کہیے گا کہ اپنی موت کو خود گلے سے لگا لینے والے بزدل نہیں ہوا کرتے۔ میں آپ کے اور بچوں کے لیے راستہ صاف کیے جا رہی ہوں اور اپنی موت کی ذمہ دار میں خود ہوں۔

امی اور بابا سے کہہ دیجیے گا کہ مجھے معاف کر دیں۔

میرے تمام زیورات ثمین، وندی بھابی اور اعجاز فراز کی دلہنوں میں یکساں طور پر تقسیم کر دیے جائیں کہ ان کو دینے کے لیے میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

الفت

جلیس الحسن خواب آور گولیوں کی خالی شیشی کا بھید پا چکے تھے۔

آخری سطر تک پہنچتے پہنچتے ان کی نگاہوں کے آگے غبارے سے ناچنے لگے تھے۔ انھوں نے متوحش نظروں سے الفت کی جانب دیکھا وہ گرد و پیش سے بے نیاز پڑی تھی۔

گھبرا کر وہ باہر لپکے اور نیچے ہی سے بآواز بلند بچوں کو پکارنا شروع کر دیا۔

کسی کو فون کرنے یا ایمبولینس منگوانے کا موقع نہ تھا۔ الفت کو جلد از جلد اسپتال لے جایا جانا ضروری تھا۔

اعجاز اور فراز کی مدد سے انھوں نے جوں توں الفت کو گاڑی کی عقبی نشست پر ڈالا اور ایک معروف اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

ثمین عقبی نشست پر الفت کا سر اپنے زانو پر دھرے سہمی سہمی سی بیٹھی تھی۔

فراز اور تزئین اگلی نشست پر بیٹھ گئے تھے۔

اعجاز کو جلیس الحسن نے اس ہدایت کے ساتھ گھر پر ہی چھوڑ دیا تھا کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں گھر کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہے۔

کیا خبر آئندہ کس قسم کی صورت حال سامنے آتی اور اسپتال میں کتنی دیر لگ جاتی۔ صبح اسپتال میں بھی ہو سکتی تھی۔ ان کی عدم موجودگی میں کسی کا فون بھی آ سکتا تھا۔ گھر کے نوکر چاکروں میں سے اس وقت تو فقط چوکیدار جاگ رہا تھا، جسے یہ بتایا گیا تھا کہ بیگم صاحبہ کی اچانک ناسازیِ طبع کے باعث انھیں اسپتال لے جایا جا رہا تھا۔

اسپتال ہی میں صبح ہو جانے کی صورت میں بقیہ ملازمین کی تشفی بھی ضروری تھی ورنہ اہلِ خانہ کو غائب اور گھر کو خالی پا کر وہ خود ساختہ فسانوں اور قیاس آرائیوں کا جال بن سکتے تھے۔

بچوں کے استفسار پر جلیس الحسن کو انھیں یہ تو بتانا ہی پڑا تھا کہ الفت نے بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں کھا لی ہیں — مگر کیوں؟

اس سلسلے میں انھوں نے کچھ خلجان میں ہونے کے سبب اور کچھ مصلحتاً انھیں کچھ نہ بتایا تھا۔ الفت کا خط انھوں نے اپنی تحویل میں محفوظ کر لیا تھا۔

"تم نے یہ کیا حماقت کی الفت؟" وہ اپنی گاڑی کو تیزی سے دوڑاتے ہوئے انتہائی دل گرفتگی سے سوچ رہے تھے۔ انھیں الفت کی نہ جانے کون کون سی اور کب کب کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

رات قیامت بن کر گزری۔

الفت کو ایک معروف نجی اسپتال لے جانے کا ایک فائدہ اگر یہ ہوا کہ فوری طور پر بہترین معالجین کی خدمات اور نہایت نگہداشت میسر ہو گئی تو دوسرا فائدہ یہ بھی ہوا کہ پولیس کیس بننے کی نوبت نہ آئی۔

معالجین کا کہنا تھا کہ الفت کو بہت ہی بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا تھا ورنہ اس کی جان بچانا مشکل ہو جاتا۔

جلیس الحسن نے رات کے پچھلے پہر الفت کے میکے میں فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جانتے تھے کہ سارا خاندان دوڑا چلا آئے گا خواہ مخواہ جگ ہنسائی ہو گی لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بلا ضرورت الفت کے اقدامِ خودکشی کی خبر مشتہر نہ کی جائے۔

ویسے یہ خدشہ تو ان کے دل میں تمام وقت موجود رہا تھا کہ اس کے میکے میں اطلاع نہ پہنچنے اور خدانخواستہ

کوئی اونچ نیچ ہو جانے کی صورت میں الفت کے اس اقدام کا الزام ان کے سر لگائے جانے کا احتمال ہو سکتا تھا۔

لیکن پھر بھی انھوں نے مصلحتاً الفت کے میکے اطلاع نہ دینے کا خطرہ مول لے لیا تھا۔

تاہم اعجاز کے اطمینان کی خاطر انھوں نے اسے اسپتال سے کئی بار فون کیا۔

اگلے روز انھوں نے معالجین کی اس یقین دہانی کے بعد کہ الفت کی حالت خطرے سے باہر اور اطمینان بخش ہے گھر کا چکر لگایا اور وہیں سے الفت کے میکے فون کرنے کا ارادہ کیا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ الفت کی ناسازیِ طبع کے باعث اس کے اسپتال میں زیرِ علاج ہونے کی اطلاع کر دیں اور بس۔ لیکن اس صورت میں الفت کے میکے والوں کے اسپتال دوڑے چلے آنے کا احتمال تھا۔ اصل بات کھلتی اور پھر بگڑتی۔ چنانچہ پھر انھوں نے فقط بابا کو اعتماد میں لے کر انھیں الفت کے اقدامِ خودکشی کی اطلاع دینے کا ارادہ کیا۔

بابا کو انھوں نے کچھ اس تدبیر سے الفت کے اس اقدام کی اطلاع دی کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں اور گھر کے دیگر افراد ان کی پریشانی دیکھ کر چونک نہ جائیں۔

انھوں نے بابا سے کہا "اب الفت کی حالت اطمینان بخش ہے۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں اور اس خبر کو فقط اپنی ذات تک محدود رکھتے ہوئے اپنی گلی کے نکڑ پر میرا انتظار کیجیے میں آپ کو لینے کے لیے پہنچتا ہوں۔"

اگرچہ جلیس الحسن نے بابا کو الفت کی حالت کے اطمینان بخش ہونے کا پورا اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی مگر پدرانہ محبت کے ہاتھوں مجبور بابا جلیس الحسن کی زبانی کلامی اطمینان دلانے سے پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے پھر بھی انھوں نے گھر والوں سے اپنی پریشانی اور تفکر چھپانے کی حتی الامکان کوشش کی۔

امی کو یہ خبر تو تھی کہ جلیس الحسن نے فون کیا تھا اور یہ کوئی بات نہ تھی۔ جلیس الحسن اکثر خیر و عافیت معلوم کرنے کے لیے فون کرتے ہی رہتے تھے۔ مگر پھر بھی انھوں نے بابا سے پوچھنا ضروری سمجھا کہ الفت کے ہاں سب خیریت تو ہے؟

"ہاں سب خیریت ہے۔ جلیس الحسن میاں کل شام نہ آ سکنے کی معذرت کر رہے تھے!" بابا نے مصلحت آمیز دروغ گوئی سے کام لیا۔

کچھ دیر بعد بابا نے شیروانی اور ٹوپی لے کر باہر جانے کا قصد کیا تو امی بولیں "خیریت کہاں چل دیے؟"

"تمہاری مجھ پر شک کرنے کی عادت اس عمر میں بھی نہیں گئی۔" بابا نے اپنی فطری خوش مزاجی سے کام لینے کی کوشش کی۔

جلیس الحسن ایسی تیز رفتاری سے بابا کو لینے پہنچے کہ بابا ششدر رہ گئے۔

بابا کے بارے میں جلیس الحسن کی رائے اتنی مستحکم تھی کہ انھوں نے بابا سے کچھ نہیں چھپایا۔ انھیں راستے میں سب کچھ بتا دیا۔ خاصہ بھی اس قصے کا ایک کردار تھیں اور بابا حیران تھے کہ الفت نے خاصہ کی آمد کی خبر کیوں چھپائی تھی۔

بابا کے ہمراہ جلیس الحسن دوبارہ اسپتال پہنچے تو تینوں بچے الفت کے کمرے میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ایک نرس اس کی تیمارداری کو سرہانے موجود تھی۔

گو الفت پر غنودگی طاری تھی تاہم اس کی حالت بقول اس کے معالجین کے اب مکمل طور پر خطرے سے باہر تھی۔ بابا کافی دیر اس کے پاس رہے پھر جلیس الحسن گھر چھوڑ آئے کہ فقط تسلی کے سوا کیا کرتے!

بابا کے خیال میں جلیس الحسن نے الفت کے اقدامِ خودکشی کی خبر کی تشہیر نہ کر کے بڑی دور اندیشی اور دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔

سہ پہر کو اعجاز بھی اسپتال آ پہنچا۔ ملازموں کو ہدایت کر آیا تھا کہ اگر کسی کا فون آئے تو یہی کہا جائے کہ سب گھر والے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

چونکہ چوکیدار گھر کے تمام ملازمین کو یہ بتا چکا تھا کہ رات بیگم صاحبہ کی اچانک طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے انھیں اسپتال لے جایا گیا تھا اس لیے وہ اعجاز کی اس ہدایت پر کہ کسی کا فون آئے تو یہی کہا جائے کہ سب گھر والے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، خاصے متعجب ہوئے۔

الفت کی پراسرار بیماری اور اس کی علالت کو دوسروں سے چھپانے کا بھید ان کی سمجھ میں کچھ آ رہا تھا؟ فقط کچھ نہیں!

شام تک الفت کی حالت کافی سنبھل چکی تھی۔
چونکہ ناصرہ بیگم نے گزشتہ شب بچوں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اگلی شام بھی اُن کے ساتھ گزاریں گے چنانچہ جلیس الحسن نے چاہا کہ وہ حسبِ وعدہ ماں کے ساتھ شام گزاریں تاکہ اُن سے کیا ہوا وعدہ بھی وفا ہو جائے اور جو بات وہ مشتہر نہیں کرنا چاہتے تھے وہ بھی راز رہے۔
مگر ان چاروں میں سے ایک بھی جانے پر آمادہ نہ ہوا۔
نگین، فرازنا اور زرتاج تین لوگ گزشتہ رات سے اب تک بنا کچھ کھائے پیے بیٹھے تھے۔ اعجاز کی حالت بھی اُن سے کچھ مختلف نہ تھی۔ صبح دس گیارہ بجے کافی کا ایک مگ اور دو بسکٹ زبردستی حلق سے اتارے تھے اور بس!
نہ چاہتے ہوئے بھی جلیس الحسن کو ناصرہ بیگم سے از خود رابطہ قائم کر کے انھیں اس شام بچوں کے نہ آ سکنے کے اصل سبب سے آگاہ کرنا پڑا کہ اُن سے غلط بیانی یا مصلحت آمیز دروغ گوئی انھیں کسی غلط فہمی یا شکوہ و شکایت کا شکار بھی کر سکتی تھی۔ وہ اسپتال دوڑی چلی آئیں۔ خجل اور شرمندہ سی۔
جیسے اس سانحے کی اصل ذمے دار وہی تو تھیں!
اپنے بچوں کو انھوں نے سوتیلی ماں کے لیے متفکر، ملول اور مضطرب دیکھا تو انھیں الفت پر رشک آنے لگا۔
جلیس الحسن کے بتانے پر کہ وہ گزشتہ شب سے یونہی پریشان ہیں اور صبح سے اب تک انھوں نے کچھ نہ کھایا پیا ہے، ناصرہ بیگم انھیں لاڈ پیار سے سمجھا بجھا کر اسپتال کے کیفے ٹیریا میں لے گئیں اور وہاں زبردستی انھیں کچھ کھلا دیا پلا دیا۔ شام ڈھلے بابا پھر اسپتال آئے۔ ناصرہ بیگم سے بھی ملے اور باتوں باتوں سے انھیں وہ خاصی معقول دکھائی دیں۔
الفت اگرچہ اب پورے طور پر ہوش میں تھی مگر اُس نے آنکھیں مُوند رکھی تھیں۔
ہوش میں آنے کے بعد الفت کو پہلا خیال تو یہ آیا تھا کہ وہ ہے کہاں؟
جلیس الحسن کے چہرے پر نظر پڑتے ہی خیال آیا کہ کیا وہ ناصرہ کے پاس سے واپس آ چکے ہیں؟
اور پھر اُس نے آنکھیں مُوندتے ہوئے سوچا کہ شرمندہ ہونے اور مزید کو بھگتنے کو پھر بچ گئی۔
بابا آئے تو وہ چوروں کی طرح ہوش میں تھی۔ مگر اپنے کمرے میں ناصرہ بیگم کی موجودگی کی تاب نہ لاتے ہوئے اُس نے آنکھیں تا دیر کھولی ہی نہیں۔
"کیسی ہے اب؟" اُس نے بابا کی آواز سنی تھی۔
"بہت بہتر ہیں اب تو۔ ہوش آ چکا ہے۔" جلیس الحسن انھیں بتا رہے تھے۔
بابا اُس کے پلنگ کے قریب آئے تو اپنے سر پر اُن کے مشفق ہاتھ کا لمس محسوس کر کے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ خفت کے مارے آنکھیں کھولنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی وہ۔
مرنے کی کوشش کے باوجود بچ جانا اُسے ایک شرمناک تجربہ لگ رہا تھا۔
"کاش! میں مر گئی ہوتی۔" اُس نے سوچا اور انتہائی کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو ڈھلک جانے سے نہ روک سکی۔ بابا سمجھ گئے کہ وہ جاگ رہی تھی۔ مگر وہ کچھ بولے نہیں۔
پیچھے ہٹے اور ناصرہ بیگم کے ساتھ جا بیٹھے اور دھیرے دھیرے اُن سے باتیں کرنے لگے۔
الفت پر ایسا احساسِ ندامت طاری تھا کہ وہ آنکھیں نہ کھول پا رہی تھی۔
ویسے آنکھیں نہ کھولنے کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے کمرے میں دشمنِ جاں اور رقیبِ روسیاہ ناصرہ بیگم کی موجودگی کو برداشت نہ کر پا رہی تھی۔
رات پڑے پر جلیس الحسن پہلے بابا کو گھر چھوڑ کر آئے مگر مصلحتاً بابا کو گلی کے نکڑ تک ہی!
پھر وہ فرازنا اور زرتاج کو بھی سمجھا بجھا کر گھر لے گئے۔
نگین نے کہہ دیا تھا کہ وہ رات ماما کے پاس ہی گزارے گی۔
جب جلیس الحسن فرازنا اور زرتاج کو گھر چھوڑ کر واپس آ چکے تو اعجاز ماں کو اُن کے ہوٹل تک پہنچانے کو اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے آگے ناصرہ بیگم بے بس ہو گئیں۔

رات کو جلیس الحسن بھی نگین کے ساتھ اسپتال ہی میں رہے۔
اگلی صبح جب اسپتال کی دو نرسیں الفت کے بستر کی چادریں تبدیل کر رہی تھیں اور جلیس الحسن نگین کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلے راہداری میں کھڑے تھے کہ اعجاز اور زرتاج ناشتا لیے آ پہنچے۔
"اب کیسی ہیں ماما؟" اعجاز نے آتے ہی پوچھا۔
"اب بہت بہتر ہیں۔" نگین نے بتایا۔
"بیٹا! کل تمہاری ممی واپس جا رہی ہیں۔" جلیس الحسن نے ان تینوں میں سے کسی کو بطورِ خاص مخاطب کیے بنا کہا۔
انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر نگین نے بوجھل آواز میں کہا "جی پاپا!"
"میں سمجھتا ہوں آج کا دن تم لوگوں کو انھی کے ساتھ گزارنا چاہیے۔"
"یہ کیسے ممکن ہے پاپا!" نگین بولی۔
"کیوں، ممکن نہ ہو سکنے کی کیا بات ہے؟"
"ماما اسپتال میں پڑی ہیں۔"
"وہ اب بہتر ہیں۔ تم اُن کی فکر نہ کرو۔"
"اُن کی فکر کیسے نہ کریں پاپا!" نگین بولی "آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ماما نے ہمارے لیے کیا نہیں کیا!"
"بہرحال بیٹا! آج کا دن تو تمہیں اپنی ماں کو دینا چاہیے کیونکہ کل تو وہ چلی جائیں گی۔"
"جانے والوں کی کیا پروا کرنا پاپا!" اعجاز نے کہا۔
جلیس الحسن نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا پھر نگین اور زرتاج کو دیکھا۔ ان تینوں کے چہروں پر دکھ کے سائے لرزاں تھے۔
جلیس الحسن آگے بڑھے اور انھوں نے اعجاز کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے سر جھکا کر ایک سرد آہ کھینچی اور بولے "میں تمہارے دکھ سے آشنا ہوں بیٹے....!" انھوں نے توقف کیا اور بولے "زندگی اسی دھوپ چھاؤں کا نام ہے!"
نگین کا جی بھر آیا اور اُس نے اپنی آنکھوں کے کناروں پر آنے والی سیلن کو پنہاں رکھنے کے لیے پلکیں جھکا لیں۔
"اعجاز بیٹے! اگر واپس جاؤ گے تو دونوں بہنوں کو بھی لے جانا۔" جلیس الحسن نے کہا "تم لوگ اگر چاہو تو خود ماں کے پاس چلے جانا یا چاہو تو انھیں گھر بلا لینا۔"
"نہیں پاپا! اُن کا گھر آنا تو کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ......" وہ رک کر پھر بولی "کیا آپ کے خیال میں ہم ماما کے سلیپنگ پلز لینے کا سبب نہیں جانتے؟"
جلیس الحسن اُس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔
"پاپا! ہم تو جانے کے لیے آئی ہیں۔ ہمیشہ تو ماما ہی کو ہمارے ساتھ رہنا ہے۔" نگین نے مزید کہا "تو پھر ہم ایسا کوئی کام کیوں کریں جس سے ماما کی دل آزاری ہو؟"
"آل رائٹ...... آل رائٹ بیٹا..... ایز یو وش..... مگر اپنی ممی کے پاس چلے ضرور جانا تم لوگ!"
الفت کے کمرے کی صفائی کی جا چکی تھی چنانچہ ان سب نے کمرے کا رخ کیا۔
الفت کی مزاج پرسی کر کے ہی اعجاز دونوں بہنوں کے ہمراہ واپس گیا ہی تھا کہ الفت کے معالج اُس کے معائنے کے لیے آ پہنچے۔
ابھی جلیس الحسن الفت کے سرہانے بے وجہ دھرنے سے کچھ دیر کو نجات حاصل کرنے کی بابت سوچ ہی رہے تھے کہ ناصرہ بیگم الفت کی عیادت کو آ پہنچیں اور الفت نے انھیں دیکھتے ہی منہ دوسری طرف کر کے آنکھیں موند لیں۔
"کیسی ہیں اب الفت؟" انھوں نے ناصرہ کو جلیس الحسن سے پوچھتے سنا۔
"اب ٹھیک ہیں۔"
گو ناصرہ بیگم کمرے میں داخل ہوتے ہی الفت کو جاگتے اور اُن پر اُس کی نظر پڑتے ہی اُسے رخ پھیر کر آنکھیں موندتے دیکھ چکی تھیں اور انھیں رنج بھی ہوا تھا مگر پھر بھی وہ ہمت کر کے اُس کے پلنگ کی طرف بڑھیں

اور اُس کے نزدیک پہنچنے کے بعد انھوں نے جلیس الحسن اور الفت کی تیمارداری پر مامور نرس سے اشاروں ہی اشاروں میں تخلیہ چاہنے کی درخواست کی۔

فرش پر قدموں کی آہٹ، دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آوازیں سن کر الفت نے غالباً یہ سمجھتے ہوئے کہ عاصمہ چلی گئی ہیں، آنکھیں کھول دیں لیکن انھیں اپنے نزدیک کھڑے دیکھ کر اور جلیس الحسن اور نرس کو کمرے سے غائب دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ اور ایک بار پھر آنکھیں موند لیں۔

عاصمہ بیگم نے دھیمے سُروں میں کہا "میں مانتی ہوں کہ میں بہت بُری ہوں مگر اتنی بھی نہیں کہ تم میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرو...... جلیس صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے...... تمہیں غلط فہمی ہوئی میری وجہ سے جو تکلیف اُٹھانا پڑی اس کی معافی چاہتی ہوں۔ میں تو صرف اپنے بچوں سے ملنے کے لیے آئی تھی اور بس...... تمہارے شوہر سے ماضی میں میری وابستگی رہی تھی مگر اب سوائے اس کے میرا ان سے کوئی تعلق نہیں کہ وہ میرے بچوں کے باپ ہیں...... ؟" انھوں نے توقف کیا پھر بولیں "جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو کل تک میرے تھے آج ہم دونوں کے ہیں اور کل بھی ہمارے رہیں گے۔ یہ بچے میرے اور تمہارے درمیان رابطے کی ایک کڑی بنے رہیں گے۔ انھی کی محبت مجھے یہاں کھینچ لائی تھی ورنہ میرا اب یہاں کیا رکھا ہے...... میں ان کی محبت کی ڈور میں بندھی پھر کھنچی چلی آؤں گی۔ میری جڑیں دو مختلف سرزمینوں میں اتر گئی ہیں۔ نہ میں ان کو بھلا سکوں گی نہ اُس بچے کو چھوڑ سکتی ہوں جو ہزاروں میل دور میری واپسی کا منتظر بیٹھا ہے......"

الفت نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"ہاں......؟" عاصمہ بیگم اس کا استعجاب تاڑتے ہوئے بولیں "ایک بیٹا اور بھی ہے میرا جسے امریکا میں اُس کے باپ کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں کیونکہ عدالتی پابندی کے مطابق میں اسے اُس کے باپ کی اجازت کے بغیر امریکا سے باہر نہیں لے جا سکتی...... تم بہت خوش قسمت ہو الفت کہ تمہیں ایک اچھا شوہر اور محبت کرنے والے بچے ملے ہیں...... کل ان کی زبانی تمہاری انتہائی تعریف سن کر مجھے بہت حسد محسوس ہوا تم سے لیکن پھر میں نے دیانت داری سے سوچا کہ تم اس تعریف اور اس محبت کی اہل ہو کیونکہ تم نے ان کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں انھیں تم سے محبت کرتے دیکھ کر تم سے حسد محسوس کروں کیونکہ میں نے انھیں دیا ہی کیا ہے سوائے دکھ کے!" عاصمہ بیگم نے چند ثانیے خاموشی اختیار کرنے کے بعد ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "تم نے میرے بچوں کے لیے جو کچھ کیا ہے اُس کا احسان میں تمام عمر ادا نہ کر پاؤں گی...... انھیں اسی طرح عزیز رکھنا الفت اور کل صبح میرے واپس جانے کے بعد اگر یہ دل گرفتہ دکھائی دیں تو ان کے زخموں پر پھاہے رکھتے ہوئے انھیں اپنی محبت کی آغوش میں سمیٹ لینا...... میں تمہاری ممنونِ احسان رہوں گی۔"

پھر عاصمہ بیگم نے جھک کر مغربی آداب کے بموجب الفت کے رخسار کو دھیرے سے چوما اور پھر اُس کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ الفت دم بخود پڑی تھی۔

عاصمہ بیگم الفت کے کمرے سے نکلیں تو جلیس الحسن راہداری میں کھڑے سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔

عاصمہ کو دیکھتے ہی وہ اُن کی جانب بڑھ آئے۔

"کیا ہوا؟" انھوں نے بےتابانہ پوچھا۔

"کچھ نہیں آپ کی بیگم سے کچھ بات کرنی تھی سو کر لی۔" عاصمہ بیگم نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

جلیس الحسن کو عاصمہ بیگم کا چہرہ ایک ملول، دل گرفتہ اور شکست خوردہ عورت کا چہرہ لگا۔

کیسی عجیب بات تھی کہ ماضی میں اس عورت کو عزیز از جان رکھنے کے باوجود وہ اُسے تسلی کے دو بول دینے سے قاصر تھے۔ زندگی کبھی کبھی بڑے عجیب راستوں پر لا کھڑا کرتی ہے!

"میں نے بچوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ آج کا دن تمہارے ساتھ گزارنے آ رہے ہیں۔"

"سو نائس آف یو!" وہ تشکر سے مسکرا دیں۔

عاصمہ بیگم کے جانے کے بعد جلیس الحسن الفت کے کمرے میں گئے تو وہ دروازے کے رُخ نگاہیں لگائے لیٹی تھی۔

وہ تخلیے کا فائدہ اٹھاتے والہانہ انداز میں اُس کی طرف بڑھے۔

"یہ کیا حماقت کی تھی تم نے؟" وہ شاکی لہجے میں بولے۔

الفت کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

"کیسا بہتان لگا ڈالا تم نے ہم سب پر" وہ اُس کی ناک کی پھننگ چھوتے ہوئے بولے "جاناں! یہ سوچا کر اتنی رعایت دے دی ہوتی مجھے کہ اس کے چار بچوں کا باپ ہوں میں اور...... ماضی میں اُس سے ایک مخصوص قسم کی جذباتی وابستگی رہی ہے میری۔" الفت نے آنکھیں موند لیں۔ اور اس کے چہرے سے کرب ٹپکنے لگا۔

پھر اُس کے لب کپکپائے "اب...... اب...... کبھی...... اس...... وابستگی...... کا...... ذکر...... نہ کیجیے...... گا...... میرے...... سامنے۔"

"ایسی بہادر ہو کر اتنی کم ہمت اور بزدل؟" اُن کے لہجے سے استعجاب ٹپک رہا تھا۔

الفت نے آنکھیں کھول لیں۔ ڈبڈبائی نگاہوں سے انھیں دیکھا پھر بولی "دنیا کی کوئی عورت اپنے مرد اور دوسری عورت کے معاملے میں بہادری کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔"

تب ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔

"کم اِن" جلیس الحسن نے کہا اور بابا کمرے میں در آئے۔

بابا خاصی دیر اُس کے پاس رہے۔

"الفت بیٹے!" بابا نے رسانیت سے کہا "منزل سے دو گام پہلے ہمت ہار بیٹھیں...... ارے بیٹا یہی تو اصل امتحان تھا تمہاری آزمائش کا...... پھر تو یہ منزل تمہاری تھی۔"

اُس نے شرمندہ ہو کر بابا سے نظریں چرا لیں۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔

وہ چار دن عاصمہ بیگم کے پاس آتے ضرور رہے اور شام تک اُن کے پاس بھی رہے مگر اُن کی نگاہوں میں دبی دبی سی شکایتیں اور حکایتیں تھیں۔

شاید وہ اپنے ساتھ اُن کی جانب سے ہونے والی زیادتی کا شکوہ کرنا چاہتے تھے۔

شاید وہ ان زیادتیوں کا قصاص چاہتے تھے۔ یا شاید وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

عاصمہ بیگم کو یوں لگ رہا تھا جیسے وقت کے سرد اور بےرحم ہاتھوں نے اُن کے اور اُن کے جگر گوشوں کے مابین ایک دیوار حائل کر دی ہو۔

اس دیوار سے اپنا کان لگا کر وہ دیوار کے دوسری طرف سے اُن کی گھٹی گھٹی سسکیاں، اُن کے ہاتھوں کی بےتاب سرسراہٹیں تو سن سکتی تھیں مگر اُسے گرانے سے قاصر تھیں۔

اعجاز گاڑی ڈرائیو کر کے لایا تھا اور جب سب نے شام ان چاروں نے الفت کو دیکھنے کے لیے اسپتال جانے کی خاطر واپسی کا قصد کیا تو انھوں نے اعجاز کو ہدایت کی "بیٹا! گاڑی احتیاط سے چلانا۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔" اعجاز نے کہا "اور یہ بتائیں کہ کل یہاں سے آپ کے ائیرپورٹ جانے کا کیا انتظام ہے؟"

"ہوٹل کی گاڑی مجھے ائیرپورٹ پہنچا دے گی۔"

"میں آجاؤں گا آپ کو ائیرپورٹ لے جانے کے لیے۔"

"اوہ! نو! بیٹا!"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم تو مجھے ائیرپورٹ پہنچا دو گے لیکن جہاز میں بیٹھنے کے بعد میرا دھیان تمہاری طرف لگا رہے گا۔"

"کوئی بات نہیں اپنی منزل پر پہنچنے اور اپنے لوگوں سے ملنے کے بعد آپ یہاں والوں کو بھول جائیں گی۔"

"تم سے زیادہ میرا اپنا اور کون ہوگا!" وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولیں۔

اعجاز منہ سے کچھ نہیں بولا۔ مگر اُس کی نگاہوں نے کہا "کیا اپنوں کے ساتھ یہی کیا جاتا ہے؟"

عاصمہ بیگم انھیں کار پارکنگ تک رخصت کرنے آئیں اور انھوں نے ایک ایک کو بار بار پیار کرتے ہوئے اپنی ناکامی کو سرشاری میں بدلنے کی کوشش کی۔

مگر جب وہ گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے تو انھیں یوں لگا جیسے وہ اور زیادہ پیاسی ہو گئی ہوں!

اپنے ہاتھوں میں پھول لیے
وہ چاروں اسپتال پہنچے تو کمرہ خالی پڑا تھا۔
متوحش ہو کر وہ سب اسپتال کے شعبۂ استفسارات تک پہنچے۔
کمرہ نمبر ۲ کی مریضہ کی بابت استفسار کرنے پر پتا چلا کہ اُن کی اسپتال سے چھٹی ہو گئی ہے۔
وہ گھر پہنچے تو الفت اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز پڑی تھی۔
اُن میں سے ایک نے پوچھا ”کیسی ہیں ما؟“ اور پھول اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔
”ٹھیک ہوں بیٹا!“
”ہم سب تو ہاسپٹل میں آپ کا کمرہ خالی دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔“ زرّین نے بتایا۔
”مجھے بھی خدشہ تھا۔“ جلیل حسن بولے۔
”مگر پاپا یہ اچانک ہی ما کو کیوں ڈسچارج کر دیا گیا ہاسپٹل سے؟“
”یہ خود ہی رخصت لینے پر مُصر ہو گئی تھیں۔“
”کیوں ما؟“
”کیونکہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ الفت اُن سے نظریں ملانے کی ہمت نہ پا رہی تھی۔
”وہ تو آپ ہیں مگر آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ نگین نے کہا۔
”تم میری فکر نہ کرو.... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اُس نے نگین کا گال تھپتھپایا، پھر دھیمے سُروں میں بولی۔
”صبح جاؤ گی نا؟“
”کہاں؟ یونیورسٹی؟“
”یونیورسٹی نہیں، ایئرپورٹ.... اپنی مَم کو سی آف کرنے۔“
نگین نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔
”صبح ہم سب انھیں سی آف کرنے چل رہے ہیں۔“
”رئیلی!“ فراز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
”ہاں بیٹے.... اسی لیے تو میں ہاسپٹل سے گھر آ گئی ہوں۔“
اور یہ سچ بھی تھا۔
بابا کے دو جملوں نے پھر اس کی کایا پلٹ دی تھی۔
اپنی ایک ذرا سی جذباتی بھول سے اُس نے کئی برس کی ریاضت کو داؤ پر لگا دینے کی جو حماقت کی تھی، اُس کے ازالے کی کوئی صورت نکالنی ہی تھی۔
گو یہ منزل اُسے پچھلی ہر منزل سے زیادہ کڑی لگ رہی تھی۔
مگر
پچھلی منزلوں پر اپنا پرچم بدستور سربلند رکھنے کے لیے اس منزل سے بھی سرخرو گزرنا ضروری قرار پا گیا تھا۔
نگین، اعجاز، فراز اور زرّین چاروں اُسے بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔
جلیل حسن کی نگاہوں میں استعجاب ڈول رہا تھا۔
عجیب ہی تو یہ عورت بھی جس کا نام الفت تھا!
ہر بار ایک نئے روپ میں سامنے آ کر انھیں ششدر کر دیا کرتی تھی۔
اپنے جذباتی سہو کے ازالے کی جو صورت اس نے اختیار کرنے کی کوشش کی تھی اسی کا ردِعمل تھا کہ اعجاز اپنی جگہ سے اٹھ کر اُن کے نزدیک آ بیٹھا اور اُن کے شانوں پر اپنا بازو بصد محبت دراز کرتے ہوئے بولا ”کیا آپ جانتی ہیں کہ یہ گھر آپ کے بغیر کتنا اُداس تھا؟“
”اور ہم سب بھی۔“ نگین نے کہا۔
”گھر کا تصور آپ کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا ما۔“ فراز بولا۔
”ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔“ اعجاز نے کہا۔
”پاپا کو بھی۔“ زرّین نے مسکراتے ہوئے باپ کو دیکھا۔

”اور مجھے تم سب کی۔“ الفت نے شدتِ جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

اگلی صبح جب عاصمہ بیگم ایئرپورٹ پر روشن مصنوعی قمقموں کے اجیارے میں ہوٹل کی گاڑی سے اترنے کے بعد اپنا مختصر سا اسباب ٹرالی پر دھرے بین الاقوامی روانگی والے حصے کی جانب پیش قدمی کر رہی تھیں تو زرّین کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے۔
”مَم!“ اُس نے بلند آواز میں پکارا تھا۔
انھوں نے پلٹ کر دیکھا اور اُن کی نگاہوں میں اُداسی کی جگہ حیرانی اور مسرت کی ملی جلی کیفیت ہلکورے لینے لگی۔ غیر متوقع طور پر وہ سب انھیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔
جلیل حسن بھی!
انھوں نے دونوں بیٹوں کے ماتھے چومے، بیٹیوں کو پیار کیا پھر انھیں ایسی محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں جیسے انھیں اپنی آنکھوں میں بسا لینا چاہتی ہوں!
”تھینک یو.... تھینک یو ویری مچ۔“ انھوں نے تشکر آمیز لہجے میں جلیل حسن سے کہا ”کہ آپ نے یہ خوشگوار ساعتیں بھی بخشیں، میرے ہمراہ کر دینے کی زحمت کی۔“
”میں نہیں۔“ جلیل حسن انگلی سے ایک مخصوص سمت اشارہ کرتے ہوئے بولے ”شکریہ ادا کرنا ہی ہے تو الفت کا کرو۔“
عاصمہ بیگم نے چونک کر انگلی کی سمت دیکھا۔
الفت مخصوص وضع کی ایک کرسی پر بیٹھی انتہائی انہماک سے دوسری سمت ایک نوجوان ماں کو بے تحاشا روتے ایک بچے کو سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔
”بچے پالنا واقعی ایک کارِ گراں ہے!“
عاصمہ بیگم اپنا سامان وہیں چھوڑ کر الفت کی سمت بڑھ گئیں۔
جونہی الفت کی نظر اُن پر پڑی، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
دو عورتیں جو ایک ہی مرد کا ماضی اور حال تھیں، ایک دوسرے کے روبرو کھڑی تھیں!
الفت نے جس کے لیے عاصمہ بیگم کا تصور سوہانِ روح بنا رہا تھا، اپنے من میں چھپے خوف کا سر قلم کر کے اُس کے لاشے پر کھڑے ہو کر عاصمہ بیگم کا سامنا کرنے کی کوشش کی۔
عاصمہ بیگم نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔
”تھینک یو۔“ پھر اُن کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ الفت کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے جھٹکے سے واپس پلٹ گئیں۔
جاتے جاتے عاصمہ بیگم نے بچوں کو پیار کیا۔
پھر انھیں نظروں میں بسانے کی کوشش کی۔
اور روانگی ہال کی طرف چل دیں۔
داخلی دروازے سے ہال میں داخل ہونے سے قبل انھوں نے آخری بار پلٹ کر دیکھا اور اپنا ہاتھ لہرایا۔
اُن کے چاروں بچے اور جلیل حسن بھی الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔
الفت پہلے تو ہچکچائی لیکن پھر اُس نے بھی اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر لہرانا شروع کر دیا۔
ادھر عاصمہ بیگم کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔
اور اُدھر اُن کے بچوں کی!
عاصمہ بیگم کے روانگی ہال میں داخل ہونے کے بعد جب نگین اور زرّین اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگیں تو الفت نے اُن سے کہا ”جان! وہ پھر آئیں گی..... تمھاری محبت انھیں پھر کھینچ لائے گی۔“
نگین کے لبوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔
زرّین بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
جلیل حسن نے اپنا بایاں بازو زرّین کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا ”بیٹا! ہم سب تو ہیں آپ کے ساتھ۔“

اعجاز الفت کی جانب بڑھا اور اُس نے اپنا توانا بازو ان کے شانوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "آیئے ممّا گھر چلیں۔"

جب اعجاز اور رفزا اُسے اپنے جلو میں لے کر کار پارکنگ کی طرف چلے تو صبح کا اُجالا آسمان سے زمین پر اُتر رہا تھا۔

عاصمہ بیگم کے جگر گوشوں کے دل کی چبھن وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔

ان چاروں سے اُسے آج ایک عجیب سا رشتہ استوار ہوتا لگ رہا تھا۔

منسوں کا رشتہ!

جو اجنبی کو آشنا اور غیر کو اپنا بنا دیتا ہے۔

وہ چاروں اُسے اپنے ہی وجود کا حصہ لگ رہے تھے۔

اس کے تصور میں رعنا جمیل در آئیں۔

وہ اس وقت ہوتیں تو دیکھتیں کہ دوسری عورت کے بچے کس طرح اس کے بن گئے تھے۔

ضروری نہیں کہ ہر شخص کی ہر بات درست یا ہر بات غلط ہو۔

رعنا جمیل نے اس کی ہمدردی اور خیر خواہی میں جو بہت سی باتیں کہی تھیں اُن میں سے یہ بات بہر حال غلط ثابت ہوئی تھی کہ دوسرے کے بچے اپنے نہیں بن سکتے۔

عظیم الشان سلطنت روما کے عظیم حکمران مارکس آریلئیس کے حوالے سے بابا نے سچ ہی کہا تھا کہ سچی خوشی انھیں ملتی ہے جو خود پر حکومت کرنا جانتے ہیں۔

اس رات جب وہ چاروں اُسے اپنے جلو میں ڈائننگ لاؤنج میں لائے تو اُس نے دیکھا کھانے کی میز موم بتی شمعوں سے جگمگا رہی تھی۔

میز پر وسط میں ایک بڑا سا کیک تھا جس پر لکھا تھا۔

"ویلکم ہوم ممّا!"

اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔

یہی میز ہوا کرتی تھی جس کے گرد اُسے موجود پا کر وہ چاروں واک آؤٹ کر جایا کرتے تھے۔

اور آج!

اسی میز پر وہ اُسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اپنی اس فتح کے لیے وہ بابا کی ممنونِ احسان تھی۔

اس رات جب جلیس الحسن اُس کی سرخروئی پر اُسے مبارکباد دینے کو جھکے تو اُس نے دیکھا ایک عرصے بعد بھی لاکٹ اُن کے گلے میں جھول رہا تھا۔

پہلی بار وہ اُس عورت کے تصور سے سہمی نہیں جس کے اس لاکٹ کی زینت بنے ہونے کا اب بھی احتمال ہو سکتا تھا۔

اُس نے بائیں ہاتھ سے لاکٹ کا کھٹکا دبا دیا۔

اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ لاکٹ میں تو اُس کی اپنی تصویر آراستہ تھی!

یکا یک اُسے یوں لگا جیسے اُس کے اردگرد سیکڑوں ہزاروں چراغ جل اٹھے ہوں۔

وہ روشنیوں میں نہا گئی۔

اور جیت کا نشہ اُسے مغرور کرنے لگا۔

تھی نا حیرت کی بات

کہ

اُس نے بہتے پانی پہ مکاں بنایا تھا!

اور مقدر کی بات۔

کہ وہ

وہ ہارتے ہارتے جیت گئی تھی!!

(ختم شد)